گھنگرو اور کشکول
محمد فیاض ماہی

''گھنگرو اور کشکول'' اس معاشرے کا ایک نازک موضوع ہے اور بہت سے نام نہاد شرفاء کا تعلق بھی اس کے ساتھ ہے۔

اس کتاب میں ایک طرف تو یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ طوائف صرف طوائف ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ بھی اسی دنیا کی ایک عورت ہوتی ہے جو کہ عام عورتوں کی مانند پاکیزہ اور اچھے ماحول میں نیک زندگی گزارنے کی خواہاں ہوتی ہے۔ لیکن بازاری ماحول سے تعلق جڑا ہونے کے باعث یہ معاشرہ اسے عزت کی زندگی گزارنے کی اجازت نہیں دیتا اور نتیجتاً وہ بے چاری تمام عمر طوائف کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہے۔

دوسری طرف اس میں طوائف کا یہ پہلو بھی اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ بسا اوقات طوائف کو اچھے اور پاکیزہ ماحول میں زندگی گزارنے کے خواہ کتنے ہی مواقع دیئے جائیں وہ اپنے اطوار بدلنے پر تیار نہیں ہوتی۔ کیونکہ جھوٹ' دھوکا' فریب' ریاکاری اور غلط کاری جیسی عادات اس کے اندر رچ بس چکی ہوتی ہیں۔ طوائف کم سنی میں ہی گناہوں کی دلدل میں دھنسنا شروع ہو جاتی ہے۔ کیونکہ کوٹھے کا ماحول گھروں جیسا نہیں ہوتا بلکہ تماش بینوں کی بیہودہ باتیں' گندے فقرے' نوٹوں کی جھلک اور ڈھولک کی تھاپ' گھنگھروؤں کی جھنکار اور جسم کی فروخت والا ماحول اس کو پیدا ہوتے ہی دیکھنے اور سننے کو مل جاتا ہے اور یوں طوائف زادی اپنی کمسنی میں ہی جوانی کی دہلیز پر پاؤں رکھ دیتی ہے۔

آج سب کا پروگرام تھا کہ انگلش پکچر دیکھی جائے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق تمام کو بمبینو سینما پہنچنا تھا لیکن ماسوائے آکاش کے کوئی بھی نہ پہنچ سکا۔ حالانکہ تمام لوگ آس پاس کے گھروں میں رہتے تھے۔ سات لڑکوں پر مشتمل یہ گروپ کسی نہ کسی فساد میں ملوث ہی رہتا تھا اور والدین نے ان سب کو جائیدادوں سے عاق اور قطع تعلق کر رکھا تھا۔ تقریباً تمام کی تصاویر ہر تھانے میں موجود تھیں۔ لیکن پولیس والے بھی ان کے ساتھ ملے ہوئے تھے اگر کبھی بھول کر کوئی پکڑا گیا تو صبح ہی اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاتا تھا۔ چھوٹی سی گلی میں آکاش نے چار گھر کرایہ پر لیے ہوئے تھے۔ ایک بیوہ عورت جو کہ ماسی جانو کے نام سے مشہور تھی' اس کے مرحوم شوہر نے کافی جائیداد چھوڑی تھی جو کہ بے اولاد جانو کی ملکیت تھی۔ آکاش گروپ ان چاروں گھروں کا کرایہ ایمانداری سے دیتا تھا کیونکہ کو ن سا اپنی جیب ڈھیلی کرنی ہوتی تھی۔ کسی کی تجوری سے لینے اور جانو کو دینے ہوتے تھے۔ گلی والے ان سے ہر لمحہ خوفزدہ رہتے تھے لیکن ان کی دہشت سے کچھ نہ کہتے تھے اور اس گروپ نے بھی کبھی گلی میں اپنی بدمعاشی کے جوہر نہ دکھائے تھے۔ جب وہ گلی میں داخل ہوتے تو لگتا تھا کہ ان جیسا شریف کوئی نہیں ہے' لیکن اخبارات آئے دن ان کا کوئی نہ کوئی کارنامہ بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے۔ نتیجہ وہی چور پولیس والا کھیل!

آکاش ماسی جانو کے ساتھ رہتا تھا۔ باقی لوگ ایک گھر میں سامان رکھتے تھے جسے وہ مالِ غنیمت کہتے تھے اور تین گھروں میں دو دو کی ٹولی میں رہتے تھے۔ ایک گاڑی اور ایک جیپ رکھی ہوئی تھی۔ گاڑی آکاش اور جیپ گروپ کے استعمال میں رہتی تھی۔

آکاش گلی میں مڑا ہی تھا کہ ماسی جانو دروازے میں کھڑی پریشان حالت میں ملی۔ وہ سردی اور بارش کی پروا کیے بغیر دوڑتی ہوئی آکاش کے پاس پہنچی اور روتے ہوئے بتانے لگی جبکہ آکاش حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا کہ پولیس نے تمہارے سامان والے گھر میں چھاپہ مارا ہے۔ لڑکے پولیس کے چھاپے سے ڈر کر تمہاری گاڑی میں فرار ہوئے ہیں اور پولیس ان کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ اس کے لیے حیرانی کی خبر تھی کیونکہ اس کے گھر میں آج کوئی بھی چیز ایسی نہ تھی جو جرم کی فہرست میں شامل ہوتی اور لڑکے پولیس سے ڈر کر کیوں بھاگے؟

اس نے ماسی جانو کے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کیے اور اُسے لیتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

''آکاش پتر! تم تو جانتے ہو کہ تم میرے بیٹے ہو' میں نے تمہیں بیٹوں کی طرح پالا ہے۔ کبھی بے اولادی کا احساس نہیں ہوا مجھے' تم اور تمہارا گروپ اولاد کی طرح ہیں۔ پتر! کسی طرح سے ان لوگوں کی خبر گیری کر۔ معلوم کر کہ وہ کہاں ہیں۔ کیا تھانے میں ہیں؟ کیا پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا ہے؟ وہ کیوں فرار ہوئے تھے؟ وہ لوگ خیریت سے تو ہیں' تو میرا پتر' ابھی جا اور ان کا پتہ کر۔'' ماسی جانو کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ ان سب کے لیے پریشان تھی' کیونکہ وہ بے اولاد تھی۔ بے شک یہ اُس کے کرایہ دار تھے لیکن گزشتہ پانچ برسوں سے ساتھ رہتے ہوئے ماسی جانو کو اُن سے اولاد جیسی محبت مل گئی تھی۔ وہ تمام ماسی کی بات کو نہیں ٹالتے تھے کیونکہ آکاش اس گروپ کا لیڈر تھا اور ماسی جانو کا بڑا بیٹا بھی بنا ہوا تھا۔

اس لحاظ سے ماسی جانو کی محبت بھی دیدنی تھی۔

آکاش دیوانوں کی طرح ماسی کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ روئے جا رہی تھی۔ ایک بار تو اس نے سوچا کہ ماسی ہماری سگی ماں تو نہیں ہے لیکن یہ ماں سے بڑھ کر پریشان ہے۔ کہیں اُسے یہ تو ڈر نہیں کہ یہ اس کا کرایہ نہ مار لیں' لیکن نہیں کرایہ دار تو اور بھی مل جائیں گے۔ دھت تیرے کی! کتنی گھٹیا بات سوچی تھی اُس نے ماسی کے بارے میں۔ جبکہ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ ماسی کو ہی دیکھا تھا۔ پتہ نہیں وہ کون تھا' کہاں سے آیا' کیوں آیا' اُسے ماسی کے پاس کون لایا تھا۔ حشمت علی نے بھی اُسے بڑا پیار دیا تھا' جو کہ ماسی کا خاوند تھا لیکن وہ آکاش کے بچپن میں ہی فوت ہو گیا تھا۔ بعد میں ماسی نے اسے پالا پوسا تھا۔ بس اُسے اتنا پتہ تھا کہ وہ ان کا سگا بیٹا نہیں ہے۔ محلے والے بچپن میں تو آکاش سے بڑا پیار کرتے تھے' لیکن غلط کاموں اور بُری صحبت نے تمام محلے داروں کو اس سے دور کر دیا تھا۔ ان دوستوں کو آکاش ہی لے کر آیا تھا اور ماسی کے کرایہ دار بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وقت پر کرایہ پہنچ جاتا تھا اور پھر آکاش تو بڑا بیٹا تھا۔

''اچھا ماسی! یہ بتاؤ کہ ہمارا تو فلم دیکھنے کا پروگرام تھا۔ تمام لڑکوں نے جانا تھا' پھر یہ گھروں میں کیسے رہ گئے اور پولیس! یہ کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔'' اُس نے ماسی کو کرسی پر بٹھایا اور فریج سے پانی نکال کر گلاس بھرا۔

ماسی جو کہ آکاش کی وجہ سے سنبھل چکی تھی' پھر بھی بھرائی ہوئی آواز میں بولی: "تم تو چلے گئے لیکن مانی کی طبیعت خراب ہوگئی۔ وہ لوگ اُسے ہسپتال لے کر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد واپس آئے تو راجو میرے پاس آیا کہ ہم لوگ فلم دیکھنے جا رہے ہیں لیکن اسی لمحے پولیس نے گلی میں قدم رکھا تو بھاگ کر دوسرے لڑکوں کو خبردار کرنے چلا گیا۔ پولیس نے تمہارے سامان والے گھر کے تالے توڑے اور نجانے کیا ملا یا نہیں ملا' مگر لڑکے جلدی میں تمہاری گاڑی لے کر بھاگ گئے۔ پولیس بھی ان کے پیچھے جیپ لے کر چلی گئی۔ تمام محلے دار مجھے کوس رہے تھے کہ اس بڑھیا نے ان بدمعاشوں اور غنڈوں کو کرایہ دار نہیں بنایا بلکہ پناہ دے کر رکھا ہوا ہے۔"

آکاش کے ذہن میں فوراً وہ گاڑی اور پولیس جیپ آ گئی جو اُسے ایک چوراہے پر کچلنے والی تھی۔

"یہ کب کا واقعہ ہے؟ میرا مطلب ہے کہ کیا وقت تھا؟"

"یہی کوئی شام چھ بجے ہوں گے۔"

لیکن گاڑیاں تو اُسے ابھی مل رہی تھیں جبکہ اب تو رات کے دو بج رہے تھے۔

اُس نے غور نہیں کیا تھا کہ اگلی گاڑی اس کی تھی۔

ذہن عجیب سی اُلجھن کا شکار تھا۔

"اچھا ماسی! آپ سو جائیں میں صبح اُن لوگوں کا پتہ کروں گا۔" آکاش کے لیے یہ معمول کا واقعہ تھا' لیکن ذہن اُلجھا ہوا تھا کہ ہر تھانے میں منتقلی پہنچ گئی تھی۔ کوئی بھی مشکوک چیز گھر میں موجود نہ تھی۔ پھر پولیس کا چھاپا! گتھی سلجھ نہ رہی تھی۔ خیر وہ ماسی کو اسی حالت میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ہیٹر آن کرنے کے بعد اُس نے کوٹ' جرابیں اور شرٹ اتار کر ایک طرف رکھے اور آج کے معاملات پر غور کرنے لگا۔

☆..........☆

گورنمنٹ کالج کے جناح ہال میں آج بی اے فائنل ایئر اور ایم اے فرسٹ ایئر کے تمام سٹوڈنٹس موجود تھے۔ لڑکیاں اور لڑکے ایک دوسرے پر ہوٹنگ کر رہے تھے۔ زرق برق لباس میں ملبوس لڑکیاں لڑکوں کو اپنی چلبلی اداؤں سے لبھا رہی تھیں۔ اسی اثناء میں اسٹیج سیکرٹری نے مائیک سنبھالا اور گویا ہوا'

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین! مے آئی ہیو یور اٹینشن پلیز!"

جیسا کہ آپ سب لوگ جانتے ہیں آج ایم اے والوں کے اعزاز میں بی اے والوں نے الوداعی پارٹی کا اہتمام کیا ہے۔ اس پارٹی میں آپ تمام لوگ مجھ سمیت شریک ہیں۔ کچھ پروگرام کا بھی اہتمام ہے۔ میرا مطلب ہے کہ جو رخصت ہو رہے ہیں ان کے لیے اور جو رخصت کر رہے ہیں ان کے لیے ہم نے ایک چھوٹا سا اہتمام کیا ہے۔ تو میں سب سے پہلے دعوت دیتا ہوں اپنے محبوب اور چلبلے دوست ہمایوں کو کہ وہ اسٹیج پر آ کر کوئی اچھا سا جوک سنائیں۔"

..........تالیوں کی گونج میں ایک نوجوان اسٹیج پر آیا جس کی شکل سے ہی ہنسی ٹپک رہی تھی۔

اُس نے مائیک پکڑا اور کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا:

"آپ لوگ میرے دوست ہیں اور سہیلیاں بھی ہیں' بات بُری لگے تو ٹماٹر اور انڈوں سے پرہیز کریں' کیونکہ دونوں چیزیں ہی ملک میں مہنگی ہیں۔"

"اوئے تم تو خود سہیلی ہو۔ مونچھیں تو منڈوا کر رکھتے ہو۔" کسی منچلے نے آوازا کسا۔ ہال زعفران زار بن گیا۔

"کوئی بات نہیں' میں تمہاری بات کا بُرا نہیں مانوں گا۔ خیر میں آپ کو ایک جوک سناتا ہوں۔ یہ خصوصی طور پر اُن لوگوں کے لیے ہے جو تعلیم سے فارغ ہو کر شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میرا جوک سننے کے بعد ہو سکتا ہے وہ پرہیز کریں اور توبہ کر لیں۔" ہمایوں کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک اور تیر آیا۔ "تمہارا قصور نہیں ہے' تم بھی مائیک پکڑ کر سیاستدانوں کی طرح بات لمبی کر رہے ہو۔"

"تمام باتیں چھوڑ دیار! یہ کیسٹ ہی بدل ڈالو۔" شور شروع ہو گیا تھا۔

"آرام سے بیٹھیں' مجھے نہیں علم تھا کہ آپ مجھے سننے کے لیے اتنے بے تاب ہیں۔" ہال پھر قہقہوں سے گونج اُٹھا۔ ہمایوں نے بھی جواباً اچھا فقرہ چُست کیا تھا۔ "تو سُنیئے جنابِ والا!

"کسی شیر کی شادی ہو رہی تھی۔ تمام شیر بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ ڈھول کی تھاپ پر شیر رقص کر رہے تھے۔ دور بیٹھا ہوا کتا کافی دیر سے دیکھ رہا تھا۔ جب اس سے

برداشت نہ ہوا تو وہ دوڑتا ہوا آیا اور شیروں کو دور دور ہٹا کر خود ناچنا شروع کر دیا۔

شیروں کو بہت غصہ آیا انہوں نے کُتے کو روکا اور سختی سے کہا کہ یہ ''شیر کی شادی ہے اور اس میں ناچنے کا حق بھی صرف شیروں کو ہے۔''

کُتا یہ بات سُن کر بولا: ''یارو! ایسی بھی کیا بات ہے' شادی سے پہلے ہم بھی شیر ہی تھے۔''

ہال قہقہوں سے گونجا تو ایک اور آواز آئی۔

''دیکھنا اب تعلیم کے فوراً بعد ہمایوں شادی کرلے گا۔''

یہ سننا تھا کہ قہقہوں کا طوفان آ گیا جبکہ ہمایوں اسٹیج سے جا چکا تھا۔

مائیک ایک بار پھر اسٹیج سیکرٹری کے ہاتھ آیا۔

''معزز حاضرین! اب میں دعوت دوں گا کالج کی جان' ہماری محبت' آپ سب کی چاہت سے لبریز' اس کالج کے انگریز صدیقی شاپر کو' وہ اسٹیج پر آئے اور اپنے خیالات کا اظہار کرے۔'' انتہائی کالا سٹوڈنٹ جس کے دانت یوں تھے کہ سنگھاڑا چھلا ہوا ہے۔ بس وہ ہنس رہا تھا۔ اسٹیج پر آ کر بولا:

''دوستانِ محترم! میں جانتا ہوں کہ آپ سب لوگ مجھے مذاق میں انگریز کہتے ہیں۔ کیا انگریز صرف گورے ہی ہوتے ہیں۔ کالے بھی تو انگریزی بولتے ہیں۔ لہٰذا انگریز تو وہی ہوا نا جو انگریزی بولے گا نا کہ کالے یا گورے رنگ والا انگریز ہوتا ہے۔''

کالا انگریز سنجیدہ لگ رہا تھا۔

''اچھی بات کہی ہے افریقہ کے انگریز نے' لہٰذا تالیاں۔''

ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

''میں تو دوستو'' اتنا ہی کہوں گا کہ

نہ ہوں گے ہم تو یاد آئے گی بہت دنیا ہماری
روؤ گے بیٹھ کر تنہائیوں میں ہمیں یاد کر کے!

''واہ بھئی واہ کیا شعر کہہ گیا ہے۔'' ماحول سیریس ہو گیا تھا۔

پارٹی جاری تھی۔ موبائل فونز بج رہے تھے۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ کالیں آ جا رہی تھیں۔ خوشگوار ماحول میں پارٹی کا اختتام آن پہنچا۔

''تو میرے دوستو! اب آخر میں آپ کی فرمائش پر اس کالج کے ہونہار طالب علم جو کہ ہمیشہ سے اول آتے رہے ہیں' آج اس پارٹی میں اینڈ پر ان کی باری اس لیے رکھی ہے کہ ان کی کہی ہوئی باتیں ہم یاد رکھیں گے۔''

اسمارٹ' خوبصورت' ذہین اور اچھے شاعر بھی ہیں۔ کافی لڑکیاں اُن پر مرتی ہیں' لیکن وہ کسی کو لفٹ نہیں کرواتے۔''

''کیوں' ان کی بجلی بند رہتی ہے!'' ایک اور فقرہ چُست ہوا' لیکن کوئی بھی نہ ہنسا' بلکہ کئی لڑکیوں نے فقرہ کسنے والے کو گھورنا شروع کر دیا تھا' کیونکہ وہ واقعی شاندار پرسنلٹی کا مالک تھا اور کئی لڑکیاں اس پر مرتی تھیں' لیکن اظہار کی جرأت نہ کر سکتی تھیں' کیونکہ وہ کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔

''تو میرے دوستو۔'' اسٹیج سیکرٹری نے ایک بار پھر بولنا شروع کیا۔

''میں دعوت دیتا ہوں اپنے پیارے اور محبوب دوست' جناب احمد رضا کو کہ وہ اسٹیج پر آئیں اور ہمیں اس سال کے آخر کے حوالے سے اپنی کوئی تازہ غزل یا کوئی تازہ نظم سنائیں۔''

احمد رضا ایک پُر وقار شخصیت کا نوجوان تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد' گورا رنگ' نقش ونگار بالکل حسینوں جیسے' آنکھیں موٹی موٹی' کسرتی وجود اور پُر وقار انداز سے چلنا یقیناً ہر لڑکی کو متاثر کرتا تھا۔

اُس نے مائیک پکڑ کر گلا صاف کیا اور بولنا شروع کر دیا۔

''میں آپ تمام دوستوں کا ممنون ہوں کہ اتنی محبت اور چاہت سے مجھے یہاں بلایا ہے۔ جتنی تعریف اور جتنا پروٹوکول آپ نے مجھے دیا ہے' میں اس قابل نہیں ہوں۔

ہر دن انسان کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کوئی کچھ کھو دیتا ہے تو کوئی کچھ پا لیتا ہے۔ اسی طرح دن' ہفتے اور مہینے گزرتے جاتے ہیں اور پتہ تب چلتا ہے جب سال بعد کیلنڈر بدل جاتا ہے۔''

وہ بول رہا تھا اور تمام ہال خاموشی سے اس کی اثر انگیز باتیں سُن رہا تھا۔ ''اور پھر سال کے آخر میں پتہ چلتا ہے کہ کیا نفع ہوا اور کیا نقصان...... لیکن کچھ لوگ اس بات کا بھی حساب رکھتے ہیں کہ سال کے تین سو پینسٹھ دن کیسے گزرے۔ میں بھی ان لوگوں

میں سے ایک ہوں جس کی زندگی میں وقت کی بہت اہمیت ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ وقت مجھے ڈھونڈے نہ کہ میں وقت کے پیچھے بھاگوں۔

وقت ایک لازوال دولت ہے مگر آپ مفت میں اسے حاصل کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ اس کی قدر کریں۔

لگتا ہے اب میں نے آپ کو کافی بور کر دیا ہے لہٰذا سال گزارنے کے بعد میں نے کیا کھویا' کیا پایا' میں آپ کو اپنی تازہ غزل میں سناتا ہوں۔

غزل:

گزر گیا اپنا یہ سال بھی اچھی قسمت کے بغیر
یاد نہیں کوئی بھی لمحہ جو گزرا ہو اذیت کے بغیر

''واہ! واہ! ارشاد۔ مکرّر!'' طرح طرح کی آوازیں آ رہی تھیں جبکہ لڑکیاں تو رشک بھری آنکھوں سے احمد رضا کی طرف دیکھ رہی تھیں' کیونکہ اُس کے بولنے کا انداز اور شعر کہنے کا سلیقہ دل لبھانے والا تھا۔

خزاں کی محبت میں توڑ لیا شجر سے رشتہ
پھر جیون ہی اپنا گزر گیا بہار کی عنایت کے بغیر

سنگسار کر دیئے جاتے ہیں جو پوجتے ہیں صنم کو
بخدا کوئی تو دفنا دو اس روایت کے بغیر

کوئی پُرانا ہی تعلق تھا کہ چلے گئے اُس کی بزم میں
یہ کہہ کر نکالے گئے کہ آئے ہو اجازت کے بغیر

دنگ رہ گئے شہر میں قاتل کا احترام دیکھ کر
پتہ چلا وہ قتل کرتا ہے اذیت کے بغیر

قابلِ غور مقطع ہے' ذرا توجہ چاہتا ہوں۔''

''آپ کا تو ہر لفظ ہی قابلِ غور ہے۔'' پہلی بار کسی چلبلی نے چلبلی بات کہی۔ سبھی

کوئی تو ربط ہوگا تیرا خراب حالوں سے رضا
ورنہ کون غزل لکھتا ہے کسی رغبت کے بغیر

شکریہ! ہال میں تالیوں کی گونج سے کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔

☆..................☆

آکاش پریشانی کے عالم میں ہی سو گیا تھا۔

فون کی بیل بجنے پر اُس کی آنکھ کھلی تو گھڑی کی جانب نظر دوڑائی۔ صبح کے سات بج رہے تھے۔ فون اٹھا کر ہیلو کہا ہی تھا کہ دوسری طرف سے لالہ کے رونے کی آواز آئی۔

''ہیلو آکاش بھیا! ہمیں بچا لو۔ یہ لوگ ہمیں مار ڈالیں گے۔ آکاش بھیا ہمیں بچا لو۔'' وہ مسلسل روئے جا رہا تھا۔

''لالہ! تم کہاں سے بول رہے ہو؟ کون مار ڈالے گا؟ ارے تم رو کیوں رہے ہو؟ ہیلو! لالہ! مجھے بتاؤ کہ تم لوگ کہاں ہو؟''

''میں بتاتا ہوں کہ یہ لوگ کہاں ہیں۔'' اچانک کسی نے لالہ کے ساتھ سے ریسیور چھین کر کھردری آواز میں بات کی۔

''کون ہو تم اور یہ تمام لوگ کہاں ہیں؟'' آکاش کی آواز غصے سے پھٹ پڑی۔ اُس کے چہرے کی رگیں تن گئی تھیں کیونکہ بعد میں بولنے والا بالکل اجنبی تھا اور اس کے بولنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بھی کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔

''غصہ قابو میں رکھو جان! کیونکہ تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔''

دوسری طرف سے دھیمے لہجے میں کہا گیا ''میری بات غور سے سنو! آج رات دس بجے سکندر ہوٹل کے باہر کھڑے رہنا' تمہیں سیاہ رنگ کی کار پک کر لے گی۔ یاد رہے آج رات دس بجے۔'' دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔

آکاش ریسیور ہاتھ میں پکڑے سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ یہ کوئی لمبی گیم لگتی ہے کیونکہ یہ لوگ کسی تھانے سے نہیں بول رہے تھے کیونکہ سکندر ہوٹل کا پتہ کوئی تھانیدار کیوں دے گا اور پھر لالہ کے رونے سے تو ظاہر ہوتا تھا کہ ان لوگوں پر زبردست ٹارچر کیا گیا ہے' کیونکہ آکاش گروپ کسی بھی حالت میں پولیس والوں سے مار کھا کر نہیں روتا' تو پھر یہ کون لوگ ہیں؟

پولیس کا چھاپہ' پولیس جیپ' میرے دوستوں کا پوچھا اور پھر صبح لالہ کا فون پر یہ کہنا کہ یہ لوگ ہمیں مار ڈالیں گے......!؟ کون لوگ ہیں یہ جو آ کاش گروپ سے ٹکرا گئے؟ شہر میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو آ کاش گروپ کی دہشت سے واقف نہ ہو۔

ماسی جانو نے ناشتہ لگا دیا تھا۔ دونوں نے تھوڑا بہت ناشتہ کیا۔ آ کاش کو علم تھا کہ ماسی جانو ابھی ان لوگوں کا پوچھے گی۔ وہ پہلے ہی بول پڑا۔ ''ماسی! لالہ کا فون آیا تھا' وہ لوگ شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ دو ایک روز میں آ جائیں گے۔''

''آ کاش پتر! مجھے علم ہے کہ تو مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے' کیونکہ تیرا لہجہ' تیری آنکھیں اور تیری زبان تیری بات کا ساتھ نہیں دے رہے' لیکن میں تم پر اعتماد کرتی ہوں۔ امید ہے کہ وہ لوگ دو ایک روز میں ضرور آ جائیں گے۔''

ماسی جانو کی آواز بھرا گئی تھی۔ آ کاش بھلا کیا کر سکتا تھا' اُسے تو علم تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ نظر بچاتا ہوا گھر سے باہر نکل آیا۔ سردی عروج پر تھی' رات کی بارش نے سارا علاقہ جل تھل کر دیا تھا۔ ابھی تک دکانیں نہ کھلی تھیں۔ آ کاش کو سگریٹ کی طلب ہوئی تو اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانے پر ایک چھوٹی سی دکان نظر آ ہی گئی جو ابھی کھل رہی تھی۔ سگریٹ سُلگا کر اس نے کوٹ کی جیب میں کچھ رقم اور اندرونی جیب میں پسٹل چیک کیا اور انجانے راستے کی طرف چل پڑا۔

سکندر ہوٹل شہر سے باہر تھا۔ سنسان روڈ پر پتہ نہیں سالے کو کیا سوجھی تھی ہوٹل بنانے کی۔ ٹیکسی روک کر آ کاش نے ڈرائیور کو سکندر ہوٹل چلنے کے لیے کہا۔

سکندر ہوٹل میں کوئی خاصا رش نہ تھا' کیونکہ شہر سے دور ہونے کی وجہ سے اِکّا دُکّا لوگ ہی اِدھر آتے تھے۔ آ کاش چائے پی کر واپس آنا ہی چاہتا تھا کہ ایک ویٹر نے پلیٹ میں ایک چٹ لا کر آ کاش کے سامنے رکھ دی۔ آ کاش نے حیرانی سے ویٹر کی طرف دیکھا۔

''جی سر' یہ آپ کے لیے ہے۔'' ویٹر نے اُس کی سوالیہ نظریں بھانپ لی تھیں۔

''اتنی بھی جلدی کیا ہے' ابھی رات کے دس بجنے میں دس گھنٹے باقی ہیں۔''

پرچی پر یہ تحریر پڑھتے ہی وہ چونک گیا۔ اُسے فون پر یہاں بلانے والا یقیناً آس پاس ہی ہوگا' اس نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں' لیکن ہر آدمی اپنے کام میں مگن نظر آیا

۔ کوئی بھی ایسا مشکوک آدمی نہ ملا جس کے بارے میں یہ سمجھا جا سکتا کہ فون کرنے والا یہی ہو سکتا ہے۔ آ کاش نے پرچی تہہ کر کے جیب میں ڈالی اور ہوٹل سے باہر نکل آیا۔

اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے' یہ کون لوگ ہیں' جنھوں نے اس کے ساتھیوں کو اغوا کر لیا تھا۔ اب آ کاش کو بھی بلایا تھا وہ چاہتے تو اُسے بھی اغوا کر سکتے تھے کیونکہ ان کی نظریں یقیناً اس پر ہوں گی۔ جبھی تو سکندر ہوٹل میں پرچی پر اُسے پیغام ملا تھا۔ وہ اسی کشمکش میں چلتا ہوا کافی دور نکل آیا۔

رضا آباد تھانے کا انچارج آ کاش کا بیلی تھا۔ بیلی کیوں نہ ہوتا ہر ماہ اُسے بھاری رقم ملتی تھی اور اسی لحاظ سے وہ اُس کی عزت بھی کرتا تھا اور سچی بات تو یہ کہ وہ آ کاش گروپ سے ڈرتا بھی تھا۔ یہی نہیں بلکہ تمام پولیس والے آ کاش کے نام سے کانپتے تھے۔

لمبا تڑنگا' خوبصورت' کھلے ہاتھ پیروں کا مالک آ کاش جب تھانہ رضا آباد پہنچا تو گیٹ پر کھڑے سپاہی نے خوش ہو کر اس کا استقبال کیا۔

آ کاش چلتا ہوا تھانیدار علی شیر کے کمرے کی طرف بڑھا جو کسی کیس کی فائل دیکھ رہا تھا۔ آ کاش کو دیکھ کر مسکراتا ہوا اٹھا اور فائل بند کر کے آ کاش کی طرف ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا اور اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''ہاں تو مسٹر آ کاش! آج آپ کو کیسے ہماری یاد آ گئی؟ ہمیں بلاوا بھیج دیتے۔''

اس نے تحکمانہ اور کاروباری مسکراہٹ چہرے پر سجا کر کہا کیونکہ آ کاش اس کی پارٹی تھی اور تگڑا گاہک بھی۔

''علی شیر! اس شہر میں جتنے بھی غلط کام ہوتے ہیں وہ سارے میرا گروپ کرتا ہے۔ تمھیں اس کا باقاعدہ معاوضہ ملتا ہے' نہ آج تک ہم نے کسی کو اغوا کیا ہے اور نہ ہی کسی کو بلیک میل کیا ہے۔ چھوٹے موٹے دھندے میں اپنی بڑی دہشت پھیلا رکھی ہے۔ بس اتنا کرتے ہیں کہ تم بھی اور ہم بھی دال روٹی کے ساتھ بوٹی بھی عزت سے کھا سکیں۔'' وہ کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

''کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ اس شہر میں کوئی اور گروپ یا غنڈہ بدمعاش تمہیں اتنا معاوضہ دے سکتا ہے جتنا میں دیتا ہوں؟'' اُس نے علی شیر کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر پوچھا۔ ''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' انسپکٹر کا انداز سوالیہ تھا۔ اتنی دیر میں دو کپ چائے اور کچھ لوازمات آ گئے۔ سپاہی نے ایک کپ صاحب کے سامنے اور ایک آ کاش کے آگے رکھ دیا اور چلا گیا۔

''کل رات سے میرا پورا گروپ کسی نے اغوا کرلیا ہے اور تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ کس نے ایسا کیا ہے کیونکہ سکندر ہوٹل تمہارے علاقہ کی رینج میں آتا ہے۔''

آ کاش نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے علی شیر کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ کسی ماہر چہرہ شناس کی طرح اُس کا چہرہ پڑھ رہا تھا۔ لیکن ابھی تک تو پولیس بے قصور نظر آ رہی تھی۔ یہ اس کا تجربہ تھا۔

''یہ تم کیسی بات کرتے ہو؟ تمہیں تو پتہ ہے کہ علی شیر کے علاقہ میں کوئی چڑیا بھی پر مارے تو ہم اس کے پر کاٹ دیتے ہیں اور تمہارا گروپ تو خود کئی لوگوں پر بھاری ہے۔ اُسے کن لوگوں نے اغوا کرنے کی جرأت کی؟ یقین کرو آ کاش! میں اس معاملے میں بے خبر ہوں' بلکہ تمہارے بتانے سے میری ٹینشن بڑھ گئی ہے۔ اب دو دو گروپوں کو دیکھنا میرے بس سے باہر ہے اور میں واقعی نہیں جانتا کہ وہ کون لوگ ہیں۔'' انسپکٹر ٹھیک کہہ رہا تھا کیونکہ آ کاش اس کو کئی سالوں سے جانتا تھا۔

''ٹھیک ہے انسپکٹر! پھر نئے لفڑے میں پڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میرے دوستوں پر ہاتھ ڈالنے والوں کے آ کاش ہاتھ پاؤں تو توڑے گا ہی' ساتھ ساتھ ان کی رگیں بھی کھینچ لے گا۔ یہ آ کاش کا تم سے وعدہ ہے۔'' یکدم اس کی آواز میں درندگی عود کر آئی تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے والا آ کاش نہ لگ رہا تھا۔ وہ علی شیر کو حیران چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ گیٹ پر کھڑے سپاہی نے مسکرا کر سلام کیا اور بولا:

''صاحب! آپ تو جانتے ہیں کہ میری بیٹی جوان ہے' میں اس کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' آ کاش نے ہاتھ اٹھا کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا:

''تم نے کوئی لڑکا دیکھا ہے؟''

''ہاں صاحب! وہ اپنی خالہ کی طرف شادی کرانا چاہتی ہے۔ مجھے اور اس کی ماں کو کوئی اعتراض نہیں صاحب! وہ اچھا لڑکا ہے' محنتی ہے اور دس جماعتیں بھی پڑھا ہوا ''

''ٹھیک ہے تم بیٹی کی شادی طے کرو اور مجھے اطلاع کر دینا۔'' وہ جانے لگا تھا کہ سپاہی نے اُسے ایک پرچی تھما دی۔ ''یہ ایک کالے رنگ کی گاڑی والا دے کر گیا ہے۔''

آ کاش نے حیرانی سے وہ پرچی کھولی۔

''تھانے کچہری تو بچوں کے کھیل ہیں۔ یہ بات تم جیسے نوجوان کو زیب نہیں دیتی کیونکہ معاملہ علی شیر کے قد سے بہت اونچا ہے۔'' تحریر جانی پہچانی تھی۔

''تم نے گاڑی کا نمبر دیکھا؟'' اس نے پرچی تہہ کر کے جیب میں ڈال لی اور سپاہی کی طرف متوجہ ہوا۔

''ہاں صاحب! میں نے کوشش کی' جس گاڑی میں وہ بندہ آیا تھا' وہ بغیر نمبر پلیٹ کے تھی۔ میں سمجھا کوئی آپ کا دوست ہوگا۔''

آ کاش وہاں سے چل پڑا۔ عجیب سی اُلجھن تھی۔ وقت ہی نہیں گزر رہا تھا۔ کبھی ہم لوگ وقت کی قدر نہیں کرتے' لیکن کبھی کبھی وقت بھی ہماری قدر نہیں کرتا۔ الجھنوں اور پریشانیوں کے حل کے لیے کافی وقت درکار ہوتا ہے' یہاں تو وقت ہی وقت تھا لیکن اُلجھن سلجھ نہ رہی تھی' بلکہ مزید پریشان کر رہی تھی۔

وہ جہاں بھی جاتا تھا کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہوتا' لیکن کیوں؟ وہ لوگ کیا چاہتے تھے؟ اور پھر یہ تحریر کہ معاملہ علی شیر کے قد سے بھی اونچا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ میں جس انسپکٹر سے ملا ہوں' اس کا نام علی شیر ہے۔ خیر یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ جرائم سے تعلق رکھنے والا ہر شخص متعلقہ تھانے کی پوری رپورٹ لینے کے بعد ہی جرم شروع کرتا ہے۔

موبائیل کی گھنٹی نے اُسے چونکا دیا' یہ آج صبح سے پہلی کال تھی جو اس کے موبائیل پر آئی تھی ورنہ تو زیادہ تر موبائیل اس کے کانوں سے ہی لگا رہتا تھا۔ آج گروپ موجود نہ تھا اسی لیے موبائیل بھی خاموش تھا اور اب وہ گھنٹی سُن کر چونک گیا تھا۔ گھر کا نمبر دیکھ کر اُسے مزید حیرت ہوئی۔ ماسی جانو کو کیا ضرورت پڑ گئی کہ وہ آ کاش کو فون کرے۔ کبھی کبھار ماسی فون کر دیتی تھی' لیکن آج جو سچویشن تھی اس میں ماسی کا فون بڑی اہمیت رکھتا ہوگا۔ اس نے فوراً موبائیل کا بٹن دبا کر کان سے لگایا۔ دوسری جانب ماسی جانو کی بجائے کسی مرد کی آواز سنائی دی۔ ''فوراً گھر پہنچو۔ کوئی نئی خبر تمہارا انتظار کر رہی ہے'' ...... دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''ہیلو تم کون بول ....؟'' لیکن دوسری

طرف سے رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ شام کے سات بج چکے تھے۔ ابھی سکندر ہوٹل میں جانے کے لیے تین گھنٹے باقی تھے‘ لیکن اس کے گھر میں غیر مرد اور پھر یہ نئی خبر کیا ہوگی۔ یہ کیا گھن چکر ہے‘ اس تمام قصے نے آکاش کو واقعتاً چکرا کر رکھ دیا تھا۔ آج بھی سارا دن آسمان پر بادلوں کا راج تھا۔ شام ہوتے ہی سرد ہواؤں نے کاروباری زندگی سے تعلق رکھنے والوں کو گھروں میں گھسنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اُس نے ایک ٹیکسی کو رُکنے کا اشارہ کیا اور بیٹھ کر گھر کی جانب چل دیا۔ ٹیکسی گلی میں داخل ہوئی تو اس کے گھر کے باہر ایک کالے رنگ کی کرولا کھڑی تھی۔ جو اُس کے لیے اجنبی نہ تھی۔ وہ اس گاڑی کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔

ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر رخصت کیا تو گھر کی دہلیز پر قدم رکھا اور اندر داخل ہوتے ہی اس کے کانوں میں رس گھولنے والی آواز ٹکرائی۔

”زہے نصیب کہ سرکار گھر تشریف لائے۔“ یہ شمع تھی‘ اُس کی کالج فیلو‘ جو کہ ایک امیر کبیر باپ کی بیٹی تھی۔ دو فلور ملز‘ ایک ٹیکسٹائل ملز اور گاڑیوں کے شوروم‘ اور پتہ نہیں کیا کیا تھا۔ یہ خود شمع کو بھی نہ علم تھا۔ شمع کالج دور میں ہی اس سے محبت کرتی تھی‘ لیکن آکاش ہمیشہ اس سے پیچھا چھڑانے کے چکر میں تھا‘ کیونکہ امیر کبیر لوگوں اور دولت مندوں سے اس کی بنتی نہ تھی اور وہ ان جھنجھٹوں سے دور رہنا چاہتا تھا‘ لیکن شمع مہینے میں ایک دو بار اُس کے ہاں ضرور چکر لگاتی تھی اور بضد تھی کہ آکاش ہی سے شادی کرے گی۔

خوبصورتی اور گوری رنگت نے شمع کو کافی دلفریب بنا دیا تھا۔ گہرے سبز رنگ کی دیدہ زیب فینسی ساڑھی نے اس کی خوبصورتی کو مزید چاند لگا دیئے تھے۔ کومل سی مسکان اور دلفریب اداؤں نے ایک بار تو آکاش کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ ایک لمحہ تو وہ ساری الجھن بھول گیا تھا‘ لیکن دوسرے لمحے اسے ماسی جانو کی آواز سنائی دی۔

”آکاش پتر! کچھ پتہ چلا؟“ وہ ابھی تک پریشان تھی۔

ماسی کی آواز نے آکاش کو احساس دلایا کہ آج انتہائی حساس معاملہ کو نپٹانا ہے اور اب شمع کی بچی کو بھی ٹرخانا ہوگا۔

”آکاش جی! آپ کو گھر بلانے کے لیے سو سو طریقے اپنانا پڑتے ہیں۔“ اس نے دلربائی سے کہا

”دراصل شمع! میں ایک کام میں مصروف تھا۔“ اس نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ وہ چاہتا تھا کہ شمع جلد از جلد یہاں سے چلی جائے۔ پھر اُسے دس بجے سکندر ہوٹل بھی جانا تھا‘ جہاں اس کے دوستوں کے ساتھ نجانے کیا سلوک ہو رہا تھا۔

”آکاش! میں تب تک تمھیں چاہتی رہوں گی جب تک تم خود نہ کہو گے: ”آئی لو یو شمع......“ اُس نے پرانا ڈائیلاگ دُہرایا۔

”شمع پلیز۔ فلمی دنیا سے نکل آؤ...... میں حقیقت ہوں اور حقیقت میں کبھی ٹاٹ کا پیوند مخمل میں نہیں لگتا۔ تمہیں بھی علم ہے بلکہ اب تک تو تم بہتر طور پر جان چکی ہوگی کہ میں کیا ہوں۔ غنڈہ‘ موالی‘ بدمعاش اور پتہ نہیں لوگ کن کن ناموں سے مجھے یاد کرتے ہیں۔ کوئی شریف آدمی میرے پاس نہیں بیٹھتا۔ لوگ مجھ سے کترا کر گزرتے ہیں۔ آخر تم کیوں میرے پیچھے پڑی ہوئی ہو؟“ یہ اچھی خاصی تقریر تھی اور کچھ تلخ بھی۔

لیکن شمع ٹس سے مس نہ ہوئی اور یہ کہتی ہوئی چلی گئی کہ:

”تم اچھے ہو یا بُرے‘ یہ تمہارا فعل ہے‘ لیکن میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ اچھا چلتی ہوں۔ بائے‘ بائے!“ وہ باہر کی طرف لپکی۔

”ارے اس بار بھی چائے وغیرہ کے بغیر ہی جاؤ گی۔“ آکاش نے اوپری دل سے کہا حالانکہ وہ چاہتا تھا کہ شمع چلی جائے۔

”آکاش! میں تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔ جب تم دل کی چائے پلاؤ گے تب ضرور پیوں گی۔ یہ چائے تو گرم پانی ہے اور بغیر خلوص کے ہے۔“ وہ واقعی سیریس تھی۔

”دوبارہ پھر آؤں گی‘ لیکن کب آؤں گی یہ نہیں بتاؤں گی۔ بائے!“ وہ دلربایانہ انداز میں ہاتھ ہلاتی ہوئی چلی گئی۔

”آکاش پتر! مجھے اس لڑکی کے لچھن ٹھیک نہیں لگتے۔“ اندر سے ماسی جانو نکلتی ہوئی بولی۔

”ارے ماسی‘ کوئی بات نہیں۔ یہ کونسی مجھے تم سے چھین کر لے جائے گی۔ میری مرضی ہوگی تو کچھ بنے گا۔“ وہ دور کہیں دیکھتا ہوا بولا‘ اس کا دماغ دس بجے پر اٹکا ہوا تھا۔

”پتر! جا کہیں سے ان لوگوں کا پتہ کر وہ کہاں ہیں؟“

ماسی جانو ایک بار پھر پریشان ہوگئی تھی۔ دفعتاً آکاش کا موبائل بج اٹھا۔ دیکھا تو کوئی Massage (پیغام) آ رہا تھا۔

اس نے میسج پڑھا تو کان سائیں سائیں کرنے لگے‘ کیونکہ بات ہی ایسی تھی۔

''آدھا گھنٹہ بعد دس بج جائیں گے لہٰذا ماسی کو چھوڑ کر اب سکندر ہوٹل کی طرف چل پڑو۔'' یہ پیغام کیا تھا‘ ایک ایٹم بم تھا۔ وہ لوگ پل پل کی خبر رکھتے تھے۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ آکاش اس وقت کہاں ہے اور پاس کون ہے۔ وہ گھر سے سکندر ہوٹل جانے کے لیے نکل پڑا۔ ماسی جانو آوازیں دیتی رہ گئی۔

☆..........☆

احمد رضا کالج فنکشن سے فارغ ہونے کے بعد گھر کی طرف چل پڑا۔

کئی کلاس فیلوز لڑکے اور لڑکیاں اُسے اپنی عالی شان گاڑی میں لفٹ دینے کے لیے تیار تھے‘ مگر وہ احمد رضا تھا۔ غریب لیکن خود دار! وہ کسی کو بھی اپنے گھر کا ایڈریس نہ دیتا تھا۔ بس اپنی دنیا میں مگن رہنے والا‘ تعلیم سے دلچسپی‘ شاعری کا شوق‘ کرکٹ کھیلنا‘ یہ دو تین مشغلے اس نے اپنائے ہوئے تھے‘ لیکن تمام کالج والوں کے لیے وہ ایک پُراسرار شخصیت تھا‘ کیونکہ آج تک کسی کو اس کے گھر کا علم نہ تھا۔ وہ کالج سے تقریباً ایک کلومیٹر دور بس سٹاپ پر جا کر بس میں بیٹھتا تھا۔ حالانکہ بس کالج گیٹ پر بھی رُکتی تھی‘ لیکن گزشتہ دو سال سے اس کا یہی معمول تھا۔ کئی لڑکیوں نے اس کا پیچھا بھی کیا لیکن وہ ایک سٹاپ پر اتر کر آوارہ ٹہلنے لگتا۔ یا کبھی گندی سی بستی کے قریب ایک چھوٹے سے پارک میں بیٹھ کر پڑھتا رہتا۔ گندی اور تنگ گلیوں والی بستی میں ہی اس کا ایک گھر تھا۔ جو کوئی بھی اس کا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک پہنچتا خود ہی تھک ہار کر واپس چلا جاتا تھا‘ کیونکہ کمپیوٹر کا دور ہے۔ ہر کوئی اپنی اپنی دھن میں مگن ہے‘ اب کوئی بھی اُس کا پیچھا نہ کرتا تھا بلکہ کئی لڑکیوں نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ احمد رضا کے سینے میں دل نہیں ہے۔ لیکن اُسے ان باتوں کی کوئی پروا نہ تھی‘ کیونکہ وہ اپنی موج میں مست رہنے والا بندہ تھا۔ آج بھی وہ حسبِ معمول بس سے اُتر کر پارک کی طرف چل پڑا‘ لیکن آج پڑھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ آج فنکشن میں جو اس نے غزل پڑھی تھی‘ وہ پورے سال کا نچوڑ تھی۔ وہ اردگرد جو کچھ دیکھتا تھا‘ اسے اپنی شاعری میں سمونا جانتا تھا۔ وہ لفظوں کا کھلاڑی تھا۔ لفظ اس کے محتاج تھے۔ وہ انہیں توڑتا اور جوڑتا رہتا تھا‘ لیکن کبھی غرور اور تکبر نہ کیا تھا۔ تمام شاعری اکٹھی کرنے کے بعد اس کا پروگرام تھا کہ ایک کتاب شائع

کی جائے‘ لیکن اس کا بابا اس خواب میں رکاوٹ تھا۔ یہ بات نہیں کہ بابا ان پڑھ یا جاہل تھا‘ یا وہ اسے روک رہا تھا۔ بس اسے اندیشہ تھا کہ جب وہ اچھی کتاب شائع ہوگی تو لوگ انٹرویو کے لیے آئیں گے۔ اخبارات و رسائل جب اس کا انٹرویو شائع کریں گے تو وہ کیا بتائے گا کہ اس کا باپ کیا کرتا ہے۔ کون سا بزنس ہے‘ کیا کاروبار ہے۔ صحافی لوگ اس کے گھر آئیں گے تو اس کا بھید کھل جائے گا۔ یہ راز بھی کھل جائے گا کہ وہ فقیر کا بیٹا ہے۔ اس فقیر کا جو سارا دن ریلوے اسٹیشن پر بھیک مانگتا ہے اور رات کو سکوں سے بھرا ہوا کشکول لے کر گھر لوٹتا ہے‘ جس سے گھر اور احمد رضا کی تعلیم کا خرچہ چلتا ہے۔ اس نے کئی بار روکا تھا لیکن خیرو ہر بار اس کی بات ٹال دیتا تھا۔ اور یہ کہتا تھا کہ یہ اس کی ماں کی بددعا ہے کہ میں جب تک زندہ رہوں گا‘ تمام عمر بھیک مانگتے ہی گزر جائے گی..... پڑھے لکھے اور باشعور اور رضا کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ دادی نے ابا کو یہ بددعا کیوں دی تھی‘ کیونکہ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا‘ یہی ٹوٹا پھوٹا گھر دیکھا تھا اور ابا کو بھیک مانگتے ہوئے پایا تھا‘ لیکن اُسے اس کام سے نفرت تھی اور اُس نے یہی رٹ لگائی کہ وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ خیرو نے بیٹے کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور اسے دورانِ تعلیم کبھی روپے پیسے کی کمی نہ آنے دی‘ لیکن احمد رضا نے کبھی ضرورت سے زیادہ پیسے نہ لیے تھے‘ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ گرمی اور سردی میں اس کا بابا خون پسینہ ایک کر کے ایک ایک سکّہ جمع کرتا تھا۔ اس نے بابا کی محنت رائیگاں نہ جانے دی تھی۔ خوب دل لگا کر پڑھا تھا اور اب ایم اے فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا۔ ایم اے انگلش کرنے کے بعد اس کا پروگرام تھا کہ ایم بی اے کرے اور ایک کامیاب بزنس مین بن کر اپنی اور بابا کی باقی زندگی میں انقلاب برپا کردے لیکن یہ تمام خواب پورے کرنے کے لیے کافی وقت درکار تھا۔ اس نے سوچا وہ ایک بار پھر کوشش کرے گا کہ بابا بھیک مانگنا چھوڑ دے تاکہ ہم لوگ یہاں سے نکل کر شہر میں کسی اچھے سے مکان میں رہیں‘ لیکن اچھے مکان کے لیے اچھا روپیہ درکار تھا‘ جو اُن کے پاس نہ تھا۔ کمند ٹوٹ جاتی تھی بس یہیں آ کر وہ رہ جاتا تھا کہ پیسہ ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اس کی ساتھی لڑکیوں کو اگر پتہ چل جائے کہ ان کا چہیتا‘ خوب صورت اور وجیہہ نوجوان‘ مقبول شاعر اور کالج کا ذہین ترین طالب علم ایک فقیر کا بیٹا ہے تو کوئی اس کے پاس بھی نہ پھٹکے‘ بلکہ ہمارا

معاشرہ تو ایسا ہے کہ لوگ اس کے پاس سے ناک پر رومال رکھ کر گزریں اور اسے اپنے پاس نہ بیٹھنے دیں' کیونکہ اچھا معیار' اچھی سوسائٹی اور اچھا سٹیٹس صرف روپے پیسے سے مشروط ہے اور پھر اس کا بابا بھی تو کہتا تھا کہ باقی ساری زندگی بھیک مانگتے ہوئے گزرے گی' لیکن وہ احمد رضا کو ایک اچھا اور کامیاب انسان دیکھنا چاہتا ہے' مگر کیسے؟ وہ مانگنا چھوڑے گا تو میں کامیاب ہوں گا مگر پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا......؟! وہ اکثر انہی خیالوں میں غلطاں رہتا اور دن پر لگا کر اُڑ رہے تھے۔ وہ گھر کی طرف چل پڑا۔ کچی آبادی میں تنگ سی گلی تھی اور نکڑ پر اُس کا مکان۔ ایک فقیر کا گھر کیسا ہوتا ہے' اندازہ لگانا مشکل نہیں' لیکن احمد رضا نے اپنی نفیس طبیعت کے مطابق اُسے کئی بار وائٹ واش کر کے تھوڑا بہت سنوارنے کی کوشش کی تھی اور اپنے کمرے میں اچھی خاصی صفائی رکھی تھی۔ دو کمروں کے اس گھر کا ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ تھوڑے بہت استعمال کے برتن تھے۔ رضا اپنا ناشتہ بنانے لگتا تو بابا کے لیے بھی تیار کر دیتا تھا۔ دونوں باپ بیٹا اکٹھے گھر سے نکلتے تھے' لیکن بستی سے باہر آ کر الگ الگ سمتوں میں روانہ ہو جاتے تھے۔ ایک چابی خیرو کے پاس اور دوسری رضا کے پاس ہوتی تھی تاکہ جو بھی پہلے آ جائے' اسے دوسرے کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ گھر پہنچ کر اس نے اکلوتے دروازے کی طرف دیکھا تو خلافِ توقع دروازہ کھلا ہوا ملا......کیا بابا جلدی آ گیا ہے؟ یا پھر کوئی چور آ گھسا ہے' لیکن چور اس گھر سے کیا لے جائے گا! فقیروں کے گھر میں چور نہیں آتے...... یہ بابا ہی ہوگا۔ وہ بہت کچھ سوچتا ہوا گھر میں داخل ہوا تو صحن میں ہی بابا مل گیا۔

''السلام علیکم ابا! خیریت ہے' آپ جلدی آ گئے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟''

اُس کی آواز میں تشویش تھی کیونکہ خیرو کبھی ناغہ نہ کرتا تھا اور وقت سے پہلے کبھی گھر نہ آتا تھا۔ یہ گزشتہ پچیس سال سے معمول چلا آ رہا تھا اور آج خلاف توقع وہ گھر پر وقت سے پہلے موجود تھا تو احمد رضا کی تشویش بجا تھی۔

''ارے رضا بیٹا! فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے ہلکا سا بخار محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا گھر چل کر آرام کر لوں' کہیں طبیعت مزید خراب نہ ہو جائے۔'' خیر دین نے بیٹے کی پریشانی بھانپ لی تھی۔ ''آؤ بیٹھو' میں تمہارے لیے چائے بناتا ہوں۔ کالج کیسا رہا؟'' خیر دین نے چولہے پر پانی گرم کرنا شروع کر دیا اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتا جا

رہا تھا۔

''کالج ٹھیک ہے ابا! آپ آرام کریں۔ میں چائے بناتا ہوں۔'' رضا نے باپ کو چارپائی پر بٹھایا اور خود چائے بنانے میں مصروف ہو گیا۔

خیر دین کی عمر تقریباً ساٹھ برس تھی' لیکن وہ ابھی تک صحت مند اور تندرست و توانا تھا۔ جوانی میں خیر دین یقیناً خوبصورت اور دل کش شخصیت کا مالک رہا ہوگا' کیونکہ ساٹھ سال کی عمر میں پہنچنے پر بھی اس کا رنگ سرخ و سفید تھا' لیکن بڑھی ہوئی شیو اور میلے کچیلے کپڑوں نے خیر دین کی خوبصورتی اور مکمل شخصیت کو ڈھانپ رکھا تھا بلکہ گہنا کر رکھ دیا تھا۔

''آج کالج میں الوداعی فنکشن تھا' کافی ہلا گلا رہا۔ بس مصروف ترین دن گزرا جیسے روز گزرتا ہے۔'' رضا نے چینی ڈال کر ابلتی ہوئی چائے کو نیچے کرتے ہوئے کہا۔

''بس بیٹا! تو خوب دل لگا کر پڑھ۔ یہ سمجھ لے کہ یہ تیری ماں کی خواہش ہے۔'' خیر دین چارپائی پر لیٹ گیا تھا۔ ''تو یہ کورس مکمل کرنے کے بعد وکیل بن جائے گا نا؟''

''بابا! آپ جب بھی بات کرتے ہیں میرے وکیل بننے کی بات کیوں کرتے ہیں؟ حالانکہ میں تو وکالت کا کورس کافی عرصہ پہلے کر چکا ہوں۔ اب تو ایم اے انگلش کر رہا ہوں۔ خیر آپ کو کیا پتہ کہ یہ ایم اے اور پھر انگلش کیا ہوتا ہے؟ یہ سب پڑھے لکھے لوگوں کے کام ہیں۔'' رضا نے ایک پیالی باپ کو پکڑاتے ہوئے خوشگوار موڈ میں کہا۔

''واہ پتر جی واہ! اوئے آج خلاف توقع تیرا موڈ بہت خوشگوار ہے اور یہ تو ہر وقت کیا مجھے ان پڑھ سمجھ کر انگلش کی باتیں کرتا رہتا ہے' میں تیرا باپ ہوں اور تجھ سے زیادہ پڑھا لکھا ہوں۔ یہ ایم اے شیم اے تو میں جوانی میں ایویں ای کر لیا کرتا تھا۔ تو میرے ساتھ انگریزی بول کر دیکھ لے۔'' خیر دین بھی بیٹے کے ساتھ مذاق میں خوشگوار موڈ بنا کر باتیں کرنے لگا تھا۔

''ابا جی! اگر آپ پڑھے لکھے ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا!''

''اچھا! اب اداس نہ ہو۔ جب تو اداس ہوتا ہے تو مجھے تیری ماں یاد آ جاتی ہے۔ کیا دل کش شخصیت تھی اس کی۔ موٹی موٹی آنکھیں' چٹا گورا رنگ' لمبا قد بالکل تیرے جیسا۔ صراحی دار گردن۔ جب باتیں کرتی تو لگتا کہ پھول جھڑ رہے ہیں۔'' خیر دین چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے ہوئے ایسے باتیں کر رہا تھا جیسے اس کی مرحومہ بیوی اس کے سامنے

کھڑی ہو۔

''بس بس بس' ابا جی! آپ تو بہت دور نکل گئے۔ ایک بات تو بتائیں ابا جی! اگر اماں اتنی ہی خوبصورت تھیں تو آپ سے شادی کیسے ہوگئی جب کہ آپ تو......'' رضا نے باپ کا موڈ بدلنے کے لیے بات بنائی۔

''اوئے ماں کے لاڈلے! تُو نے تو ماں کو دیکھا بھی نہیں اور اُس کی حمایت کر رہا ہے اور میں کون سا کم خوبصورت ہوں۔ اب بھی جوان ہوں اور جوانوں سے بھی تیز دوڑ سکتا ہوں۔ نہیں یقین تو شرط لگا کر دیکھ لے۔'' خیردین کا موڈ بھی خوشگوار ہو گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے والا خیردین بدل گیا تھا۔ باپ کو خوش دیکھ کر رضا کے چہرے پر بھی دردناک مسکان آ گئی کیونکہ اس نے واقعی اپنی ماں کو نہ دیکھا تھا۔ وہ رضا کی پیدائش کے تین دن بعد ہی فوت ہوگئی تھی۔

☆..........☆

بعض اوقات مضبوط اور طاقت ور انسان بھی بہت مجبور ہو جاتا ہے۔ کوئی نہ کوئی مجبوری ایسی آ پڑتی ہے کہ انسان کو بے بس کر دیتی ہے۔ وقت کو اپنی مٹھی میں بند کر لینے کے دعوے کرنے والا آکاش بھی اس وقت ایک مجبور اور بے بس ولاچار انسان کی طرح سکندر ہوٹل کے باہر کھڑا تھا اور آنے والے وقت کے ساتھ ساتھ آنے والوں کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ اسی اثناء میں کالے رنگ کی گاڑی اس کے پاس آ کر رُکی اور ایک ٹھگنے سے قد کا آدمی باہر نکلا۔ اُس نے آتے ہی آکاش کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ آکاش چپ چاپ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس سیٹ پر پہلے ہی ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ درمیان میں آکاش اور ساتھ میں وہ ٹھگنے قد والا۔ ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر کوئی لڑکی براجمان تھی' جو کہ چہرے مہرے سے سخت مزاج کی لگتی تھی۔ اُس نے پیچھے مڑ کر کھردری آواز میں لمبے قد والے سے کہا:

''ورما صاحب! آکاش بابو کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دو اور آکاش بابو! میں امید کرتی ہوں کہ آپ ہماری اس مجبوری کو سمجھتے ہوئے ہمیں زبردستی پر مجبور نہ کریں گے۔''

آکاش خاموش رہا۔ آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی گئی اور ''چلو ڈرائیور'' کی آواز کے ساتھ ہی گاڑی چل پڑی۔ گاڑی میں اونچی آواز پر انگلش میوزک چلا دیا گیا تھا۔

آکاش سمجھتا تھا کہ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ اسے باہر کی آوازوں سے کہیں راستوں کا علم نہ ہو جائے یا پھر کوئی اور منطق ہوگی۔ گاڑی تھوڑی دیر سیدھی جانے کے بعد دائیں مڑ گئی اور پھر اسی طرح آدھ گھنٹے کی مُسافت طے کرنے کے بعد آکاش کو لگا جیسے گاڑی کسی تہہ خانہ میں اُتر رہی ہو۔ کچھ دیر بعد گاڑی رُک گئی۔ آکاش کی آنکھوں سے پٹی ہٹائی گئی تو تیز روشنی میں کچھ دیر تو نہ کچھ نظر آیا اور نہ سمجھ آیا۔ گاڑی سے باہر آنے کے اشارے پر وہ باہر نکلا اور اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ ایک بہت بڑا ہال تھا' جو تیز روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ تنکا بھی زمین پر پڑا ہوتا تو نظر آ جاتا۔ ایک لڑکی اور دو مردوں کے علاوہ آکاش تھا۔ کوئی اور ذی روح موجود نہ تھا۔ آکاش کو ورما نے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ ایک بہت بڑے ٹیبل کے گرد بیس کرسیاں رکھی گئی تھیں اور سامنے والی کرسی بڑی تھی جو کہ یقیناً ان غنڈوں کے چیئرمین کی ہوگی۔ ''میرے خیال میں یہ کوئی میٹنگ ہال ہے۔'' آکاش نے لڑکی سے پوچھا:

''یہاں سوال ہم کرتے ہیں اور جواب پاکستانی دیتے ہیں۔'' لڑکی نے ناک چڑھا کر کہا۔

''تو کیا تم پاکستانی نہیں ہو؟'' یہ آکاش کے لیے بہت بڑا دھماکہ تھا۔ وہ یقیناً غیر ملکی تھے اور اس ملک میں کسی خاص مقصد کے لیے آئے تھے۔ وہ مقصد کیا تھا یہ ابھی کچھ دیر بعد پتہ چلنے والا تھا۔ آکاش کرسی پر بیٹھ چکا تھا اور اردگرد کی کرسیوں پر لڑکی' ورما اور ٹھگنا بیٹھ گئے تھے۔ اچانک ہال میں ایک آواز گونجی۔

''مس سونیا! کیا آکاش صاحب آ گئے ہیں؟'' یہ بھاری بھرکم مردانہ آواز تھی لیکن اس نے آکاش کے لیے صاحب کا لفظ استعمال کیا تھا' یقیناً یہ کوئی بڑی گیم ہے۔

''جی سر! آپ بھی تشریف لے آئیں۔ آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔'' لڑکی نے کرسی سے اُٹھ کر کہا۔

لڑکی کے نین نقش خوبصورت تھے لیکن رنگ سانولا تھا۔ لمبا قد اور جینز شرٹ میں ملبوس گریس فُل لگتی تھی۔

کچھ لمحات کے بعد ہال کا درمیانی دروازہ کھلا۔ اس میں سے لمبا تڑنگا نوجوان داخل ہوا۔ اُس کے پیچھے پیچھے آٹھ نوجوان تھے جن میں سے چار کے ہاتھوں میں گنیں

تھیں اور چار آدمی بہترین تراش کے سوٹوں میں ملبوس تھے۔ وہ چاروں آگے آنے والے کے بعد کرسیوں پر بیٹھ گئے اور چاروں گن مین ہال کے چاروں کونوں میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ لمبا تڑنگا نوجوان بڑی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ ورما، سونیا اور شکنا نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا تھا۔ جبکہ آکاش بدستور اپنی جگہ پر بیٹھا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔

''ہاں تو مسٹر آکاش! آپ کو بہت زحمت اُٹھانا پڑی جس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔'' بڑی کرسی والے نے کہا ''سب سے پہلے میں تمہیں اپنا اور اپنے ان ساتھیوں کا تعارف کروا دوں۔ پھر آپ سے کام کی باتیں ہوں گی۔'' وہ کبھی آکاش کو آپ اور کبھی تم کہہ رہا تھا۔

''میرا نام شفیع خان ہے۔ تمہارے ساتھ کرسی پر مسٹر وکرم پاٹیل، مسٹر انیل شرما، مسٹر چوپڑہ اور مسٹر منگل رام بیٹھے ہیں۔ تمہارے سامنے مِس سونیا، مسٹر ورما اور مسٹر جونیئر تشریف رکھتے ہیں۔ ہماری حرکتوں اور کام سے تمہیں اندازہ تو ہو گیا ہوگا کہ ہم کوئی اچھے لوگ نہیں ہیں۔ میں اور مسٹر جونیئر پاکستانی ہیں اور باقی تمام لوگ غیر ملکی ہیں۔ ان لوگوں کے علاوہ بھی کافی سارے لوگ ہیں جو اس ملک میں مشن مکمل کرنے آئے ہیں۔ ہر آدمی کو علیحدہ مشن سونپا گیا ہے۔ کس نے کیا کرنا ہے، کیسے کرنا ہے، یہ تمام ہدایات اوپر سے ملتی ہیں اس کھیل میں بہت سارا روپیہ ملتا ہے۔ اتنا کہ جتنا تم دس ہزار وارداتوں کے بعد کماتے ہو گے، اُتنا تمہیں ایک مشن مکمل کرنے کے بعد ملا کرے گا۔ اس ملک میں مجھے کافی کام سونپے گئے ہیں۔ تمام آپریشنز کا میں انچارج ہوں۔ کس جگہ کون سا کام کس آدمی کے سپرد کرنا ہے، یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ مسلسل بولے جا رہا تھا اور آکاش توجہ سے سُن رہا تھا اور ذہن دوڑا رہا تھا کہ یہ اُس کے ملک میں لازماً کوئی بہت گھناؤنا مشن لے کر آئے ہیں۔ اور ملک کو شدید خطرہ ہے۔ کچھ بھی ہو وہ ان لوگوں کا آلۂ کار نہ بنے گا۔ چاہے کتنی بڑی رقم کی آفر ہی کیوں نہ ہو۔ وہ چور تھا، لٹیرا، ڈاکو یا کوئی بدمعاش تھا لیکن اپنے وطن کا بدخواہ نہ تھا۔

''مسٹر آکاش! ہم جس آدمی کو اپنے گروپ کے لیے چنتے ہیں، اُس کے بارے میں مکمل معلومات رکھتے ہیں، جیسے تمہیں چُنا گیا ہے اور تمہارے بارے میں مکمل معلومات جمع کرنے کے بعد ہم نے پولیس کا ڈھونگ رچا کر تمہارے ساتھیوں کو گھروں سے باہر نکلوایا اور ان کا پیچھا کرتے ہوئے انہیں قابو کر لیا۔

مجھے علم ہے کہ اس شہر میں تم کافی مضبوط ہو، پولیس اور قانونی ادارے تمہارا کہنا مانتے ہیں۔ اوپر والوں نے بھی تمہارا انتخاب خواہ مخواہ نہیں کیا ہے، کیونکہ انہیں علم ہے کہ تم بغیر والدین کے ایک بیوہ عورت کے پاس زندگی گزار رہے ہو اور چھوٹی موٹی وارداتیں کر کے اپنا اور ساتھیوں کا پیٹ پالتے ہو۔ ہم تمہیں ایک کام کے عوض اتنا دیں گے کہ تم دس سالوں میں بھی اُتنا نہ کما سکو گے۔''

''مسٹر شفیع خان! تم بات بہت لمبی کرتے ہو اور لمبی باتیں کرنے والا شخص مجھے زہر لگتا ہے۔'' آکاش نے تلخ لہجے میں اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی ختم کر دی تھی۔ ''سب سے پہلے میرے ساتھیوں کو رہا کرو، پھر کوئی کام کی بات کریں گے۔'' آکاش نے گن مینوں کی پرواہ کیے بغیر کہا۔

''تمہارے یہاں پہنچنے کے بعد تمہارے تمام ساتھی بحفاظت گھروں کو لوٹ گئے ہیں.....'' شفیع خان نے آکاش کو آگاہ کیا۔ ''تو میرے خیال میں کام کی بات ہونی چاہیے۔''

''بولو۔'' آکاش نے مختصر جواب دیا۔ ''لیکن پہلے میں اپنے دوستوں کے بارے میں تسلی کروں گا۔''

''ضرور کرو۔ یہ تمہارا حق ہے۔ مِس سونیا! مسٹر آکاش کو موبائیل فون دو۔''

سونیا نے اپنا فون دینا چاہا لیکن آکاش نے کوٹ کی جیب سے اپنا سیٹ نکال کر مانی کا نمبر ڈائیل کیا۔ دوسری طرف سے لالہ نے فون سنا۔

''لالہ! تم لوگ کہاں ہو اور یہ مانی نے فون کیوں نہیں سُنا؟'' آکاش ابھی تک مانی کی طرف سے پریشان تھا۔

''آکاش بھیا! ہم گھروں میں پہنچ گئے ہیں۔ ان ظالم لوگوں نے ہمیں بہت مارا ہے۔ مانی کی ٹانگ توڑ دی ہے، اُسے ہسپتال لے کر گئے ہیں۔'' دوسری طرف سے لالہ نے جو خبر دی وہ بم بن کر آکاش کے دل پر گری تھی۔ اُس نے فون بند کر دیا اور برق رفتاری سے اپنی کرسی سے اٹھا اور جا کر شفیع خان کی ناک پر زوردار گھونسہ رسید کر دیا۔ وہ تو فوراً ہی ناک پکڑ کر بیٹھ گیا جبکہ چاروں گن مین دوڑتے ہوئے آئے اور آکاش کو پکڑنا چاہا لیکن آکاش تو بجلی بنا ہوا تھا۔ اس نے آوارہ گردی کے ساتھ ساتھ بلیک بیلٹ بھی حاصل کی ہوئی تھی جو آج اس کے کام آ رہی تھی۔

وہ کراٹے کے وار کر کے چاروں کو ڈھیر کر دیتا لیکن سونیا نے پسٹل نکال کر اُس کی کنپٹی پر لگا دیا۔

''بس آکاش صاحب بس! تمہاری باری ختم' اب ہماری باری ہے۔'' اُس کی آواز میں زہر بھرا تھا اور پھر آکاش کو یاد نہیں کہ کس کس نے کیا کیا مارا کیونکہ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

''اِسے یہیں باندھ دو اور کھانے پینے کی اشیاء دیتے رہو۔ اس سے کل بات ہوگی۔ حرامزادے نے میری ناک توڑ دی ہے۔'' شفیع خان نے اپنی ناک پر ہاتھ رکھ کر بے ہوش پڑے ہوئے آکاش کو ٹھوکر ماری۔

''باس! ویسے یہ آدمی ہمارے بڑے کام کا ہے۔ ہمیں ایسے ہی پھرتیلے اور غصیلے نوجوان کی ضرورت تھی۔ یہ کام یہی شخص کر سکتا ہے۔'' سونیا بولی۔ اتنی دیر میں وِکرم اور چوپڑا نے آکاش کو اچھی طرح باندھ دیا تھا۔

''شفیع خان! اگر اس نے کام سے انکار کر دیا تو؟'' منگل رام نے بھی اپنی زبان کھولی تھی۔

''یہ کوئی بچوں کے کھیل تھوڑی ہیں۔ اوپر والے کسی غلط آدمی کو نہیں چنتے۔ یقیناً اس میں کوئی تو گُن ہوگا جو آکاش کا انتخاب کیا گیا ہے۔'' انیل شرما نے اپنی دانست میں عقل مندی کی بات کی تھی۔ ''چلو اسے یہیں پڑا رہنے دو' میرے ہاتھ میں اس کی خوبصورت کمزوری ہے۔ کل اس سے بات کریں گے۔'' شفیع خان' درمیانی دروازے کی طرف چل پڑا اور باقی ساتھی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے گئے جبکہ آکاش کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور وہ ٹھنڈے فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔ آکاش نے ان کی اچھی ٹھکائی کر دی تھی لیکن اسلحہ کے سامنے بے بس ہو گیا تھا۔ شفیع خان اور چاروں افراد ایک گاڑی میں بیٹھ کر کہیں چلے گئے جبکہ چاروں گن مین ہڈی پسلیوں کو ٹکور کرنے کے لیے ایک کمرے میں چلے گئے اور سونیا موبائل پر کسی سے بات کرنے لگی۔ جونیئر کرسی پر ٹانگیں پسار کر بیٹھ گیا۔

☆..............☆

خیر دین حسبِ معمول ریلوے اسٹیشن پر بھیک مانگنے میں مصروف تھا۔ وہ ہر آنے جانے والے کے سامنے کشکول کرتا اور ''اللہ بھلا کرے'' کی صدا لگاتا اور لوگ حسبِ توفیق روپیہ دو روپے یا پانچ روپے اُس کے کشکول میں ڈال دیتے تھے۔ وہ بڑے نوٹ فوراً جیب میں ڈال لیتا اور پھر نئے سرے سے کشکول خالی ہو جاتا تو وہ پھر آواز لگاتا۔

''اے صاحب' اللہ کے نام پر! خدا تمہارا بھلا کرے گا۔ کچھ تو دو صاحب...... بیگم صاحبہ' اللہ آپ کی مراد پوری کرے گا۔ اے بابو خدا تمہیں کامیاب کرے گا۔'' وہ لوگوں کو طرح طرح کی دعائیں دیتا اور لوگ اس کی درد بھری آواز سن کر اس سے متاثر ہو جاتے اور کچھ نہ کچھ اس کے کاسہ میں ڈال دیتے تھے اور اس طرح اس کی دیہاڑی چار پانچ سو روپے لگ جاتی تھی۔ ریلوے اسٹیشن پر ظاہر ہے خاصا رش ہوتا ہے۔ ہزاروں مسافر آتے اور جاتے ہیں۔ وہ روزانہ طرح طرح کے لوگوں سے ملتا تھا۔ ہر روز نئے چہرے دیکھتا تھا لیکن اسے چہروں سے کیا لینا دینا وہ تو اپنے روزگار سے مطلب رکھتا تھا۔ لیکن آج ایک چہرہ ایسا بھی مل گیا تھا جس نے خیر دین کو چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی آواز نے خیر دین کو اس کی مکمل شخصیت کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بالکل عام دنوں کی طرح اس نے گاڑی سے اترنے والی عورت کی طرف اپنا کاسہ بڑھا کر اپنا فقیرانہ سوال دہرایا تو اس نے کہا ''معاف کرنا بابا جی۔'' یہ الفاظ خیر دین نے کئی بار کئی سخیوں سے سُنے تھے' لیکن اس عورت کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ نے خیر دین کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ ''نہ'' کرنے والی عورت کی طرف ضرور دیکھے اور دیکھنے کے بعد خیر دین کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ عورت پاس سے گزری تو جانی پہچانی خوشبو خیر دین کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ وہ عورت کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ چلتی ہوئی ایک شاندار گاڑی میں بیٹھ گئی جس کے آس پاس دو پولیس والے کھڑے تھے۔ خیر دین چلتا ہوا گاڑی کے پاس پہنچنا چاہتا تھا لیکن گاڑی جا چکی تھی اور اس پر کسی ایم این اے کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ گاڑی کا نمبر بھی مخصوص ہندسوں پر مشتمل تھا۔ خیر دین بت بنا کھڑا اس طرف دیکھ رہا تھا جدھر گاڑی گئی تھی۔ گاڑی کافی دیر کی جا چکی تھی لیکن خیر دین ابھی تک ہوش میں نہ آیا تھا۔ لوگ اس کے کاسہ میں سکے ڈال رہے تھے۔ دفعتاً کسی نے خیر دین کا کندھا پکڑ کر جھنجھوڑا۔ خیر دین نے مڑ کر دیکھا تو اس کا ساتھی فقیر تھا جو کافی دیر سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے تجھے خیرو! تو نے پہلے تو کبھی کسی عورت کو ایسے نہیں دیکھا۔ ویسے بہت دلکش شخصیت تھی۔ تمہیں معلوم ہے یہ ایم این اے راجہ سلیم کی بیوی ہے۔ لگتا ہے کہیں پرستان سے بیاہ کر لایا ہے۔" وہ بول رہا تھا اور خیر دین سوچ رہا تھا کہ وہ واقعی پرستان کی لگتی تھی۔ "نہیں نہیں وہ لگتی نہیں بلکہ ہے ہی پرستان کی رہنے والی۔ راجہ سلیم ایم این اے کی کوٹھی کہاں ہے؟" اس نے دوسرے فقیر سے پوچھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ خیرو حیرت سے اُسے دیکھنے لگا۔

"ابے سالے! میں نے کوئی عجیب بات کی ہے جو تو بتیسی نکال رہا ہے۔" خیر دین نے اُس کی پشت پر ایک دھپ رسید کی۔

"اوئے بھولے بادشاہ! کیا راجہ سلیم جیسا جدی پشتی امیر آدمی اور پھر ایم این اے وہ بھی موجودہ حکومت میں ہو اور کسی کوٹھی میں رہے گا۔ پاگل آدمی ان کا محل ہے۔ محل۔ بہت بڑا۔ کبھی سپنے میں بھی نہ دیکھا ہوگا بلکہ تمہارے بڑوں نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا۔ ہاں میں تو اس لیے ہنس رہا ہوں کہ تُو فقیر ہے اور بادشاہوں کے متعلق کیوں تفتیش میں پڑ گیا ہے؟"

"نہیں کچھ نہیں۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کسی تشویش میں پڑنے کی۔" خیر دین جیسے جاگ گیا تھا' لیکن سوتے میں باتیں کرتا لگتا تھا۔ اب اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ بھیک مانگے۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ دھوپ میں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ یہ تجلی تھی۔

ہاں تجلی! وہی تجلی جو اس بازار کی کھڑکی میں کھڑی ہوتی تو بازار کی روشنیاں گل کر دی جاتی تھیں۔ اور تجلی کی روشنی سے بازار جگمگانے لگتا تھا۔ ہاں یہ وہی تجلی ہے' یہ وہی تجلی ہے! وہی تجلی جو کبھی میری تھی۔ خیر دین خود ہی بڑبڑا رہا تھا۔ میری تجلی' ملک رب نواز کی تجلی تھی یہ! جو آج راجہ سلیم کے گھر میں چراغاں کر رہی ہے۔ وہ کراچی سے لاہور کیسے پہنچ گئی؟ کیوں آئی وہ یہاں ...... کیسے؟" خیر دین اسی سوچ میں چلتا ہوا گھر جانیوالی بس میں سوار ہوا۔ اور کنڈیکٹر کے بار بار آواز دینے پر چونک کر اپنے گندی بستی کے سٹاپ پر اتر کر گھر کی طرف چل پڑا۔

☆..........☆

"ہیلو مسٹر احمد رضا!" ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکے نے احمد رضا کو مخاطب کر کے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا' تو رضا نے حیرانی سے اُسے دیکھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ کالج کے لان میں بیٹھا تازہ غزل لکھ رہا تھا۔ ایک پیریڈ فری تھا۔ وہ لڑکوں اور لڑکیوں سے بچتا ہوا اِدھر آ نکلا۔ پھر یہ نئی مصیبت کیا آ گئی۔ کون ہے یہ؟ رضا کے چہرے پر کچھ ناگواری سی جھلک رہی تھی' لیکن مروتاً وہ مسکرا رہا تھا۔ آنے والا اس کے پاس ہی گھاس پر بیٹھ گیا۔ وہ بلیو جینز اور بلیک کلر کی ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ درمیان میں مانگ نکالی ہوئی۔ سر پر اچھے خاصے بال تھے جو سلیقے سے سنوارے گئے تھے۔ گورا چٹا رنگ اور قد بھی اچھا تھا' لیکن رضا سے کم ہی تھا۔ رضا نے چند ہی لمحوں میں اس کا جائزہ لے لیا تھا۔

"میرا نام طماس ہے۔ میں آج ہی اس کالج میں انٹر ہوا ہوں۔ ہر کسی کی زبان پر تمہارا ہی نام ہے۔ میرا کوئی دوست نہیں ہے اور نہ ہی میں زیادہ دوست بنانے کے حق میں ہوں۔ مجھے چڑ سی ہوتی ہے جب بہت سارے لوگ جو ہاتھ ملانے والے ہوتے ہیں خود کو تمہارا دوست کہنا شروع کر دیتے ہیں اور جب اپنا الو سیدھا ہو جائے تو سلام دعا کے بغیر ہی 'رخصت ہو جاتے ہیں۔ میں ایک اچھا دوست بنانا چاہتا ہوں جو میری طرح ہو اور تمہاری طرح ہو۔" طماس بہت زیادہ بول رہا تھا اور رضا اُس کی باتیں سُن رہا تھا وہ پھر بولا:

"پورے کالج میں ایک ہی بات مشہور ہے کہ رضا کا کوئی دوست نہیں۔ یہ بات نہیں کہ تم اچھے آدمی نہیں ہو بلکہ یہ اچھی بات ہے کہ تم بُرے آدمی نہیں ہو اور اچھے بُرے دوستوں سے دور ہو۔ اگر برا نہ مانو تو میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ کیا مجھ سے دوستی کرو گے؟" یہ کہہ کر اس نے احمد رضا کی طرف ہاتھ بڑھایا' تو رضا نے دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولا: "مسٹر طماس! سب سے پہلے تو آپ کو اس کالج میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ بھی میری طرح پڑھنے ہی آئے ہوں گے۔ دوسری بات یہ کہ میں کوئی دوست نہیں بناتا' تو یہ میری عادت ہے۔ تیسری بات کہ میں آپ سے دوستی کر لوں' تو میں نے بحیثیت کالج فیلو آپ کا ہاتھ تھام لیا ہے' لیکن ہر ہاتھ ملانے والا دوست نہیں ہوتا۔" یہ کہہ کر اُس نے دھیرے سے طماس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ طماس زیرلب مسکرایا اور گویا ہوا۔

''رضا! میں ایک امیر باپ کا بیٹا ہوں۔ کئی ملازم میرے آگے پیچھے میری خدمت کے لیے بھاگ دوڑ کرتے رہتے ہیں۔ کئی لوگ میرا دوست بننے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ میرے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں ہے۔ میرے گھر میں خوشیاں رقص کرتی ہیں' لیکن میں تنہا ہوں۔ یہ نہیں کہ والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ نہیں یہ بات نہیں ہے۔ میری دو بہنیں ہیں۔ ایک کی شادی ہو چکی ہے اور ایک مجھ سے دو سال چھوٹی ہے اور ایم اے نفسیات کی طالبہ ہے۔ چھوٹی ہونے کے باوجود مجھ سے آگے نکل گئی ہے۔ خیر' میں اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے کسی دوست کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ ایسا دوست جو میرا بھائی بھی ہو' میرے دکھ درد بانٹ لے۔ میرے غم سمیٹ لے۔ پلیز میرے بھائی! اس پورے کالج میں میں سمجھتا ہوں کہ تم ہی سمجھ دار اور اچھے دوست بنو گے۔'' طماس تو رونے والا ہو گیا تھا۔

''اچھا طماس صاحب! آپ ابھی اس کالج میں ہی ہیں۔ آپ سے ملاقات ہوتی رہے گی اور ہو سکتا ہے کہ یہ ملاقاتیں دوستی میں بدل جائیں۔ بائے!'' یہ کہہ کر احمد رضا وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا اور طماس وہیں بیٹھا رہا۔ رضا نے کالج کنٹین سے چائے پی اور کلاس روم کی طرف چلا گیا۔ اپنے ساتھ والی سیٹ پر طماس کو بیٹھے دیکھ کر حیران ہوا کہ یہ تو کالج فیلو ہی نہیں بلکہ کلاس فیلو بھی ہے۔ طماس نے رضا کو دیکھ کر آنکھ ماری اور مسکرا دیا۔ رضا بھی مسکراتا ہوا اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ''چلو کچھ تو فاصلے کم ہوئے۔'' طماس بولا۔

''تم تو لڑکیوں کی طرح میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ تمہارے متعلق کچھ سوچنا پڑے گا۔'' احمد رضا بھی مسکرا دیا۔ اتنی دیر میں پروفیسر صاحب اندر داخل ہوئے۔ طالب علموں نے کھڑے ہو کر اُن کا استقبال کیا اور پروفیسر کے Sit Down کہنے پر تمام لوگ بیٹھ گئے۔

''سب سے پہلے تو میں آپ سے اپنا تعارف کروا دوں۔ میرا نام عطاء اللہ ہے اور میں..........''

''تو پھر کوئی گانا سنائیے نا..........'' پروفیسر کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کسی نے پچھلی نشستوں سے آواز لگائی تو کلاس زعفران زار بن گئی۔ پروفیسر صاحب بھی مسکرا پڑے اور بولے۔

''بچہ لوگ! یہ کالج ہے اور ایم اے انگلش کی کلاس کا پہلا دن ہے۔ یہاں کون سی فوتگی ہوئی ہے جو میں آپ کو گانا سناؤں۔ ویسے بھی میں لاہور سے ہوں۔ عیسیٰ خیل سے نہیں۔ وہ تو لیجنڈ ہیں..........''

''آپ سے اچھا تعلق رہے گا۔ آپ باتیں اچھی کرتے ہیں' آپ کو تو سٹیج ایکٹر ہونا چاہیے تھا۔'' ایک بار پھر ان کی بات پوری نہ ہونے دی تھی۔

''میں آپ کو انگلش پڑھایا کروں گا اور حیرانی کی بات ہے کہ مجھے انگلش آتی بھی ہے۔'' وہ بھی مزاحیہ موڈ میں تھے۔ مجھے علم ہے کہ آپ لوگ مجھ سے تقریباً دو دو یا چار چار سال چھوٹے ہوں گے۔ اگر میں بڑا بن جاؤں' ٹیچر بن جاؤں اور آپ کو شاگرد سمجھوں تو شاید یہ کلاس دو تین دنوں سے زیادہ نہ چل پائے گی' لیکن ہم یہاں دوستانہ ماحول میں پڑھیں گے تاکہ یہ دو سال اچھے انداز میں گزر سکیں۔ اب آپ کی طبیعت میں ٹھہراؤ آ گیا ہو تو بات آگے بڑھائی جائے؟'' ''یس سر! آگے آ کر بات آگے بڑھائیں' پیچھے سے آپ کا والیم کم سنائی دیتا ہے۔'' پھر کسی نے فقرہ چست کیا تھا۔ رضا کے علاوہ تمام کلاس والے مسکرا دیے تھے۔

''میرے والیم کا قصور نہیں ہے بلکہ تم کانوں میں لگانے والی ٹونٹی گھر بھول آئے ہو۔'' اچھا جواب تھا۔

''آپ لوگ جو بی اے کلیئر کرنے کے بعد اس کلاس میں آئے ہیں' اپنا اپنا تعارف کروائیں تاکہ جو طالب علم یا طالبات اس کلاس میں نئے آئے ہیں اُنہیں آپ سے واقفیت ہو سکے۔ سب سے پہلے احمد رضا نے اپنا تعارف کروایا اس کے بعد تمام پرانے لڑکوں اور لڑکیوں نے اپنا اپنا تعارف کروانا شروع کر دیا۔

''ہاں' تو اب میں چند نئے لڑکوں اور لڑکیوں کا آپ سے تعارف کروا دوں۔ میں جس جس کا نام پکاروں وہ اپنی نشست پر کھڑا ہو جائے۔'' پروفیسر صاحب بولے۔

''ماریہ اسلم۔'' کمرے کے کونے سے ایک لڑکی کھڑی ہوئی جو کہ خوبصورت تھی اور سمارٹ بھی۔ سبھی لڑکوں نے مڑ کر دیکھا اور واوہ...... کی آواز نکالی۔

''ان کا تعلق متوسط طبقے سے ہے اور کافی ذہین ہیں۔ ان کے والد کریانہ کا کام کرتے ہیں اور اب میں زحمت دوں گا مسٹر علیم ڈار کو۔'' رضا کی پچھلی نشست سے ایک

لڑکا کھڑا ہوا۔ ''یہ صاحب اس کالج کے پرنسپل صاحب کے صاحبزادے ہیں اور ظاہر ہے لائق ہوں گے اور آخری سٹوڈنٹ' میرا مطلب ہے کہ جن کا تعارف باقی ہے' احمد طماس!'' رضا کے ساتھ بیٹھا ہوا احمد طماس کھڑا ہو گیا۔

''امیر کبیر باپ کے لاڈلے بیٹے ہونے کے باوجود بھی یہ کافی Intelligent ہیں۔ اپنی دولت کو کبھی اپنی شخصیت پر اثر انداز نہیں ہونے دیا۔ میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں' کیونکہ یہ ہماری کالونی کے اچھے لڑکوں میں شمار ہوتے ہیں' اور بڑی بات یہ کہ یہ ایم این اے راجہ سلیم کے صاحبزادے ہیں' لیکن کبھی باپ کی شخصیت کا سہارا لے کر اپنا نام' اپنا کام اور اپنا تعارف نہیں کروایا۔ یہ ان کی سادگی ہے اور بڑا پن بھی ہے۔ او کے! میرے خیال میں تم سب ایک دوسرے کو ناموں کی حد تک جان چکے ہو گے۔ باقی آہستہ آہستہ مزید جان جاؤ گے۔ اب ہم پڑھنا شروع کرتے ہیں۔'' اور پھر ساری کلاس خاموشی سے پروفیسر صاحب کا لیکچر سننے لگی۔

☆..........☆

آکاش کو ہوش آیا تو بدستور اُس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ کمرے کے تینوں دروازے بند تھے۔ اس کا سر چکرا رہا تھا' لیکن وہ مضبوط اعضاء اور قوی اعصاب کا مالک تھا۔ ہمت جمع کر کے اٹھا اور سب سے پہلے تو اس نے خود کو کھولنے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھ کر کوئی چیز تلاش کرنے کی کوشش کی' لیکن کوئی بھی چیز نظر نہ آئی۔ اس نے ہال کی چھت پر نگاہ دوڑائی تو اس کے ذہن نے فوراً کام کرنا شروع کر دیا' کیونکہ کافی اونچائی پر ایک روشن دان تھا جس سے ہلکی ہلکی دھوپ اندر آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ساری رات بے ہوش رہا ہے۔ اس نے دیوار کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے تینوں دروازوں کو باری باری غور سے دیکھا تو اس پر انکشاف ہوا کہ دو دروازے نقلی تھے اور درمیان والا دروازہ ہی اصلی تھا۔ نقلی سے مراد کہ دیوار پر دروازے کی چوکھٹ بنا کر لگائی گئی تھی اور ظاہر ہوتا تھا کہ دروازے ہیں۔ یعنی اس تہہ خانہ میں آنے اور جانے کا اکلوتا دروازہ تھا جو یقیناً بند ہونا چاہیے تھا اور بند بھی تھا۔ اُسے باہر نکلنے کے لیے روشن دان تک پہنچنا تھا' لیکن ہاتھ پاؤں کس کر باندھے گئے تھے۔ اُس نے بہت کوشش کی' لیکن نتیجہ صفر رہا' وہ اسی کشمکش میں مصروف تھا کہ واحد دروازہ کھلا اور

جونیئر اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ایک مرد ہاتھ میں ایک ٹرے اٹھائے ہوئے تھا' جس پر ناشتہ کا سامان تھا۔ انڈے' سلائس اور چائے وغیرہ۔ اس نے ٹیبل پر ٹرے رکھی اور جونیئر کے اشارے پر واپس چلا گیا۔ جونیئر نے آگے بڑھ کر آکاش کا ایک ہاتھ کھول کر اُسے کھانے کے لیے کہا جبکہ دوسرا ہاتھ دونوں ٹانگوں کے ساتھ ہی بندھا رہنے دیا۔ آکاش ٹیڑھے میڑھے انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا اور سامنے والی کرسی پر جونیئر ہاتھ میں پسٹل لے کر بیٹھ گیا۔

''جونیئر بھائی! اگر آپ اجازت دیں تو ناشتہ شروع کروں۔'' آکاش نے پوچھا اور سوچا کہ اس حرامزادے سے کچھ نہ کچھ اگلوایا جا سکتا ہے۔ جونیئر اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا اور پسٹل بھی کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔

''ہاں شروع کرو اور باتیں مت کرو ورنہ تمہیں ابھی شوٹ کر دوں گا۔'' جونیئر کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا۔ ''اچھا بھائی! ناراض کیوں ہوتے ہو' تمہاری مہربانی ہے کہ بھوکے نہیں مروایا۔ ناشتہ ہی دے دیا شکریہ۔ جونیئر بھائی بہت بہت شکریہ!'' آکاش نے ایک کھلے ہاتھ سے سلام کیا اور کوٹ کی جیب کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ اُسے یاد آیا تھا کہ اس نے گھر سے نکلتے وقت پسٹل جیب میں رکھا تھا' لیکن حسب توقع جیب خالی تھی اور جونیئر نے اپنے قد سے بڑا قہقہہ لگایا۔ آکاش نے زہریلے انداز سے اس کی طرف دیکھ کر ناشتہ شروع کر دیا۔

''بھولے بھالے آکاش بھیا! آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ انٹرنیشنل لیول کی تنظیم ہو یا گروپ ہو' وہ بے ہوش آدمی کی تلاشی نہ لیں تو لعنت ہے ان کی تنظیم سازی پر اور تربیت پر۔'' جونیئر نے گویا اُسے آگاہ کیا تھا کہ وہ اس کی تلاشی لے چکے ہیں۔

''بات یہ ہے کہ مجھے سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی اسی لیے جیب ٹٹول رہا تھا۔'' آکاش نے بات بدلی اور چائے پینا شروع کی۔

ناشتہ ختم ہو گیا تو جونیئر نے ٹیبل کے نیچے لگا ہوا بٹن دبایا۔ وہی آدمی اندر آیا اور برتن سمیٹ کر جانے لگا تو آکاش چونک سا گیا۔ اس نے اس آدمی کو کہیں دیکھا تھا لیکن کہاں دیکھا تھا یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت جونیئر کی موجودگی میں اس نے دماغ پر زور دینا مناسب نہ سمجھا۔ جونیئر نے اٹھ کر آکاش کا ہاتھ باندھنا چاہا۔ اس نے جیب میں

ہاتھ ڈال کر ایک کاغذ نکالا جو کہ تہہ کیا ہوا تھا اور آکاش ذہنی اور جسمانی طور پر فریش ہو چکا تھا۔ اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ جونیئر کو دبوچ لے گا اور ظاہر ہے جونیئر ہال میں موجود ہے تو دروازہ بھی کھلا ہوگا' لیکن جونیئر نے آکاش کو منہ پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا' جس کی تہہ نہیں کھلی تھی اور اوپر لکھا ہوا تھا۔ "میں دوست ہوں' میرے جانے کے بعد اسے پڑھنا' جونیئر!" آکاش کو حیرانی کی حالت میں چھوڑ کر دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔ آکاش نے حیرت کے سمندر سے نکل کر کاغذ کو کھولنا شروع کیا اور سوچتا بھی رہا کہ جونیئر کون ہے اور اُسے کیا مجبوری ہے جو اس نے آکاش کو یعنی تنظیم کے دشمن کو دوست کہا تھا۔ کاغذ کھول کر پڑھنا شروع کیا تو آکاش کی کبھی حیرت اور کبھی غصہ سے رگیں پھول گئیں۔ تحریر ہی ایسی تھی' وہ تحریر پڑھ کر پاگل ہو گیا تھا۔ اس نے جونیئر کی عظمت کو سلام کیا۔ تحریر سے تمام حالات آشکار ہو گئے تھے جو اُس کے ملک میں پیدا ہونے والے تھے۔ اس کے ملک کو خدانخواستہ نیست و نابود کرنے کے ارادے سے آئے ہوئے دشمن کی بہت بڑی پلاننگ تھی۔ وہ تحریر کیا تھی' ایٹم بم تھا جو آکاش پر گرا تھا۔ وہ چور' ڈاکو یا لٹیرا تھا' لیکن اپنے ملک کا خیر خواہ بھی تھا۔ اس نے سن رکھا تھا اور پڑھا بھی تھا کہ بہت سی قربانیوں کے بعد یہ ملک حاصل کیا گیا ہے۔ سکھوں اور ہندوؤں نے کتنی مسلمان بہوؤں' بیٹیوں' ماؤں اور بہنوں کی عزتیں پامال کی تھیں۔ ان کی عصمتوں سے کھیلا تھا۔ کئی بار چادر اور چار دیواری کا تقدس پامال کرتے ہوئے اس ملک کی راہ میں رکاوٹ بننا چاہا تھا' لیکن اللہ کی رحمت سے اور حضور ﷺ کے صدقہ سے یہ ملک ستائیسویں رمضان کی شب معرض وجود میں آ ہی گیا اور 14 اگست 1947ء کے بعد سے اب تک قربانیاں ہی دیتا آیا تھا۔ اس کی ترقی کی راہ میں ہر دشمن ملک نے دیوار کھڑی کی' لیکن یہ آگے بڑھتا گیا اور دنیا کے نقشے پر ایک مضبوط ملک بن کر ابھرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کی صفوں میں میر جعفر جیسے ہزاروں غداروں نے اسے دن رات لوٹا کھسوٹا نوچا اور جی بھر کر موج مستی کی۔ اس ملک کو اپنے اشاروں پر ناچنے پر مجبور کیا۔ کبھی کسی سے اس کا سودا کر دیا اور کبھی کسی سے سودا کر دیا' لیکن کلمہ طیبہ کے نام پر حاصل کیا گیا یہ ملک ہر بار اللہ کی رحمت سے محفوظ رہا تھا۔ اس ملک کی حکمرانی کے لیے جو شخص بھی کرسی پر بیٹھا بس اپنی ہی سوچی' عوام کے لیے کچھ نہ

کیا۔ دراصل عوام آج بھی بہتری کے خواہاں ہیں اور امید کرتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی فرشتہ آئے گا جو اس ملک سے غداروں کا صفایا کرے گا۔ عوام اور ملک سے انصاف کرے گا۔ گزشتہ چھپن برس اسی آس میں گزر گئے ہیں۔ جب بھی کسی دشمن ملک یا دشمن تنظیم نے اس مملکت خداداد میں افراتفری پھیلانے کی کوشش کی تو کسی نہ کسی جونیئر اور کسی نہ کسی آکاش کا ضمیر جاگ اٹھا اور دشمنوں کو منہ کی کھانی پڑی اور ناکام و نامراد ہو کر راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔ آکاش کا ضمیر جاگ گیا۔ وہ تحریر اس کے سامنے تھی اور اُسے جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا۔ وہ تحریر یہ تھی:

"آکاش بھیا! یہ لوگ ہمسایہ ملک کی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے پاکستان میں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار' اسلحہ اور بارود چھپا رکھا ہے۔ یہ لوگ پبلک مقامات پر بم دھماکے کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے بہت سے سیاستدان ان لوگوں کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں اور اعلیٰ سطح پر پولیس بھی شامل ہے۔ یہاں سے فوراً نکل کر ان لوگوں کو روکو۔ اگر زندگی رہی تو میں اور میرا دوسرا ساتھی آپ سے ضرور ملیں گے۔ میں خود ہی آپ سے رابطہ کروں گا۔ جونیئر۔"

آکاش نے خط پڑھتے ہی ہاتھ پاؤں کھول لیے تھے۔ اس نے جلدی سے ٹیبل گھسیٹ کر دیوار کے ساتھ لگائی اور اس پر اوپر تلے پانچ چھ کرسیاں رکھ کر اندازہ کیا کہ وہ باآسانی روشن دان تک پہنچ سکتا ہے۔ اس نے ٹیبل سے نیچے اُتر کر اکلوتے دروازے کی اندر سے کنڈی لگا کر باقی کرسیاں دروازے کے سامنے لگا دیں تاکہ وہ لوگ فوراً اندر داخل نہ ہو سکیں۔ اس نے ٹیبل پر چڑھ کر کرسیوں پر پاؤں رکھا اور روشن دان پر پہنچا تو قسمت مہربان تھی کیونکہ وہاں کوئی گرل یا جالی نہ تھی بلکہ عام سا ہول بنا ہوا تھا' لیکن آکاش کا جسم موٹا تھا یعنی اس سے پھنس کر گزرنا تھا۔ آکاش نے ہول سے باہر جھانکا تو خوشی کے مارے چیخ نکل گئی' کیونکہ سامنے ہی جونیئر کھڑا تھا۔ اس نے آکاش کا ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچا۔ وہ بمشکل اس سوراخ سے نکل پایا تھا۔ روشن دان باہر سے کوئی اونچا نہ تھا بلکہ سڑک کے ساتھ ہی ملا ہوا تھا۔ باہر نکل کر اُسے سردی کا جھونکا محسوس ہوا۔ اس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو وہ حیران رہ گیا' کیونکہ وہ سکندر ہوٹل کی پچھلی طرف کھڑے تھے۔ جونیئر نے آکاش کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور ایک طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دور جا

کر سڑک کے کنارے گاڑی کھڑی تھی۔ اس نے جلدی سے آکاش کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اگلی سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ آکاش کو گاڑی میں بیٹھتے ہی دوسرا حیرت کا شدید جھٹکا لگا' کیونکہ گاڑی کا ڈرائیور شفیع خان تھا۔ ''چلو اُستاد! جلدی کرو ورنہ وہ لوگ آجائیں گے۔'' آکاش کے بیٹھتے ہی جونیئر نے کہا اور شفیع خان نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ برق رفتاری سے گاڑی کو سمندر کی طرف جانے والی شاہراہ پر دوڑا رہا تھا۔ اس کی ناک پر ابھی تک پٹی بندھی ہوئی تھی' جو آکاش کے گھونسے نے زخمی کر دی تھی۔ وہ لوگ ویران سڑک کو کراس کرتے ہوئے کلفٹن کے پررونق علاقے کی طرف مڑ گئے۔ ساحل سمندر پر میکڈونلڈ کے پچھلے دروازے سے شفیع خان نے گاڑی اندر داخل کر دی اور وہ نیچے تہہ خانہ میں کافی دور تک چلتی گئی۔ آکاش حیرت سے سب کچھ دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ شفیع خان اور جونیئر یقیناً ملک کے خیر خواہ ہیں اور وہ بدبخت ملک کو اور ملک والوں کو لوٹ رہا تھا۔ اُسے خود پر بڑی شرمندگی ہوئی۔ گاڑی ایک جگہ جا کر رُک گئی۔ وہ لوگ نیچے اُترے تو یہ ایک وسیع کمرہ تھا جس کے ایک طرف دیوار میں دروازہ بنا ہوا تھا اور ایک روشن دان تھا۔ شفیع خان نے گاڑی کو وہیں چھوڑا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ دروازہ کھولتے ہی اندر داخل ہو کر آکاش کے ہوش اُڑ گئے۔ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں سے سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں اور ہوش اڑانے والی بات یہ تھی کہ سمندر کی لہروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ یقیناً کوئی ہٹ تھا جس پر ان کا قبضہ تھا۔ شفیع خان اوپر چڑھتا گیا۔ اُس کے پیچھے جونیئر اور پھر آکاش تھا۔ وہ ہٹ کے دروازے سے باہر نکلے تو سامنے حد نظر تک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ جونیئر نے آکاش کے آنے کے بعد ہٹ کے دروازے کو تالہ لگایا اور سمندر کی طرف بڑھ گئے۔ پانی میں تھوڑی دور ایک لانچ کھڑی تھی' وہ لوگ لانچ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس سارے راستے آکاش خاموش تھا۔ اس نے پہلی بار زبان کھولی۔ ''ٹھہرو! یہ تم لوگ مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو؟ کہیں میرے ساتھ کوئی نیا کھیل تو نہیں کھیل رہے؟''

''آکاش بھائی! ہمیں کیا کافر سمجھتے ہو! ہم نے تمہیں بھائی کہا ہے اور تمہیں قید خانہ سے نکال کر لائے ہیں۔ کیا اب تمہارے ساتھ دھوکا کریں گے؟'' شفیع خان بولا۔

آکاش چُپ چاپ چلتا ہوا اُن لوگوں کے ساتھ لانچ میں بیٹھ گیا۔ لانچ انجانی

منزل کی طرف روانہ ہوگئی۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے سفر کے بعد لانچ نے اپنا رُخ ساحل کی طرف موڑا اور کنارے پر جا کر وہ لوگ اُترے تو دو آدمی ہاتھوں میں گنیں لے کر الرٹ کھڑے تھے۔ دونوں نے شفیع خان کو سلام کیا۔ انداز خالص فوجیوں جیسا تھا۔ آکاش کے لیے یہ بھی حیرت کی بات تھی۔ وہ لوگ کچھ دور تک چلتے رہے اور پھر ایک کار میں سوار ہوگئے۔ مسلح افراد میں سے ایک ڈرائیو کر رہا تھا جبکہ ایک آدمی وہیں لانچ کے قریب ہی ٹھہر گیا تھا۔ یہ تینوں پچھلی سیٹوں پر براجمان تھے جب کہ آکاش کے ذہن میں کئی سوالات کیڑوں کی طرح کلبلا رہے تھے' لیکن خاموش تھا کہ دیکھتے ہیں آخر میں کیا ہوتا ہے...... اُسے یہ اطمینان تھا کہ وہ اپنے ہی ملک میں ہے۔ یہ سارا علاقہ اس کا دیکھا بھالا تھا۔ وہ بھی آوارہ گردی میں اعلیٰ درجہ کی سند رکھتا تھا' لیکن ان لوگوں کے پراسرار رویے اور حرکات پر حیران ضرور تھا۔ چلو خیر جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ جان سے مار دیں گے' لیکن میں آکاش ہوں۔ یونہی تھوڑا مر جاؤں گا۔ دو چار کو تو لے ہی جاؤں گا۔ وہ سوچوں میں کافی دور نکل جاتا' لیکن گاڑی رُک چکی تھی اور وہ ایک پیڑ کے نیچے کھڑے تھے۔ سامنے ایک فارم ہاؤس کی عمارت تھی۔ وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے فارم ہاؤس میں داخل ہوئے تو گیٹ پر کھڑے ایک اور آدمی نے شفیع خان کو سلیوٹ کیا۔ اندر داخل ہوتے ہی آکاش کو پرشکوہ عمارت کا احساس ہوا۔ اندر تو واقعی محلوں جیسا ماحول تھا جبکہ ہر چیز طریقے اور سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ سامان سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کے مکین خاصے باشعور ہیں اور چیزوں کو طریقے سے استعمال کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ آکاش حیرانی سے ہر چیز کو دیکھ رہا تھا۔ شفیع خان کی آواز نے اُسے چونکا دیا تھا۔

''بیٹھو آکاش! یہ تمہارے گھر سے بھی زیادہ محفوظ اور مضبوط جگہ ہے' بے فکر ہو جاؤ۔''

جونیئر ایک صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ پُرشکوہ صوفے' قالین اور دبیز پردوں نے اندرونی ماحول کو خوبصورت کر دیا تھا۔ بڑے ہال نما کمرے میں ایک طرف کونے سے سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں اور دوسرے کونے سے سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ اوپر یقیناً کوئی کمرہ اور نیچے کوئی تہہ خانہ ضرور ہوگا۔ آکاش نے سوچا۔ شفیع خان کی پراسرار شخصیت

نے اُسے حیرت میں ڈال رکھا تھا۔ یہ شفیع خان کون ہے؟ لوگ اسے سلیوٹ کیوں کرتے ہیں؟ کیا یہ فارم ہاؤس اس کی ملکیت ہے؟ اور بہت کچھ تھا پوچھنے کے لیے لیکن شفیع خان کی آواز نے اُسے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''جونیئر! مسٹر آکاش کو مزید حیران کرو۔''

جونیئر اٹھا اور نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ کر اُس نے آواز لگائی:

''اُوپر آ جاؤ ساتھیو! وہ پہنچ چکا ہے۔''

اور جو لوگ اُن سیڑھیوں سے اوپر آ رہے تھے وہ آکاش کے لیے حیرت اور پریشانی کا باعث بن گئے۔ اُن لوگوں کو دیکھ کر یک دم اس کے منہ سے نکلا: ''تم....؟! اتنا بڑا دھوکا!!!''

☆..........☆

احمد رضا کلاس سے باہر نکلا تو احمد طماس بھی پیچھے پیچھے تھا۔ ''دوست' ایک بات تو سنو یار!''

''کہو۔'' رضا نے مڑے بغیر ہی جواب دیا۔

''جو اچھے لوگ ہوتے ہیں' وہ اتنے مغرور کیوں ہوتے ہیں' جیسے تم ہو۔'' وہ چلتا ہوا رضا کے برابر آ گیا تھا۔ رضا اُس کی بات سن کر کھڑا ہو گیا اور سر سے پاؤں تک اُسے دیکھنے لگا اور بولا:

''اچھے آدمی تو تم بھی لگتے ہو تو پھر ظاہر ہے تم بھی مغرور ہو گئے۔''

''اچھا آدمی تو تم کہتے ہو۔ میرے گھر والے میری قدر نہیں کرتے۔'' وہ بے دلی سے بولا۔

رضا نے اندازہ کیا کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا ایک موٹر سائیکل تیز رفتاری سے کالج کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوئی جس پر دو لڑکے سوار تھے اور پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکے کے ہاتھ میں کلاشنکوف دیکھ کر رضا نے سوچا کہ یہ کوئی واردات کرنے آئے ہیں۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس اسلحہ بردار نے ان کی طرف کلاشنکوف کا منہ کر کے فائر کھول دیا۔ انہوں نے صورت حال کو بھانپتے ہوئے فوراً ہی احمد طماس کی قریب کھڑی ہوئی گاڑی کے پیچھے چھلانگ لگا دی' لیکن برسٹ اتنا شدید

اور تیزی میں کیا گیا تھا کہ دو گولیاں احمد طماس کو لگ گئیں۔ ایک گولی کمر میں' دوسری ٹانگ میں گھس گئی۔ وہ لوگ اسلحہ لہراتے ہوئے مین گیٹ کی طرف بڑھے۔ چوکیدار نے اپنی گن سیدھی کر کے ان پر فائرنگ کر دی۔ گولی ان کو تو نہ لگی لیکن ان کی موٹر سائیکل بے قابو ہو کر گر گئی اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے چوکیدار انہیں پکڑنے کے لیے ان کے پیچھے بھاگا۔ انہوں نے اس پر فائرنگ کر دی' جس کے نتیجہ میں چوکیدار شدید زخمی ہو گیا۔ وہ لڑکے موٹر سائیکل چھوڑ کر بھاگ گئے۔ کالج میں شدید خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ ہر کوئی رضا اور احمد طماس کی طرف دوڑ رہا تھا۔ احمد طماس بے ہوش ہو گیا تھا جبکہ رضا محفوظ رہا تھا اور چیخ چیخ کر لوگوں کو وہاں سے ہٹنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ ''دور دور ہٹ جاؤ! احمد طماس کو گولیاں لگ گئی ہیں۔ جلدی سے ایمبولینس کو فون کرو۔'' کسی نے کہا اور کسی نے فوراً ہی طماس کی گاڑی میں ڈال کر ہسپتال لے جانے کو کہا۔ طماس کی جیب سے چابی نکال کر گاڑی کو کھول کر اس میں طماس کو ڈالا گیا۔ اگلی سیٹ پر رضا اور ایک اور لڑکا بیٹھ گیا۔ گاڑی ہسپتال کی طرف اُڑی جا رہی تھی اور طماس کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ رضا کافی پریشان تھا وہ چاہتا تھا کہ جیسے بھی ہو گاڑی جلد از جلد ہسپتال پہنچ جائے' لیکن سڑکوں پر رش بہت زیادہ تھا۔ پھر بھی ساتھی لڑکا گاڑی کو اڑائے لیے جا رہا تھا۔ چوکوں پر اشارے کی پرواہ کیے بغیر گاڑی ہسپتال پہنچ گئی۔ رضا نے باہر نکل کر فوراً سٹریچر پکڑا۔ اتنی دیر میں عملہ بھی پہنچ گیا۔ طماس کو فوراً سٹریچر پر لٹا کر ایمرجنسی میں لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں نے فوراً ہی اس کا علاج شروع کر دیا۔ رضا نے ایک ڈاکٹر کو بتایا کہ اسے کیسے گولیاں لگی ہیں اور یہ ایم این اے راجہ سلیم کا بیٹا ہے۔ تبھی تو جلدی جلدی تمام عملہ حرکت میں آ گیا تھا ورنہ پولیس کیس کو کون ہاتھ ڈالتا ہے۔ ڈاکٹر کافی پریشان تھے لیکن تندہی سے طماس کی جان بچانے کی سر توڑ کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

ایک ڈاکٹر نے باہر آ کر رضا سے پوچھا کہ آپ ان کے ساتھ ہیں۔ تو رضا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیا آپ اپنے دوست کی جان بچانے کے لیے اپنا خون دینا پسند کریں گے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''کیوں نہیں ڈاکٹر صاحب! میرا خون طماس کے خون کے ساتھ میچ کر جائے تو

مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ چاہے میرے جسم سے تمام خون نچوڑ لیں لیکن میرے دوست کی جان بچا لیں۔'' وہ بے خیالی میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ ابھی تک اس نے طماس سے دوستانہ ہاتھ تو ملایا ہی نہ تھا' لیکن پھر بھی وہ اتنا پریشان تھا جیسے طماس اس کا کلاس فیلو نہ ہو بلکہ سگا بھائی ہو۔ وہ ڈاکٹر کے ساتھ لیبارٹری تک پہنچ گیا تھا۔
ڈاکٹر نے سرنج میں ڈالا ہوا طماس کا خون لیبارٹری اٹینڈنٹ کو دیا اور رضا کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ان کا خون ٹیسٹ کر کے فوراً مجھے رپورٹ دو۔ رضا کو سٹریچر پر لٹایا گیا' اور لیبارٹری اٹینڈنٹ نے اس کا خون سرنج میں بھرنا شروع کر دیا اور بولا کہ امید ہے کہ آپ کا خون میچ ہو جائے گا۔ رضا نے تشکر بھرے انداز میں مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا۔

ڈاکٹروں نے کمر سے گولی تو نکال دی تھی' لیکن طماس بدستور بے ہوش تھا' کیونکہ خون کافی ضائع ہو چکا تھا۔ گاڑی بھی خون سے بھر گئی تھی۔ رضا کا خون میچ کر گیا تھا۔
اب طماس کو بوتل لگی ہوئی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کون لوگ تھے جنہوں نے ان دونوں پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ یہ یقیناً طماس کے دشمن ہوں گے کیونکہ وہ ایک امیر باپ کا بیٹا تھا اور امیر لوگوں کے دشمن کافی ہوتے ہیں اور رضا پاس کھڑا تھا وہ بھی مفت میں رگڑا گیا۔ اتنی دیر میں پولیس ہسپتال پہنچ چکی تھی اور ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ رضا' طماس کو لے کر آیا ہے اور پھر پولیس اپنے روایتی طریقوں سے پوچھنے لگی۔
''ہاں تو مسٹر رضا! وہ کون لوگ تھے جنہوں نے طماس پر گولی چلائی؟'' ایک سب انسپکٹر جس کا نام شیرازی تھا' اس نے روایتی انداز اپناتے ہوئے پوچھا۔
''کیا مطلب کہ کون لوگ تھے؟ آپ ایسے بات کر رہے ہیں جیسے وہ میرے واقف تھے۔'' رضا نے بھی چبھتا ہوا انداز اپنایا۔ وہ جانتا تھا کہ پاکستانی پولیس لومڑی کو بھی ہاتھی کہنے پر مجبور کر دیتی ہے۔
''انسپکٹر صاحب میں بھی طماس کے ساتھ ہی تھا جب اس پر بلکہ ہم دونوں پر حملہ ہوا ہے۔ یہ میرا کلاس فیلو ہے۔ ہوش میں آئے گا تو اس سے پوچھیے' مجھ سے نہیں' کیونکہ میں اچھا بھلا ہوں اور ہوش میں کھڑا ہوں۔'' رضا کا یہ روپ انوکھا تھا اور حیران کن تھی۔

''جب میرے ساتھ سٹڈی روم میں جاؤ گے تو ہوش بھی گنوا بیٹھو گے اور سب کچھ بک بھی دو گے۔''
اس سے پہلے کہ انسپکٹر مزید کچھ کہتا' ایک اچھا خاصا آدمی جو کہ بلیو رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھا' اوپر سے میرون کلر کی ویسٹ کوٹ پہنے ہوئے تھا' بڑی شان اور تمکنت سے چلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا اور ساتھ میں دو باڈی گارڈ بھی۔ انسپکٹر نے اُسے دیکھتے ہی سلام کیا اور ایڑیاں بجنے سے ہسپتال کا برآمدہ بھی گونج اُٹھا۔
''راجہ صاحب آپ! اب آپ کا بیٹا خطرے سے باہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے نئی زندگی دی ہے۔''
ڈاکٹر نے آنے والے صاحب سے کہا' تو رضا کو بھی پتہ چلا کہ یہ راجہ سلیم ہے طماس کا باپ' یعنی ایم این اے راجہ سلیم۔ ایک قد آور شخصیت' کلین شیو کیے ہوئے' ایک گریس فل شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا رُعب اور دبدبہ ان کے سیاسی حلقہ میں مشہور تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس وقت وہ حکومتی ایم این اے تھے۔
راجہ صاحب نے ہاتھ اٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا اور ڈاکٹر سے بولے کہ:
''کیا میں اپنے بیٹے سے مل سکتا ہوں!''
''جی نہیں' ابھی کچھ دیر بعد آپ مل سکیں گے۔'' ڈاکٹر کے انکار کے بعد راجہ صاحب نے انسپکٹر کی طرف دیکھا' تو وہ اپنے نمبر بنانے کے لیے آگے بڑھ کر ایک بار پھر سلام کر کے بولا۔
''راجہ صاحب! ہم نے اس لڑکے کو مشکوک جان کر اس سے کچھ پوچھنا چاہا ہے تو یہ اپنے ہی ٹور میں بولتا ہے۔'' اس نے رضا کی طرف اشارہ کیا اور اس سے پہلے کہ راجہ صاحب رضا سے کچھ پوچھتے' ڈاکٹر نے کہا۔
''آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟'' ڈاکٹر راجہ صاحب کی طرف متوجہ ہوا۔ ''راجہ صاحب اگر یہ لڑکا نہ ہوتا تو آپ کے بیٹے کو خدانخواستہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس لڑکے نے تو اپنا خون دیا ہے تبھی تو طماس کی جان بچائی جا سکی ہے۔'' اس نے راجہ صاحب کی توجہ رضا کی طرف دلائی تو انسپکٹر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ راجہ صاحب رضا کی طرف بڑھے

تو رضا بھی آگے بڑھ آیا۔ راجہ صاحب نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور بولے ''میرا نام راجہ سلیم ہے۔ اور تم جانتے ہو گے کہ میں ایم این اے ہوں۔ اور طماس کا باپ بھی۔ میں تمہارا بے حد ممنون ہوں کہ تم نے میرے بیٹے کی جان بچائی ہے اور یہ میری زندگی پر بہت بڑا احسان ہے تمہارا۔ زندگی میں کبھی میری ضرورت پڑی تو مجھے ضرور بتانا۔ مجھے خوشی ہوگی اگر ہم تمہارے کام آ سکیں۔'' رضا نے راجہ صاحب کا ہاتھ تھام کر سلام والے انداز میں اپنا ہاتھ ملایا' لیکن راجہ صاحب نے اس کا ہاتھ تھام کر چھوڑے بغیر تمام باتیں کی تھیں اور اب اس کا ہاتھ چھوڑ کر انسپکٹر سے مخاطب ہوئے۔ ''اگر تم صحیح آدمی تک نہیں پہنچ سکتے تو یہ وردی اتار دو' مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے بڑوں کو میرے پاس بھیجو اور اب چلے جاؤ یہاں سے۔''

اور انسپکٹر ڈھیلا سا سلیوٹ کر کے چلتا بنا۔ ڈاکٹر نے آ کر طماس کے ہوش میں آنے کی خبر سنائی تو راجہ صاحب ایک دم اندر کی طرف دوڑے جیسے وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھنے کے لیے بہت بے چین تھے۔ رضا بھی ساتھ ہی اندر داخل ہو گیا تھا۔ احمد طماس مکمل ہوش میں تھا۔

☆..............☆

آکاش اپنے ساتھیوں کو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھ کر پاگلوں کی طرح غرایا تھا اور ساتھ ہی شفیع خان کی طرف بڑھا تھا' لیکن اس نے راجو کی آواز پر اپنے بڑھتے ہوئے قدم روک لیے۔

''آکاش بھائی! ہم یہاں مہمان ہیں۔''

آکاش نے حیرت سے اُن کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ وہ چھ کے چھ ہی خوش نظر آ رہے تھے۔ وہ کبھی ان کی طرف اور کبھی شفیع خان کی طرف دیکھتا تھا' جو انتہائی سکون اور اطمینان سے صوفے میں دھنسا ہوا تھا۔ اُس نے پیاری سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے آکاش اور دوسرے لوگوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔

''آکاش بابو! کیا تم شمع کو جانتے ہو؟'' یہ اچانک ایسا سوال تھا کہ آکاش کے ساتھ ساتھ تمام ساتھی بھی چونک کر خان کی طرف دیکھنے لگے' لیکن آکاش نے سوال کا کوئی جواب نہ دیا' تو شفیع خان پھر بولا' لیکن اس بار وہ جونیئر سے مخاطب تھا۔

''جاؤ اور ہمارے اس مہمان کو مزید حیران کرو' شمع کو لے آؤ۔''

جونیئر اوپر چلا گیا۔ آکاش اور تمام گروپ جانتا تھا کہ شمع آکاش سے بہت پیار کرتی ہے اور من ہی من میں آکاش بھی اُسے چاہتا ہے' لیکن اظہار نہیں کرتا۔ وہ تمام لوگ اب سوچ رہے تھے کہ شمع کا یہاں کیا کام' وہ کتنے پراسرار انداز میں یہاں تک پہنچے تھے۔ یہ بات وہی لوگ جانتے تھے۔ اب شمع یہاں کیسے اور کیوں؟ آکاش جب سے سکندر ہوٹل کے قید خانہ سے نکل کر آیا تھا' وہ ہر قدم پر حیرت کا شکار تھا اور شفیع خان خود پراسرار کردار بنا ہوا حیرت پر حیرت کے جھٹکے لگا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جونیئر کے سیڑھیاں اُترنے کی آواز سنائی دی تو تمام لوگ اوپر کی طرف دیکھنے لگے۔ جونیئر کے پیچھے شمع بھی بے نیاز انداز سے چلتی ہوئی آ رہی تھی۔ آکاش نے پہلی بار اُسے غور سے دیکھا تھا۔ وہ کاسنی رنگ کی شلوار قمیص میں ملبوس تھی اور خراماں خراماں باوقار انداز سے پاؤں رکھتی ہوئی' ایک ایک سیڑھی دیکھ کر اُتر رہی تھی۔ ہلکے سے میک اپ میں وہ بہت جچ رہی تھی۔ راجو نے آکاش کے کان میں سرگوشی کے انداز میں کہا لیکن آواز اتنی دھیمی تھی کہ دوسرے لوگ نہ سن سکیں۔ صرف آکاش ہی اس بات سے لطف اندوز ہوا۔

''آکاش بھیا! آپ خواہ مخواہ ہی دل چھوٹا کر رہے تھے۔ بھابی تو کافی گریس فل ہے۔ اگر ہماری بھابی کے طور پر قبول نہیں تو پھر اپنی بھابی مان لیں۔ میں قربانی کا بکرا بننے کے لیے تیار ہوں۔''

آکاش نے راجو کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ شمع واقعی آج بہت حسین لگ رہی تھی۔

وہ چلتی ہوئی پروقار انداز سے صوفے پر بیٹھ گئی تو شفیع خان نے کھنکار کر تمام لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی۔

''سب سے پہلے میں آکاش کی کافی ساری اُلجھنیں اور غلط فہمیاں دور کرنا چاہتا ہوں۔''

''اب صرف میں بولوں گا اور آپ لوگ سنیں گے' کیونکہ میں کسی بھی شخص کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتا۔ میری بات ختم ہونے کے بعد آپ لوگ کوئی سوال کر سکتے ہیں۔'' یکدم شفیع خان کا نرم رویہ سخت ہو گیا تھا اور وہ کسی فوجی جرنیل کی طرح آرڈر جاری کر رہا تھا۔ اس کے لہجہ میں دبدبہ اور رعب تھا۔ وہ بولنا شروع ہوا تو اس نے جونیئر کو چائے کا اشارہ کر دیا۔ جونیئر چلا گیا تھا۔

”آ کاش صاحب! اس ملک میں ایک محب وطن اور سچے حکمران کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے حکمران کی جو عوام پر نہیں بلکہ عوام کے دلوں پر راج کرنا سیکھے' لیکن میرے ملک کا المیہ یہ ہے کہ آج تک کوئی بھی ایسا حکمران نہیں آ سکا جو پاکستان کے عوام کے دل جیت سکے۔ کوئی جنرل بن کر آیا تو گیارہ سال گزار گیا۔ کوئی بھی اس ملک کی قسمت سنوارنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ ہم چھپن سال پہلے جہاں کھڑے تھے آج بھی وہیں کھڑے ہیں' بلکہ دو چار قدم پیچھے ہی گئے ہوں گے۔ جاپان جو کہ امریکہ کی فوج نے تباہ کر دیا تھا' ہمارے ساتھ ہی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھ رہا تھا' لیکن گزشتہ پچاس سالوں میں جاپان زندگی کے ہر شعبے میں دنیا پر حکومت کرنے لگا ہے۔ الیکٹرونکس مصنوعات خود امریکہ بھی جاپانی میڈ خریدتا ہے۔ ان کے ملک میں صفائی' نظام حکومت' نچلی سطح پر تمام تر انتظامات' ریلوے' ڈاک' ایئر لائنز' ٹرانسپورٹ اور دیگر تمام شعبوں میں وہ بالکل ویل سٹینڈ ہو گئے ہیں اور ہم جھوٹی انا کے خول میں بند ہیں۔ یہاں پر اگر کوئی نوجوان بغیر پٹرول کے چلنے والی موٹر سائیکل ایجاد کر لیتا ہے تو وہ بے چارہ خوشی خوشی اخبارات میں اشتہارات کے ذریعے حکومتی امداد مانگتا ہے' لیکن پھر نہ وہ موٹر سائیکل ہوتی ہے اور نہ بنانے والا' جو ٹینک ہم دوسرے ملکوں سے دو یا اڑھائی کروڑ میں خریدتے ہیں' وہ ہماری فوج اور انجینئر ایک دوسرے کے تعاون سے تقریباً ساٹھ ستر لاکھ میں تیار کر سکتے ہیں' لیکن ایسا کرنے نہیں دیا جاتا' کیونکہ اگر ایسا ہو گیا تو پاکستان اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا اور جو صاحب دوسرے ملک سے جہاز اور ٹینک خریدنے کے لیے سربراہ بنیں گے وہ خود کیسے کھائیں گے۔ بجلی' سوئی گیس' گندم ہمارے ملک میں بے بہا خزانے کی مانند ہیں' لیکن تمام چیزیں غریب آدمی کی پہنچ سے اتنی دور ہیں جیسے کسی انوکھے لاڈلے کی پہنچ سے چاند دور ہوتا ہے۔ چینی ہمارے ملک میں بہترین اور وافر ہے اور جسے ہم انڈیا کو بارہ روپے فی کلوگرام میں فروخت کرتے ہیں اور پھر وہی چینی ہمیں انڈیا سے اٹھارہ روپے کلو خریدنا پڑتی ہے۔ کروڑوں ٹن گندم حکومتی گوداموں میں پڑی پڑی گل سڑ جاتی ہے' لیکن غریب کے منہ میں بارہ روپے کلو والا آٹا کبھی بھی دس روپے فی کلو نہیں پہنچتا۔ گیس اللہ تعالیٰ کی بے بہا نعمت ہے' جو ہم بلوچستان سے سوئی کے مقام سے حاصل کرتے ہیں۔ ہم اپنے ملک میں گیس پوری طرح سپلائی نہیں کر سکے اور

دوسرے ملکوں میں گیس لائنیں بچھا رہے ہیں اور انہیں دے رہے ہیں۔ ہر حکمران پچھلی حکومت پر کرپشن کا الزام لگا کر اپنی لوٹ مار کا جواز پیدا کرتا ہے اور خالی خزانہ کا رونا روتے ہوئے اپنی تجوریاں بھر کر چلتا بنتا ہے۔ ایک سو روپے روزانہ پر مزدوری کرنے والے لوگ حکومتوں میں آ کر کروڑوں بلکہ اربوں کے مالک بن جاتے ہیں۔ عوام جو بھی ٹیکسز دیتے ہیں' کبھی انہیں کوئی سہولت ملی ہے یا ملے گی؟ ہرگز نہیں کیونکہ وہ رقم قومی خزانے میں جانے کی بجائے تمام چھوٹے بڑے افسروں کی جیبوں میں چلی جاتی ہے اور عوام منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ بجلی کیوں مہنگی ہے' لوڈشیڈنگ کیوں ہوتی ہے؟ بھائی کیا کریں پانی کم ہے اور جب سیلاب اور بارشوں کی وجہ سے ڈیم بھر جاتے ہیں تو بھائی کیا کریں پانی بہت زیادہ ہے' نہ کم پانی سے تمہارا گزارہ ہوتا ہے اور نہ زیادہ پانی برداشت کرتے ہو۔ عوام کی تقدیر بدلنے کے دعوے ہر امیدوار کرتا ہے' لیکن وہی امیدوار ایم این اے یا ایم پی اے بن کر اسمبلی میں پہنچ جاتا ہے تو کبھی کسی ڈیم کی مخالفت کرتا ہے۔ کسی سڑک کی تعمیر میں روڑے اٹکاتا ہے کیونکہ اس میں اس کا ذاتی فائدہ نہیں ہوتا۔ عوام جائیں جہنم میں! اُسے کیا؟ بینکوں کے باہر لمبی لمبی قطاریں بوڑھے' ضعیف' مرد اور عورتیں گرمیوں کی سخت اور گرم دوپہر میں کھڑے ہیں۔ بل ہاتھوں میں پکڑے ہوئے اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں لیکن بینکوں کا عملہ ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھا گپیں ہانک رہا ہوتا ہے۔ وہ موج کر رہے ہیں اور عوام گرمی میں مر رہے ہیں۔ ہم گزشتہ چھپن' ستاون برس سے یہ مسئلہ حل نہیں کر سکے تو ہم مغرب کی طرز پر اپنی گھڑیاں گھنٹہ آگے یا پیچھے کر کے ان کے ساتھ مل جائیں گے؟ کچھ تو شرم کرنی چاہیے ہمیں۔ عوام بھی اسی قابل ہیں۔ ایک جاتا ہے تو اس کی اچھائیاں اور حکومت کی برائیاں سامنے آ جاتی ہیں' لیکن دوبارہ الیکشن آنے پر اُسی حکومتی امیدواروں کے بینر بجلی کے پول پر چڑھ کر باندھتے ہوئے کوئی نہ کوئی مر جاتا ہے۔ سیاستدانوں کے جلسے اور جلوسوں میں لوگ بے وقوفوں کی طرح بھاگم بھاگ کر جاتے ہیں اور اتنا رش ہوتا ہے کہ تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی' لیکن کلمہ طیبہ کے نام پر حاصل کیے گئے اس ملک میں رمضان شریف کے علاوہ کوئی بھی مسجد نمازیوں سے بھر نہیں سکتی۔ یہ عوام اسی قابل ہیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جیسی قوم ہوگی ویسا ہی حکمران نازل ہوگا۔ یہ قوم اسی قابل ہے' سدا آئی۔

ایم۔ ایف اور امریکہ کی طرف دیکھنے والی۔ ابھی کئی اور صدیاں گزر جائیں گی تب ہم تمام قرض اتار سکیں گے لیکن کیسے ہر حکمران آتے ہی خالی خزانہ کا رونا روتا ہے۔ آئی ایم ایف ہمیں قرض کی صورت میں امداد دیتی ہے اور پھر بجلی' گیس' فون' ریلوے' ٹرانسپورٹ اور زندگی کے تمام شعبوں پر ان کی گرفت ہوتی ہے۔ ان کی مرضی کے ریٹس ہوتے ہیں اور ہم بے ضمیروں کی طرح خاموشی سے تمام ریٹس قبول کر لیتے ہیں۔ کیوں نہ کریں ہم اپنے ضمیر اور آنے والی نسلوں کو امریکہ کے ہاتھوں گروی رکھ چکے ہیں۔ اور کئی نسلیں مقروضوں کی زندگی جئیں گی اور میں سمجھتا ہوں یہ کوئی آزادی کی زندگی نہیں ہے بلکہ ہر سانس کا قرض ادا کرتے ہوئے زندگی کی مدت پوری کرتے ہیں ہم!''

اتنی باتیں کہنے کے بعد شفیع خان خاموش ہوگیا تھا' کیونکہ اس نے پانی کی بوتل منہ سے لگالی تھی جو جونیئر چائے کے ساتھ لے کر آ گیا تھا۔ تمام لوگ بے وقوفوں کی طرح شفیع خان کی تلخ اور کڑوی باتوں کو سن رہے تھے اور تائید میں سر بھی ہلا رہے تھے کہ تمام الفاظ اور باتیں سچائی پر مبنی ہیں۔ ''اب میں تمہیں اپنا تعارف کرواتا ہوں۔'' شفیع خان ایک بار پھر ان کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ لوگ چائے پی رہے تھے۔ ''میرا نام شفیع خان ہے' جنرل شفیع خان!''

☆.............☆

احمد طماس ہسپتال سے گھر منتقل ہو چکا تھا۔ کالج میں کس نے فائرنگ کی اور کیوں کی یہ کسی کو پتہ نہ تھا' لیکن صرف راجہ سلیم کے بیٹے پر گولی کیوں چلائی گئی۔ راجہ صاحب نے متعلقہ تھانہ کا تمام عملہ معطل کروا دیا تھا اور کالج انتظامیہ کو سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ تمام سٹوڈنٹس کی حفاظت کے لیے اچھی اور سخت سکیورٹی قائم کریں۔ اخبارات میں کئی دنوں تک راجہ صاحب کے انٹرویو چھپتے رہے تھے' جن میں انہوں نے تمام تر ذمہ داری اپوزیشن پر ڈال دی تھی اور سیاسی بیان داغ دیا تھا کہ جلد ہی مجرم عوام کے سامنے ہوں گے۔ تجلی بیگم جو کہ احمد طماس کی والدہ تھیں صرف ایک بار بیٹے کو دیکھنے کے لیے ہسپتال گئی تھیں۔ راجہ صاحب اور تجلی بیگم کے درمیان اس مسئلہ پر بہت لے دے ہوئی تھی' لیکن انہیں بیٹے سے زیادہ اپنی پارٹیاں اور فنکشن عزیز تھے۔ یہی وجہ تھی کہ طماس ماں کی موجودگی میں بھی خود کو تنہا اور اکیلا محسوس کرتا تھا۔ اب بھی راجہ صاحب طماس کے

خوبصورت کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے اور باپ بیٹا محسوس کر رہے تھے کہ دونوں کتنے لاچار اور بے بس ہیں جو تجلی بیگم کو روک نہیں سکتے۔

''اچھا بیٹا' تم یہ بتاؤ کہ چاندنی کب آ رہی ہے؟ وہ تو ایسی کالج ٹور پر گئی ہے کہ دوبارہ نہ بھائی سے رابطہ کیا ہے اور نہ باپ کو کوئی خبر دی ہے۔'' راجہ صاحب نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''پاپا جانی! آپ جانتے ہیں کہ چاندنی کتنی صاف اور بولڈ طبیعت کی لڑکی ہے۔ وہ جو دیکھتی ہے' سمجھتی ہے' اُسے فوراً منہ پر کہہ دیتی ہے۔ وہ آپ کو بتا کر تو گئی تھی کہ وہ قصر راجہ سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لینے جا رہی ہے اور واپسی کب ہوگی یہ وہی جانتی ہے۔'' احمد طماس نے ٹھنڈی آہ بھری اور راجہ صاحب نے طماس کی طرف دیکھ کر کہا:

''میں جانتا ہوں بیٹا کہ تمہاری ممی تمہیں ٹائم نہیں دے پاتیں۔''

''آپ بھی کب ٹائم دیتے ہیں؟ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ آج میرے پاس بیٹھے ہیں۔ آپ جانتے ہیں پاپا ان لمحات کو میں زندگی سمجھتا ہوں۔''

''تمہارا باپ ایک سیاسی لیڈر ہے۔ ہزاروں جھمیلے ہوتے ہیں' سینکڑوں مسائل نپٹانے ہوتے ہیں اور پھر تم اچھی طرح جانتے ہو کہ الیکشن بھی نزدیک آ رہے ہیں۔'' راجہ صاحب نے لہجہ تلخ کرنے کی کوشش کی' لیکن بیٹے کی تکلیف دیکھ کر دھیمے ہو گئے۔

''آپ کا بہت شکریہ کہ سینکڑوں مسائل میں آپ نے میری عیادت کو بھی ایک مسئلہ جانا اور آج تین ماہ بعد میرے کمرے میں اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے تشریف لائے۔'' طماس کی باتوں میں زہر بھرا ہوا تھا۔

''آپ نے کبھی آپی کاجل کا پتہ کیا' وہ کس حال میں ہیں؟ وہ زندہ بھی ہیں یا ....؟؟؟''

''طماس! اپنی زبان کو صرف اُتنا لمبا کرو جتنا تمہارا منہ ہے۔ لمبی زبانیں اس ملک میں کاٹ دی جاتی ہیں۔ کاجل اپنے گھر میں سکھی ہے اور جو امریکہ کی شہریت رکھتا ہو وہ کسی بھی حال میں زندہ رہتا ہے۔ آئندہ کاجل کا ذکر نہیں ہوگا وہ میرے لیے مر گئی ہے۔'' یہ کہہ کر راجہ صاحب باہر نکل گئے اور طماس چھت کو گھورنے لگا۔

اتنے بڑے محل میں وہ اکیلا تھا۔ دولت، جائیداد اس کی لونڈی تھی، لیکن سوائے چاندنی کے کوئی اس کا ہمدرد نہ تھا۔ وہ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کا دکھ درد سمجھتے تھے اور ایک دوسرے کا مداوا تھے۔ کاش چاندنی ابھی آ جائے۔ طماس بڑبڑایا تو اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے کم آن کہا تو حیران رہ گیا۔ اس نے سوچا تھا کہ کوئی ملازم ہوگا جوس لے کر آیا ہوگا، لیکن دروازے پر احمد رضا کھڑا مسکرا رہا تھا۔ طماس کی آنکھیں جگمگانے لگیں۔ ''ارے رضا! وہاں کیوں کھڑے ہو۔ آؤ نا، اندر آؤ۔ یہ تمہارا ہی گھر ہے۔'' طماس نے کہا تو رضا نے ٹھنڈی آہ بھر کر قدم آگے بڑھا دیئے اور ایک نظر طماس کے کمرے پر ڈالی۔ خوبصورت اور قیمتی بیڈ پر قیمتی بیڈشیٹ بچھا ہوا تھا۔ دائیں طرف دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کارنر پر تازہ گلاب کے پھول رکھے تھے۔ کمرہ خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ رضا چلتا ہوا کرسی کے پاس کھڑا ہوگیا۔ وہ اس عظیم الشان محل کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا اور اب تو وہ اس محل کے ایک خوبصورت کمرے میں کھڑا تھا۔ اور اپنی حیثیت پہچانتا تھا۔ اسی لیے تو وہ کرسی پر نہیں بیٹھ رہا تھا۔

''رضا! کھڑے کیوں ہو۔ یہاں تک آ گئے ہو تو آگے آؤ یار اور میرے گلے لگ جاؤ۔ تم نے میری زندگی بچا کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ بیٹھو بیٹھو کرسی پر بیٹھو۔'' طماس کی خوشی دیدنی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ خود اٹھ کر رضا کو گلے لگا لیتا لیکن مجبور تھا۔ ٹانگ پر اور کمر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

''طماس بھائی! دوستی میں احسان اور شکریہ نہیں ہوتا۔ میں نے تمہاری جان بچائی ہے یہ تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ بلکہ میں نے خود پر احسان کیا ہے، کیونکہ میں بھی تمہیں کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تمہاری جان بچا لی۔'' رضا آگے بڑھ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے طماس کا ہاتھ تھام لیا۔ طماس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ وہ بولا: ''نجانے کتنی مدت کے بعد آج کسی اپنے کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر محسوس ہوا ہے کہ جیسے بھائی کا ہاتھ ہے۔ تمہیں پتہ ہے رضا میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ آج سے میں نے تمہیں اپنا بھائی سمجھ لیا ہے۔'' وہ جذباتی ہو رہا تھا۔

''طماس صاحب! آپ تو جذباتی ہو گئے ہیں۔'' رضا نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

''ارے یار! میں نے تمہارے لیے تو کچھ منگوایا ہی نہیں۔ بلاتکلف بتاؤ کیا لوگے؟'' طماس کھسیانا سا ہو کر بولا۔

''مجھے کسی چیز کی طلب نہیں ہے۔ اگر ہوئی تو ضرور بتاؤں گا۔'' رضا کے انکار پر بھی طماس نے بیل بجا دی جو کہ اس کے بیڈ کے پاس ہی لگی ہوئی تھی۔ رضا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ ایک باوردی ملازم اندر داخل ہوا اور جی صاحب کہتا ہوا ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

''جابر! میرا دوست، میرا بھائی آیا ہے۔ اچھی سی چائے اور دیگر لوازمات۔ فوراً اور فوراً او کے!'' طماس دِلی طور پر خوشی محسوس کر رہا تھا۔ جابر باہر چلا گیا تو رضا بولا:

''طماس صاحب! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''سب سے پہلی بات یہ کہ میں صاحب نہیں ہوں۔ دوسری بات یہ کہ تم نے جو بھی بات کرنی ہے بلاتکلف اور بلا جھجک کہو۔ کیونکہ اس وقت تم میرے یا کسی غیر کے گھر میں نہیں ہو بلکہ اپنے گھر میں ہو اور جو کچھ بھی دل میں ہے اس کو نکال باہر کرو۔ او کے۔''

''کاش! میرا گھر بھی ایسا ہوتا۔'' رضا نے سوچا اور بولا۔

ہنستے ہنستے رُلا دیتی ہے دوستی کی ادا بھی
سب کچھ ہے بکتا یہاں دوستی بھی وفا بھی

''میں جانتا ہوں کہ تم بہت بڑے اور اچھے شاعر ہو، لیکن دوستی اور وفا کی کبھی کمی محسوس نہ ہوگی تمہیں۔ میں تم جیسے دوست کو ترستا تھا تو کیا اب یونہی کھو دوں گا۔ کبھی آزما لینا۔ یہ دوستی قبر کی دیواروں تک قائم رہے گی۔'' طماس نے رضا کے شعر کا ترجمہ بھی کر دیا اور اپنا مُدعا بھی بیان کر دیا تھا۔

''میں شاعر ہوں اور تمہیں علم ہے کہ شاعر معاشرے کا حساس ترین حصہ ہوتے ہیں۔ اس سینے میں جو دل ہے اس میں صرف تمہیں بسایا ہے اور تمہاری دوستی کو اپنا ایمان بنایا ہے۔ میری تم سے درخواست ہے کہ کبھی اس دوستی کی راہ میں اپنی دولت یا اپنے والد کے مقام و مرتبے کو مت آنے دینا، کیونکہ میں نے تمہارے کھرے من سے دوستی کی ہے نہ کہ دولت اور تمہاری اس شان و شوکت سے، جو کہ تمہارے والد کی وجہ سے ہے۔ میں کھرا اور سچا بندہ ہوں اور یہی چاہتا ہوں کہ مجھے بھی میری طرح کے بندے

ملیں۔ مجھے تم میں تھوڑی سے اپنی جھلک نظر آئی تھی اسی لیے تمہاری طرف بڑھا ہوں اور انشاءاللہ تم بھی دیکھنا کہ رضا کیسے دوستی نبھاتا ہے۔ مرکر بھی!''

رضا نے اپنے دل کی بات کہہ دی تھی اور طماس مسکرا کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ملازم چائے لے کر آ گیا تھا اور ٹرالی کئی طرح کی ڈشوں سے بھری پڑی تھی۔ جو کہ چائے کے ساتھ ضروری لوازمات ہوتے ہیں' اس نے ٹرالی دھکیل کر رضا اور بیڈ کے درمیان کر دی اور چائے بنا کر رضا اور طماس کو دی اور باہر چلا گیا۔ دونوں چائے کی چسکیاں لینے لگے۔

''اچھا تو طماس! اب کالج کب آ رہے ہو؟''

''تم کہو تو ابھی چلیں۔''

''ارے یار' ابھی تم ٹھیک تو ہو نہیں۔ اتنی بھی جلدی کیسی' میں نے یونہی بات کی تھی۔''

''کبھی بھی یونہی بات نہ کرنا' کیونکہ تمہاری یونہی بات میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔''

''مجھے انسان ہی رہنے دو' اتنا نہ بانس پر چڑھاؤ کہ پھر اترنا مشکل ہو جائے۔ او کے' پھر تم ٹھیک ہو کر کالج آنا میں تمہارا منتظر رہوں گا۔'' رضا اٹھتا ہوا بولا۔ طماس بھی تھوڑا سا آگے ہو کر رضا کو خدا حافظ کہنے کے لیے اٹھنا چاہتا تھا' لیکن تکلیف کی وجہ سے اپنی جگہ پر ٹِک گیا۔ ''تم آرام کرو' شکریہ۔'' رضا کمرے سے باہر نکلنے کے لیے دروازہ کھول رہا تھا اور کوئی اندر آنے کے لیے دروازہ دھکیل رہا تھا۔ باہر سے آنے والا گرتے گرتے رضا کی بانہوں میں جھول گیا۔ رضا نے دیکھا کہ وہ کوئی خوبصورت پھول ہے جو کسی شاخ سے ٹوٹ کر اس کی جھولی میں گر گیا ہے۔ باہر سے آنے والی خوبصورت لڑکی رضا کی بانہوں میں جھول رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور کئی لمحات اسی طرح گزر گئے اور شاید مزید وقت گزر جاتا۔ احمد طماس کی آواز نے دونوں کو چونکا دیا۔

''چاندنی' میری اچھی سسٹر! میری کیوٹ سسٹر! تم بغیر اطلاع دیئے ہی اچانک؟!''

آنے والی چاندنی تھی۔ طماس کی چھوٹی بہن جو کہ کالج ٹور سے واپس آئی تھی اور آتے ہی اُسے پتہ چلا تھا کہ طماس کو گولی لگ گئی ہے۔ اس نے سامان وہیں چھوڑا اور

بھاگم بھاگ بھائی کے کمرے کی طرف آئی تھی۔ تبھی تو رضا کے دروازہ کھولتے ہوئے اس کا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر نہ پڑا تھا بلکہ وہ اپنے ہی زور میں اندر داخل ہوئی تھی اور رضا کی بانہوں میں جھول گئی تھی۔ وہ سنبھل کر بھائی کی طرف بڑھی۔

''کیا ہوا ہے تمہیں؟ کن لوگوں نے تم پر گولیاں چلائی ہیں؟ مجھے بتاؤ اُن سب کا خون پی جاؤں گی۔ وہ تمہارے دشمن کیوں ہیں؟ بتاؤ تو سہی کون ہیں وہ لوگ؟'' اس کی زبان چل پڑی تھی۔ رضا خاموش کھڑا بہن بھائی کو دیکھ رہا تھا۔

''اچھا اچھا میری ماں! میری خون پینے والی بہن! ذرا خاموش رہو تو دروازے میں بُت بن کر کھڑے ہونے والے مہمان کا تعارف کروا دوں۔'' طماس نے بہن کے سر پر پیار سے چپت لگائی اور اس کا دھیان رضا کی طرف کیا۔ دونوں کی نگاہیں ملتے ہی دل کے تار چھڑ گئے تھے' لیکن رضا کو یکدم احساس ہوا کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔

''چاندنی! یہ میرے کلاس فیلو بھی ہیں اور اچھے شاعر بھی ہیں اور رضا! یہ میری چھوٹی بہن چاندنی ہے۔'' چاندنی نے نگاہیں جھکا لی تھیں۔ ''یہ مجھ سے چھوٹی ہے لیکن میرا بہت خیال رکھتی ہے' کوئی دکھ یا تکلیف میرے قریب نہیں آنے دیتی۔''

''ہاں یہ واقعی چاندنی ہے۔'' رضا نے سوچا تو چاندنی نے بے اختیار چہرہ اوپر اٹھا کر رضا کی طرف دیکھا اور بولی:

''مجھ سے کچھ کہا آپ نے؟''

رضا نے نفی میں سر ہلایا اور باہر نکل آیا۔ وہ عظیم الشان محل کو غور سے دیکھ رہا تھا اور طماس کی قسمت پر رشک کر رہا تھا' لیکن خیالوں میں چاندنی سما گئی تھی۔

☆ آکاش مسلسل تین دن سے غائب تھا اور ماسی جانو کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ وہ بار بار اس کے موبائیل پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتی لیکن ہر بار یہی جواب ملتا تھا۔ پلیز ٹرائی لیٹر۔ نجانے کہاں چلا گیا ہے میرا لعل۔ اللہ کرے وہ خیریت سے ہو۔ کہیں انہوں نے میرے بیٹے کا حال بھی مانی جیسا نہ کر دیا ہو۔ کون لوگ ہیں وہ۔ لگتا ہے کوئی انتہائی ظالم شخص ہے جس نے مانی کی ٹانگیں توڑ دی ہیں اور دوسرے لوگوں کو اغوا کر لیا ہے۔

اللہ اپنا فضل کرنا۔ میرے بچوں کو خیریت سے اپنی پناہ میں رکھنا۔ وہ ان تمام بچوں کے لیے پریشان تھی۔ حالانکہ اُس کا کسی کے ساتھ بھی کوئی خونی رشتہ یا کوئی تعلق نہ تھا۔

لیکن وہ سگی ماں کی طرح پریشان تھی۔ بس آجا کے اُس نے آکاش کی پرورش کی تھی اور وہ کن حالات میں اس کی گود میں آیا تھا' ماسی جانو ان حالات کو سوچ کر ہی پریشان ہوجاتی تھی۔ ماسی نے سگی ماں کی طرح اس کو اپنی گود کی گرمی اور نرمی دی تھی۔ آکاش بھی اُسے اپنی سگی ماں سمجھتا تھا' لیکن ایک دن ماسی نے خود ہی آکاش کو بتا دیا کہ میں تمہیں یتیم خانہ سے لے کر آئی تھی۔ میں بے اولاد تھی لیکن میں نے تمہیں اولاد کی طرح پالا پوسا ہے' میرا بچہ! تو مجھے چھوڑ کر مت جانا۔ ماسی نے اُسے اچھے سے سکول میں داخل کروایا تھا۔ پھر کالج میں بھی۔ آکاش اچھے نمبروں سے پاس ہوتا آیا تھا۔ اس نے بی کام کیا تھا۔ بس کالج دور سے ہی وہ غلط سوسائٹی میں پڑ گیا تھا۔ چوری' راہزنی اور ڈکیتی کی چھوٹی چھوٹی وارداتیں اس کا معمول تھیں اور پھر تعلیم مکمل کرنے کے بعد اُس نے ان عادتوں کو معمول بنالیا۔ اس کا نظریہ تھا کہ کسی سے مت مانگو بلکہ چھین لو ورنہ دنیا تمہیں اچھی زندگی سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کر دے گی۔ بس وہ اپنی مرضی سے زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے شہر میں اپنے نام کی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ بڑے بڑے سرمایہ دار اس کے نام سے خوف کھاتے تھے۔ بس یہی خوف اُسے پسند تھا۔ غنڈہ گردی اور بدمعاشی میں اس کا جواب نہ تھا۔ حشمت علی جو کہ آکاش کا سگا باپ نہ تھا لیکن اس نے بھی محبت اور لاڈ پیار سے اسے پالا تھا لیکن اس کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ کینسر کی وجہ سے جلد ہی اس دنیا سے چلا گیا۔ وہ ایک کروڑ پتی آدمی تھا۔ لاکھوں کی جائیداد تھی۔ لاکھوں روپے بینکوں میں پڑے ہوئے تھے۔ کئی مکان' زمینیں اور شاپنگ پلازے تھے۔ ماسی جانو سے شادی کرنے کے بعد اس نے تمام جائیداد ماسی جانو کے نام کر دی تھی۔ ان دونوں کا پیار مثالی تھا اور لوگ جلا کرتے تھے۔ ماسی ایک گریس فل شخصیت تھی اور چوہدری حشمت علی بھی نوجوانی میں جب بن ٹھن کر گھر سے باہر نکلتے تو کئی لڑکیاں ٹھنڈی آہیں بھرتی تھیں' لیکن ان کی سوئی اٹکی ہوئی تھی کہ وہ شادی صرف جانو سے ہی کریں گے۔ گھر اور خاندان کی مخالفت کی وجہ سے انہوں نے تمام خاندان سے اپنا ناطہ توڑ لیا تھا۔ کیونکہ ان کے خاندان میں کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ حشمت کی شادی جانو سے ہو' لیکن حشمت علی خود مختار اور دولت مند تھے' کسی کی ایک نہ چلی اور جانو اس گھر میں دلہن بن کر آ گئی۔

ماسی کو فون کی گھنٹی سے محسوس ہوا کہ وہ ایک ہی جگہ کافی دیر سے بیٹھی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ فون اٹھانے پر دوسری طرف سے مانی کی آواز سنائی دی۔

''ماسی' میں ہسپتال سے بول رہا ہوں۔ کیسی ہیں آپ؟''

''پتر! میری فکر چھوڑ' تو ٹھیک تو ہے نا۔ پتر! کیا آکاش وغیرہ کا کوئی پتہ چلا؟'' ماسی نے اپنی پریشانی ظاہر کی۔

''ماسی! آپ ایسا کریں' تھانے میں جا کر رپورٹ لکھوائیں' علی شیر آکاش کا دوست ہے۔ وہ اُن کا کوئی نہ کوئی سراغ لگا لے گا۔ آپ مزید پریشان ہونے کی بجائے ابھی جائیں۔''

خدا حافظ کہہ کر مانی نے فون بند کر دیا تھا۔

ماسی بھی ریسیور رکھ کر خود ہی بڑبڑاتی ہوئی گھر سے باہر نکلی۔

''یہ تو مجھے خود ہی سوچنا چاہیے تھا' میں بھی سٹھیا گئی ہوں۔'' وہ آکاش کی گاڑی میں بیٹھ کر تھانہ رضا آباد جا پہنچی۔ وہ پہلی بار تھانہ آئی تھی۔ کوئی بھی سپاہی یا حوالدار اُسے جانتا نہ تھا۔ وہ سیدھی انسپکٹر علی شیر کے کمرے میں جا پہنچی۔

علی شیر نے اس پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور کوئی فائل دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ ماسی ایک خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''تمہارا نام علی شیر ہے؟''

''جی ماں جی! فرمائیے کیا کام ہے آپ کو؟'' علی شیر نے فائل بند کر دی اور پوری توجہ ماسی کی جانب مبذول کر دی۔

''پتر! میرا بیٹا گم ہو گیا ہے۔ تین دن سے لاپتہ ہے۔ لگتا ہے کسی نے اُسے اغوا کر لیا ہے۔''

ماسی کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔

''آپ رپورٹ لکھوائیں۔ کتنی عمر تھی بچے کی اور نام کیا ہے؟''

''آکاش.........'' ماسی نے نام کیا بتایا علی شیر چونک کر کرسی سے اُٹھا۔

''کون آکاش؟'' اس نے ٹیڑھی آنکھ سے ماسی کی جانب دیکھا۔

''وہی آکاش جو تمہارا دوست ہے اور جس کی بدولت تم اس کرسی پر بیٹھے ہو۔ میں اُس کی ماں ہوں۔''

"ماں! آکاش کی ماں! لیکن............؟" علی شیر کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر زوردار قہقہہ لگایا اور ہنستے ہوئے بولا۔

"ماں جی! آپ آکاش کی ماں ہو اور حیرت ہے کہ پریشان بھی ہو۔ وہ تو ایسا پرندہ ہے جس کے اگر پر بھی کاٹ دیئے جائیں تو وہ صیاد کے جال کو بغیر پروں کے ہی لے اُڑے۔ وہ عقاب ہے عقاب! ضرور کسی لمبے چکر میں ہوگا۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں۔"

ابھی یہ باتیں جاری تھیں کہ خلافِ توقع ایس پی صاحب علی شیر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ علی شیر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں ایڑیاں جوڑ کر ایس پی صاحب کو سلیوٹ کیا۔

"سر! آپ یہاں؟ میرا مطلب ہے آپ مجھے بلا لیتے۔" علی شیر حیران ہوتے ہوئے بولا۔

"ہاں، وہ علی شیر! مجھے اچانک آنا پڑا۔ تم ان کی بات سُن کر میرے کمرے میں آنا۔ اور ہاں وہ سرخ فائل بھی لیتے آنا۔" وہ باہر جانے لگے تو اُن کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی چھڑی۔ گر گئی اور گری بھی ماسی جانو کے قدموں کے قریب۔

علی شیر چھڑی پکڑنے کے لیے آگے بڑھا' لیکن اس سے پہلے ہی ماسی نے وہ چھڑی اٹھا کر ایس پی صاحب کو پکڑا دی۔ ایس پی صاحب نے چھڑی پکڑ کر شکریہ ادا کیا اور ماسی کو غور سے دیکھنے لگا اور کچھ سوچنے لگا۔ اور بولا: "آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔" لیکن ماسی جانو جلدی سے وہاں سے جانے لگی تو ایس پی صاحب کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور انہوں نے ماسی کا راستہ چھڑی سے روکتے ہوئے کہا:

"پچیس سال بعد آپ کو دیکھ کر لگا کہ طوائف کبھی بوڑھی نہیں ہوتی صنم بائی۔"

☆..........☆

خیر دین گزشتہ کئی دنوں سے کھویا کھویا سا لگ رہا تھا۔ کسی سے کوئی بات نہ کرتا تھا اور رضا کے ساتھ بھی بس کم ہی گفتگو ہوتی تھی۔ وہ جلد سونے کا بہانہ کر کے لیٹ جاتا اور کمبل چہرے پر لے کر ماضی کو سوچتا رہتا۔ حیران ہو رہا تھا کہ تجلی اس شہر میں کیا کر رہی ہے اور یہ راجہ سلیم کون ہے! وہ تجلی کے ساتھ کیسے شادی کر سکتا ہے؟ خیر دین کو اپنے بیٹے کی یاد بھی آ گئی جو تجلی کی کوکھ سے پیدا ہوا تھا اور پھر کراچی میں ہی رہ گیا تھا۔ وہ تجلی سے

مل کر سب کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ اس شہر میں کیسے آ گئی؟ راجہ سلیم کون ہے؟ اُس کا بیٹا کہاں ہے؟ لیکن وہ ایک بار پھر اپنی تسلی کرنا چاہتا تھا کہ وہ واقعی تجلی ہے' لیکن اُسے کہاں سے ڈھونڈے اور یہ ڈھونڈنا بھی مشکل نہ تھا۔ راجہ سلیم ایک مشہور سیاستدان تھا۔ وہ بآسانی اُس کے محل تک پہنچ سکتا تھا اور تجلی سے مل سکتا تھا۔ وہ کئی دن اسی اُدھیڑ بُن میں رہا کہ کیا وہ رضا کو سب کچھ بتا دے کہ اصل میں خیر دین کون ہے اور رضا کون ہے؟ رضا کی ماں کون ہے؟ کہاں ہے اور کیوں ہے؟ زندہ ہے یا مر گئی ہے۔ اگر مر گئی ہے تو کہاں دفن ہے؟ اگر زندہ ہے تو کہاں ہے؟ یہ خیر دین جانتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ اگر رضا کو سب کچھ بتایا تو تجلی بیگم کا مسئلہ بھی سر اٹھائے گا۔ طرح طرح کے سوالات اور خدشات اُس کے دل و دماغ میں جنم لے رہے تھے۔ وہ ہر خیال کو جھٹلا دیتا۔ بالآخر تمام خدشات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس نے سب سے پہلے راجہ سلیم سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس روز وہ حسبِ معمول اسٹیشن پر بھیک مانگ رہا تھا کہ ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی خوبصورت کار سے اُترے اور خیر دین کے پاس آ کر رُک گئے اور لڑکا چونک کر اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا جیسے وہ خیر دین کو کچھ دینا چاہتا ہو' لیکن اُس نے لڑکی کو مخاطب کر کے کہا:

"چاندنی! تم یہیں ٹھہرو۔ میں اپنا موبائل گاڑی میں بھول آیا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ واپس گاڑی کی طرف مڑا اور لڑکی وہیں کھڑی رہ گئی۔ خیر دین نے آگے بڑھ کر اپنا کشکول لڑکی کے سامنے کر دیا۔

"معاف کرنا بابا جی" لڑکی نے یہ فقرہ کہہ کر منہ دوسری طرف کر لیا تھا لیکن خیر دین کو بجلی کا جھٹکا سا لگا تھا۔ اس نے گھوم کر لڑکی کے سامنے آ کر غور سے اسے دیکھا تو وہ بڑبڑانے لگی۔

"یہ گورنمنٹ بھی پتہ نہیں کیا کرتی پھرتی ہے۔ ان پیشہ ور بھکاریوں کو تو گرفتار کرے۔" وہ ہوبہو تجلی کی جوانی تھی اور بات کرنے کا انداز اور آواز بھی تجلی سے ملتی جلتی تھی۔ خیر دین نے خود کو کوسا کہ نجانے اُسے کیا ہو گیا ہے۔ ہر لڑکی تجلی کی جوانی اور ہر عورت تجلی نظر آتی ہے۔ ہو نہ ہو یہ تجلی کی بیٹی ہے یا رشتہ دار ہے۔ اتنی دیر میں لڑکا واپس آ گیا تھا۔ اس نے آتے ہی فقیر کو پانچ کا نوٹ پکڑایا اور لڑکی کو لے کر چلا گیا۔ خیر دین بھی ان کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر دوسرے پلیٹ فارم پر چلنے

گئے تو خیر دین نے نیچے سے ہی پٹڑیوں کو کراس کرنا شروع کر دیا۔ اُسے کوئی ہوش نہ تھا کہ دیہاڑی ضائع ہو رہی ہے۔ اُسے تو بس یہی پتہ کرنا تھا کہ یہ لڑکی تجلی کی ہم شکل ہے یا اُس کی بیٹی ہے۔ ہم شکل تو نہ تھی لیکن تجلی سے بہت ملتی جُلتی تھی۔ وہ ان لوگوں کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ پلیٹ فارم پر کافی رش تھا۔ لوگ کراچی سے آنے والی ٹرین کے منتظر تھے جو کہ لاہور سے پشاور جاتی تھی۔ کچھ مسافر پشاور کی طرف جانے والے تھے اور کچھ کراچی سے آنے والوں کو ریسیو کرنے آئے تھے۔ چاندنی اور احمد طماس بھی انہی لوگوں میں شامل تھے۔ لڑکا بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ خیر دین اُن سے اتنی دور تھا کہ وہ اسے دیکھ نہ سکیں، لیکن خیر دین انہیں دیکھ رہا تھا۔ اتنی دیر میں ٹرین آ گئی اور لوگوں کے رش میں مزید اضافہ ہو گیا۔ لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور کئی لوگ اپنا سامان اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ قلیوں کی بھی چاندی ہو رہی تھی۔ الغرض بھاگم بھاگ میں وہ لوگ بھی ایک بوگی کی طرف بڑھے جو کہ ایئر کنڈیشنڈ پارلر کی تھی۔ اس میں سے مسافر اُتر رہے تھے۔ تھوڑے سے مسافروں کے بعد ایک نوجوان لڑکی اُتری جس کے ہاتھ میں ایک سفری بیگ تھا، جس میں ظاہر ہے کپڑے ہوں گے۔ طماس نے اُسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا تو چاندنی نے بھی ہاتھ ہلایا بلکہ آگے بڑھ کر اس لڑکی کو آپی کہہ کر اس سے لپٹ گئی اور آنے والی لڑکی نے اس کا ماتھا چوما۔ ''میری جان! کیسی ہو تم؟''

اور پھر بھائی کا ماتھا چوما۔ ''کیسے ہو طماس؟''......اور ساتھ ہی بیگ طماس کو تھما دیا۔

''ٹھیک ہوں آپی! آپ سنائیں کیسی ہیں؟''

''بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ باتیں کرتے جا رہے تھے اور خیر دین اُن کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ سیڑھیوں کی طرف چل دیئے اور خیر دین بھاگ کر ایک بار پھر پٹڑیوں کو پھلانگتا ہوا اپنی جگہ پر پہنچ گیا۔ وہ ان لوگوں کی گاڑی کے پاس کھڑا ہو کر مانگنے لگا اور کنکھیوں سے ادھر بھی دیکھ رہا تھا جس طرف سے انہوں نے آنا تھا۔ مسافر آ جا رہے تھے۔ ٹیکسی اور رکشا والے مرضی کے کرائے وصول کرنے میں مگن تھے۔ اتنی دیر میں وہ لوگ چلتے ہوئے آئے اور گاڑی میں بیٹھنے لگے تو خیر دین نے اپنا سوال دہرایا۔ ''اللہ کے نام پر بیٹا، فقیر کی کچھ مدد کر دو۔''

آنے والی لڑکی پچھلی سیٹ پر بیٹھنا چاہتی تھی کہ پھر باہر آ گئی اور فقیر سے بولی:

''باباجی! آپ صدقے کے پیسے لے لیتے ہیں؟''

اس سے پہلے کہ خیر دین کچھ بولتا، چاندنی بول پڑی:

''کاجل آپی! ابھی تو طماس بھائی نے اسے پانچ روپے دیئے ہیں۔ ان لوگوں کو اتنا سر پر مت چڑھائیں۔''

لڑکی جس کا نام کاجل لیا گیا تھا، بولی:

''دراصل مجھے تمہارے بارے میں کئی دنوں سے غلط غلط خواب آ رہے تھے۔ میں تم دونوں کا صدقہ اتارنا چاہتی ہوں۔ کسی اور کو بھی تو دینا ہے کیوں نہ اس فقیر کو ہی دے دیں۔ باباجی آپ نے جواب نہیں دیا؟''

''بیٹی! ہم فقیر لوگ آپ جیسے امیر لوگوں کا صدقہ ہی کھاتے ہیں۔ آپ کے ہاتھ سے ملی ہوئی خیرات ہمارے لیے تمہارا صدقہ ہی ہوتی ہے۔''

''یہ لو باباجی!'' اس نے سو روپے کا نیا نوٹ نکال کر اپنے بھائی اور بہن کے سر سے وار کر خیر دین کے کشکول میں ڈال دیا اور بولی: ''آپ بھکاری نہیں لگتے۔'' یہ کہہ کر وہ گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے اور خیر دین سوچ میں ڈوبا رہا۔

''یہ تجلی کے بچے ہیں۔ دو بیٹیاں، ایک بیٹا۔ کاجل، چاندنی، احمد طماس! یہ یقیناً تجلی کے بچے ہیں۔ اس کا بیٹا کہاں ہے؟ جو تجلی کے پاس تھا۔ کیا طماس ہی اس کا بیٹا ہے۔ یہ دو بیٹیاں احمد سلیم کی ہوں گی۔'' وہ خود ہی بڑبڑا رہا تھا اور ایک بار احمد سلیم سے ملنا چاہتا تھا۔ اسی طرح گومگو میں دو دن گزر گئے۔ کوئی تدبیر کارگر نہ ہو سکی۔ وہ اسی طرح اپنی دھن میں بھیک مانگ رہا تھا کہ اُس کا ساتھی فقیر اس کے پاس آیا اور اخبار میں لپٹے ہوئے چاول اس کے آگے کر دیئے۔

''لے خیر دین، کھا لے۔'' وہ خود بھی کھا رہا تھا۔

''اوئے گدھے! یہ اخبار تو نیا لگتا ہے۔ اس پر کوئی چیز نہ کھایا کر۔ کیونکہ تو کھا کر پھینک دے گا۔ اس پر اللہ میاں کا نام لکھا ہوتا ہے۔'' خیر دین نے اس کے ہاتھ سے چاول لے کر کھانے شروع کر دیئے۔

''اوئے خیر دین! یہ تُو پڑھے لکھوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔''

''تجھے معلوم نہیں ہے' میں نے بی اے کیا ہے' کسی کو بتانا نہیں۔'' خیر دین نے اس کے کان میں کہا۔

''میں نے بھی دو بی اے کیے ہیں' تو بھی کسی کو بتانا نہیں۔'' دوسرے فقیر نے بھی خیر دین کی طرح راز دارانہ لہجے میں کہا تو دونوں ہنس پڑے۔ ہنستے ہنستے خیر دین کی نگاہ اخبار پر پڑ گئی جس میں خبر تھی۔

راجہ سلیم ایم این اے اپنی کوٹھی میں کھلی کچہری لگائیں گے اور غریب عوام کے مسائل موقع پر حل کرنے کے احکامات جاری کریں گے۔ خیر دین کی ہنسی بند ہو گئی تھی۔ دوسرا فقیر حیرت سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ ''کیا ہوا خیر دین! چاول اور لا دوں تجھے' یار تُو تو پریشان ہو گیا ہے۔ لپے بھر بھر کے تو کھا رہا تھا۔ ختم ہی ہونے تھے۔ اب پریشان ہو گیا ہے۔'' وہ ایک طرف صدا لگاتا ہوا چل پڑا۔

خیر دین نے باقی تفصیل پڑھی تو پتہ چلا کہ کل کی تاریخ ہے کھلی کچہری کے لیے۔ وہ بھی جائے گا' ضرور جائے گا' لیکن اس حلیے میں اُسے محل میں کون داخل ہونے دے گا۔ وہ اس حلیے میں نہیں جائے گا۔ وہ نئے کپڑے پہن کر جائے گا۔ ہاں نئے کپڑے پہن کر جائے گا۔ وہ گھر کی طرف چل پڑا۔ اگلے دن صبح کے ناشتہ پر وہ چاہتا تھا کہ رضا کالج چلا جائے پھر وہ راجہ سلیم کے محل جائے گا۔ اگر وہ حلیہ بدل کر گیا تو رضا خوامخواہ ہی تفصیل پوچھے گا اور وہ ابھی رضا کو کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ رضا چلا گیا تو خیر دین نئے کپڑے پہن کر باہر نکلا۔ اس نے گھر کو تالا لگایا اور بس سٹاپ کی طرف چل دیا۔ کپڑے استری کیے ہوئے تھے اور سلیقے سے بالوں کو کنگھی کی ہوئی تھی۔ وہ بس میں سوار ہو کر ایک سٹاپ پر اُترا اور دوسری بس میں بیٹھ گیا جو راجہ صاحب کے محل کی طرف جاتی تھی۔ محل کے قریب بس نے اُسے اتارا تو وہ باوقار انداز میں چلتا ہوا محل کی طرف چل پڑا۔ گیٹ پر دو محافظ مستعد کھڑے تھے۔ انہوں نے خیر دین کی جامہ تلاشی لی اور اندر بھیج دیا۔ اندر کافی رش تھا۔ خیر دین نے ایک نظر محل کی جانب دیکھا تو واقعی اُسے احساس ہوا کہ وہ کسی راجہ کے محل میں آ گیا ہے۔ اس راجہ کے محل میں جو کتابوں میں ہوتے ہیں۔ لوگ قطار بنا کر لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پولیس والے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ راجہ صاحب ابھی اندر سے نہ آئے تھے' لوگ ان کا انتظار کر رہے تھے۔

''تجلی بیگم' بہت اونچا ہاتھ مارا ہے تم نے!'' اُس نے من ہی من میں سوچا۔

خیر دین بھی ایک قطار میں کھڑا ہو گیا جس میں دوسری قطاروں کی نسبت قدرے کم لوگ تھے۔ وہ چاروں طرف دیکھ کر محل کا جائزہ لے رہا تھا۔

تقریباً دس کنال پر تو بنا ہو گا یہ محل۔ لان کتنا خوبصورت تھا۔ محل کی عمارت' کھڑکیاں' دروازے غرض کہ ہر چیز خوبصورت لگ رہی تھی' کیونکہ ان چیزوں کا تعلق تجلی سے تھا۔ اتنی دیر میں سپاہی نے آ کر قطاریں سیدھی کرنے کو کہا کیونکہ راجہ صاحب آ رہے تھے۔

خیر دین کو اپنے کسی مسئلے کے لیے راجہ صاحب سے نہ ملنا تھا بلکہ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ راجہ کون ہے جس نے تجلی سے شادی کی ہے۔ اور ساتھ ساتھ وہ تجلی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بھی بے چین تھا' لیکن تجلی اتنے مردوں کے بیچ کہاں آئے گی۔ یہ کچہری تو راجہ صاحب نے لگائی ہے' تجلی کا کیا کام۔ وہ خود ہی سوال کر رہا تھا اور خود ہی جواب دے رہا تھا۔ بے شک یہ کچہری راجہ صاحب نے سیاسی دکانداری چمکانے کے لیے لگائی ہے۔ لیکن تجلی بیگم ایسی عورت ہے جو مردوں سے پردہ نہیں کرتی تھی۔

راجہ صاحب تشریف لائے تو نعروں سے محل کا لان گونج اٹھا۔ خیر دین نے ان کی جھلک دیکھنا چاہی مگر رش بہت زیادہ تھا۔ لوگ یک دم محل کے داخلی دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پولیس والے انہیں قطاروں میں بیٹھنے کے لیے کہہ رہے تھے بلکہ پکڑ پکڑ کر قطاروں میں بٹھا رہے تھے۔ اسی کش مکش میں خیر دین نے بالکل آگے جگہ بنا لی تھی۔ لوگوں کا رش کم ہوا تو قطاریں دوبارہ بننا شروع ہو گئیں۔ اور جب راجہ صاحب لوگوں کے جھرمٹ سے نکلے تو خیر دین کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ راجہ سلیم کو غور سے دیکھ رہا تھا اور راجہ سلیم لوگوں کے نعروں کا جواب دے رہے تھے۔ خیر دین کے لیے آج کے دن کا سب سے بڑا جھٹکا تھا۔ راجہ سلیم...... تجلی جس کی بیوی تھی' کاجل' چاندنی اور طماس جس کی اولاد تھے' وہی راجہ سلیم جو حکومتی ایم این اے تھا' جس کا بہت نام تھا' وہ راجہ سلیم نہیں تھا بلکہ راجہ سلیم بن گیا تھا' کیسے بن گیا تھا۔ یہ اس سے پوچھنا پڑے گا۔ وہ تو خیر دین کا بھائی تھا' سگا چھوٹا بھائی............ ملک شیر علی...... اور خیر دین حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ اُسے تمام کھلی کچہریاں بھول گئی تھیں۔

''میرا بھائی ملک شیر علی..........'' وہ بڑبڑایا۔

☆..............☆

آکاش اور ساتھیوں کے ہاتھ سے کپ چھوٹتے چھوٹتے بچے تھے۔ ان کے سامنے فوج کا جنرل بیٹھا ہوا تھا۔ اور تو اور آکاش نے اس کی ناک توڑ دی تھی‘ لیکن یہ بے خبری میں ہوا تھا۔

”حیرت تو ہوئی ہوگی تمہیں!“ انہوں نے آکاش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں ذہنی طور پر ڈسٹرب ہوگیا ہوں سر! میں اُن گتھیوں کو نہیں سلجھا سکا جو سکندر ہوٹل سے یہاں تک میرے ساتھ بیت رہی ہیں۔ آپ ایک جنرل ہیں اور ظاہری بات ہے حاضر سروس ہوں گے کیونکہ یہ لوگ آپ کو سلیوٹ کر رہے ہیں۔ آپ ایک جنرل ہو کر میرے ساتھ سکندر ہوٹل کے تہہ خانہ میں کیا کر رہے تھے جبکہ میری حالت ایک قیدی کی تھی اور آپ ان غیر ملکی لوگوں کے سربراہ تھے۔“

وہ زیرِلب مسکرائے اور بولے۔ ”میں جانتا تھا کہ تم یہ سوال پوچھو گے۔ تم سچے ہو اور جھوٹا میں بھی نہیں ہوں۔ میں تمہیں تمام بات بتاتا ہوں کہ تمہیں یہاں کیوں بلایا گیا ہے۔ ایک جنرل کو ایک سڑک چھاپ کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔ معاف کرنا بات ہی ایسی ہے۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تم نے بہت سے غلط کام کیے ہیں۔ اس شہر کی پولیس بھی تمہارے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ تم بدمعاشی کرتے ہو‘ غنڈہ گردی‘ آوارہ گردی‘ جگا ٹیکس اور کئی ایسی ہی وارداتوں میں ملوث ہو۔ یہ چھوٹے چھوٹے کام کر کے تمہیں کتنا ملتا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ پچاس ساٹھ ہزار ماہانہ جبکہ میرا کام کرو گے تو میں تمہیں لاکھوں میں نہیں کروڑوں میں تول دوں گا۔ یہ میرا ذاتی کام نہیں ہے۔ اس ملک کی بقا اور سالمیت کو درپیش خطرے کو دور کرنے کا کام ہے۔ مجھے ایک ایسے شخص کی تلاش تھی‘ جو یہ کام کر سکے۔ اتفاق سے غیر ملکی لوگوں نے تمہاری نشان دہی کر دی اور میری نگاہ تم پر ٹِک گئی۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ سب سے پہلے تو آپ لوگ کھانا کھائیں۔ اور ہاں آکاش! تم اپنے گھر فون کر کے کہہ دو کہ تم خیریت سے ہو اور دو ایک روز میں آؤ گے۔ پلیز‘ یہ میرا حکم نہیں ہے‘ بلکہ درخواست ہے۔“ یہ کہہ کر جنرل صاحب باہر نکل گئے۔

شمع اٹھ کر آکاش کے پاس آئی اور بولی۔

”ماسی تمہارے لیے پریشان ہوں گی اُنہیں فون کر دو۔ ڈیڈی نے پہلی بار کسی سے درخواست کی ہے۔“ آکاش نے چونک کر شمع کی طرف دیکھا۔

”ڈیڈی! جنرل صاحب تمہارے ڈیڈی ہیں؟“

”جی جناب!“ اُس نے خاص دلربائی والا انداز اپنایا اور جونیئر سے بولی۔

”جونیئر! تم ان لوگوں کو نیچے لے جاؤ۔ کھانے کا بندوبست کرو‘ میں اور آکاش آتے ہیں۔“

وہ لوگ بھی حیران تھے‘ لیکن جنرل صاحب کی دہشت سے خاموش تھے۔ وہ شمع اور آکاش کے تعلق کو جانتے تھے‘ لیکن اب شمع سے اور بھی مرعوب ہو گئے تھے۔

وہ جونیئر کے ساتھ چلتے ہوئے نیچے اُتر گئے۔ آکاش نے فون کرنے کے لیے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ شمع نے اُس کی پریشانی سمجھتے ہوئے اپنا موبائل دے دیا۔ اس نے گھر کا نمبر ڈائل کیا تو ماسی کی آواز سنائی دی۔

”ہیلو۔ کون ہے؟ آکاش پُتر تُو ہے؟“ وہ کتنی بے چین تھی۔ آکاش کو بہت احساس ہوا کہ میری وجہ سے ماسی کتنی پریشان ہے۔

”ہاں ماسی! میں ہوں آکاش‘ تیرا بیٹا!“ آکاش بھی جذباتی ہو گیا تھا۔

”بیٹا کہاں ہو تم؟ میں بہت پریشان ہوں۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں ماسی! آپ بے فکر رہیں۔ میں دو دن تک گھر پہنچ جاؤں گا اور ہاں باقی تمام لڑکے بھی میرے ساتھ ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ ہسپتال جا کر مانی کی دیکھ بھال کریں‘ ٹھیک ہے!“

”ٹھیک ہے بیٹا! گھر واپس آ۔ میں تجھ سے بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”اچھا ماسی! میں پرسوں آؤں گا۔ خدا حافظ!“ اِدھر سے فون بند کر کے آکاش نے موبائل شمع کو دینا چاہا تو وہ کمرے میں نہ تھی بلکہ آکاش اکیلا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ جنرل اس سے کون سا کام لینا چاہتا ہے اور یہ شمع جنرل کی بیٹی ہے۔ ماسی کون سی ضروری بات کرنا چاہتی ہے؟ کتنی اُلجھنیں تھیں جنہوں نے اُسے گھیر رکھا تھا۔

شمع نے کبھی ذکر نہ کیا تھا کہ وہ جنرل کی بیٹی ہے بلکہ وہ تو بتاتی تھی کہ اس کے والد شہر کے بڑے بزنس مین ہیں۔ کروڑوں کا کاروبار ہے‘ یہاں تو کہانی ہی الگ تھی۔

"آیئے آکاش صاحب! کھانا تیار ہے۔ کھانا کھا لیجیے۔" جونیئر نے اوپر آ کر اُسے پکارا۔

وہ چلتا ہوا نیچے اُتر گیا۔ نیچے تو علیحدہ ہی ماحول تھا۔ کارپٹ بچھے ہوئے فرش تھے۔ بہت بڑا ہال تھا۔ جگہ جگہ خوبصورت صوفے پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف ڈائننگ ہال تھا۔ ٹیبل پر طرح طرح کے پکوان چنے ہوئے تھے۔ تمام لوگ بیٹھ چکے تھے' صرف آکاش کا انتظار تھا۔ آکاش کے آتے ہی کھانا شروع کر دیا گیا۔ جنرل صاحب وہاں موجود نہ تھے جبکہ شمع نے بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ کر کھانا کھایا۔ بعد میں چائے کا دور چلا اور پھر جنرل صاحب نے انہیں بلاوا بھیجا کہ وہ اُوپر آ جائیں۔ جونیئر کی سربراہی میں چلتے ہوئے یہ لوگ اوپر اسی ہال میں آ گئے۔ جنرل صاحب کے سر پر سفید ٹوپی تھی۔ شاید اس عرصہ میں وہ نماز پڑھنے گئے تھے۔

تمام لوگ بیٹھ گئے تو جنرل صاحب گویا ہوئے۔

"آکاش! میں تمہاری تمام اُلجھنیں دور کرنے لگا ہوں۔ تمہارے ساتھ جو تمہارے ساتھی بیٹھے ہیں کیا یہ تمام لوگ تمہارے بھروسے کے ہیں؟" آکاش نے پہلے جنرل کی طرف اور پھر باری باری راجو' لالہ' رانا اور خانو کی طرف دیکھا جبکہ مانی ہسپتال میں تھا اور شیرو اس کی دیکھ بھال کے لیے مقرر تھا۔ اس نے بغیر کچھ کہے اثبات میں سر ہلا دیا' تو جنرل صاحب نے گُڈ کہہ کر بات شروع کی:

"مسٹر آکاش! میں نے آپ سے کہا کہ میرا نام جنرل شفیع خان ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ میرا نام جنرل شفیع خان ہے لیکن یہ جنرل کا لفظ آرمی کا نہیں ہے بلکہ کاروباری لوگوں نے یہ نام مجھے دیا ہے۔ کاروباری حلقہ میں تمام لوگ مجھے جنرل کہتے ہیں کیونکہ اللہ کی رحمت سے میرا کاروبار بہت وسیع ہے اور ایک اچھا نام ہے میرا۔ یہ لوگ جو مجھے سلیوٹ کرتے ہیں' ان کی محبت ہے۔ یہ تمام میرے ملازم ہیں لیکن میں نے انہیں بھائیوں کی طرح رکھا ہے۔ یہ بھی مجھے بڑا بھائی سمجھتے ہیں لہٰذا اپنے دل و دماغ سے فوجی جنرل کا پریشر اُتار دو۔"

جنرل صاحب مسکرا کر بتا رہے تھے اور آکاش کو غصہ آ رہا تھا۔

"آکاش! خداوند کریم نے جب مجھے دوسری بیٹی عطا کی تو میری بیوی یعنی شمع کی

والدہ وفات پا گئیں۔ بڑی بیٹی تین سال کی جب کہ چھوٹی بیٹی صرف ایک سال کی تھی' خدا کی یہی مرضی تھی۔ میں رضائے الٰہی پر تکیہ کیے ہوئے ان بچیوں کی پرورش میں لگ گیا۔ کاروبار بہت زیادہ تھا۔ کئی لڑکیاں مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھیں لیکن میں جانتا تھا کہ یہ شادی مجھ سے یا میری بیٹیوں کی دیکھ بھال کے لیے نہیں بلکہ میری جائیداد اور دولت کے لالچ میں کی جا رہی ہے۔ لہٰذا میں نے ان بچیوں کی پرورش اور اچھی دیکھ بھال کے لیے کسی سے شادی نہ کی۔

میں اپنی بچیوں پر سوتیلی ماں نہیں لانا چاہتا تھا۔ ان کی ماں اور باپ میں ہی تھا۔ میں اپنی دنیا میں مگن ان بچیوں کی پرورش میں مشغول تھا۔ کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے مجھے ایک بیٹے کی ضرورت تھی بلکہ شدت سے کمی محسوس ہوتی تھی۔ اللہ سے دعائیں مانگتا رہا کہ میری ان بچیوں کے نصیب اچھے کرنا۔ دونوں میں تعلیم کی لگن دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اپنی اپنی کلاس میں نمبرز لیتی تھیں۔

مجھے بہت خوشی ہوئی جب میری بڑی بیٹی سحرش نے ایم اے انگلش کیا اور اچھے نمبروں سے اچھی پوزیشن لی۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ آج ان کی ماں زندہ ہوتی تو کتنا خوش ہوتی۔ سحرش اور شمع نے مجھ سے اپنے دل کی ہر بات کہی تھی اور مجھے اپنے دوستوں کی طرح سمجھتی تھیں۔ کبھی انہوں نے کوئی حد سے بڑھ کر فرمائش نہ کی تھی' لیکن کوئی بھی چیز ان کی زبان سے بعد میں نکلتی تھی اور میں کوشش کرتا تھا کہ اُسے پورا کروں۔ سحرش اپنی تعلیم مکمل کر چکی تھی اور مجھے فکر لاحق ہوئی کہ اس کی شادی کر دوں' لیکن یہ کام بہت کٹھن تھا۔ ان کی ماں زندہ ہوتی تو کوئی مسئلہ نہ ہوتا لیکن سحرش کے لیے لڑکا ڈھونڈنا میرے لیے یقیناً مسئلہ تھا۔ اچھے رشتے ڈھونڈنے کے لیے مجھے پریشانی تھی اور پھر ایک دن میری فلور ملز کے مزدوروں کا لیڈر میرے پاس آیا۔" یہ کہہ کر شفیع خان ماضی میں کھو گیا اور وہ سب لوگ بُت بنے کہانی سنتے رہے۔

"سر! ایس پی صاحب آئے ہیں اور ساتھ پولیس فورس بھی ہے۔" لیڈر نے بتایا جس کا نام قاسم تھا۔

میں نے کہا! "بلاؤ ایس پی صاحب کو۔ انہیں کیا ضرورت پڑ گئی میری اور پھر میری

ملز میں پوری فورس کے ساتھ!'' میں حیران تھا۔ ایس پی صاحب اندر داخل ہوئے۔ میں نے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔

''نہیں خان صاحب! میں بیٹھنے کے لیے نہیں آیا' بلکہ آپ کے آفس کی تلاشی لینے آیا ہوں۔''

''لیکن کیوں' اور کس سلسلہ میں اور کس قانون کے تحت؟'' میں یک دم چلا اٹھا۔

''ریلیکس رہیے مسٹر خان! آپ جانتے ہیں کہ میں ایک ایماندار پولیس آفیسر ہوں اور میں کبھی بغیر ثبوت' بغیر قانونی کارروائی اور بغیر کسی سلسلہ کے ایک اچھے اور بڑے کاروباری آدمی کو تنگ نہیں کرتا' کیونکہ آپ ایک بہت بڑے بزنس مین ہیں اور میں ایک اچھی پوسٹ پر ہوں اور اس سے پہلے ہم کلاس فیلو بھی رہے ہیں اور اچھے دوست بھی۔'' اس نے پُرسکون لہجے میں کہا تو مجھے شک پڑا کہ گیلانی میرے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ گیلانی ایک سُلجھا ہوا اور سیریس طبیعت کا آدمی ہے اور اتنا گھناؤنا مذاق نہیں کر سکتا۔

''گیلانی! میں جانتا ہوں کہ تم مذاق نہیں کرتے۔ اور بغیر کسی مقصد کے کہیں ریڈ نہیں کرتے' لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں ایک شریف النفس انسان ہوں اور اپنے کام سے کام رکھنے والا بندہ ہوں۔ کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کس سلسلہ میں تلاشی لینے آئے ہیں؟''

''ہاں کیوں نہیں؟ یہ پوچھنے کا اختیار آپ کو ہے۔ مجھے کسی نے بتایا ہے کہ آپ آٹے کی آڑ میں ہیروئن اسمگل کرتے ہیں۔'' یہ سنتے ہی مجھے پسینے آنے لگے کیونکہ گیلانی کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ ''اسی سلسلہ میں تلاشی لینے آیا ہوں اور یہ رہا سرچ وارنٹ حالانکہ مجھے وارنٹ کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی لیکن تمہیں بھی تو مطمئن کرنا تھا۔''

اس نے جیب سے سرچ وارنٹ نکال کر میز پر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے اُسے دیکھا بھی نہیں اور اُسے بے دلی سے کہا کہ وہ اپنا کام کر سکتا ہے۔ حالانکہ مجھے کوئی ڈر نہ تھا لیکن عزت' وقار اور مرتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کاروباری حلقہ میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل جائے گی کہ جنرل کی ملز پر پولیس ریڈ ہوا ہے۔ اس نے دو سپاہیوں کو اندر بلایا اور کہا کہ آفس کی تلاشی لو۔ دونوں سپاہی آفس کی

ایک ایک چیز اِدھر اُدھر کر کے دیکھتے رہے اور میرے ماتھے پر ندامت کے پسینے پھوٹتے رہے۔ کافی دیر کے بعد جب انہیں کچھ نہ ملا تو انہوں نے اپنے آفیسر کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیئے اور گیلانی نے انہیں جانے کا کہا۔

''تم لوگ باہر جا کر جیپ میں بیٹھو' میں آ رہا ہوں۔'' وہ دونوں چلے گئے۔

''یار خان! میں کبھی ناکام نہیں ہوا ہوں اور اس بار تو لگتا ہے کہ ناکامی میرا مقدر ہے۔ خیر تم اس سلسلہ میں بے قصور ہو۔ میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا' ذہنی کوفت ہوئی تمہیں اور تمہارا قیمتی وقت ضائع ہوا۔ اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ آئی ایم رئیلی ویری سوری فار اباؤٹ یور ڈسٹربنس اینڈ ویسٹ یور ٹائم۔ میں چلتا ہوں' خدا حافظ!'' وہ یہ کہہ کر چلا گیا اور دروازے میں کھڑا ہو کر بولا: ''چائے اور بسکٹ اُدھار رہے' پھر عنقریب ملیں گے۔''

دروازہ کھلا چھوڑ کر وہ چلا گیا اور میں پریشان تھا کہ میری ملز میں ہیروئن کی تلاشی کے لیے پولیس آ گئی۔ میں انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ انٹرکام کی بیل بجی' دوسری جانب یقیناً منیجر ہو گا لیکن یہ کیا' دوسری طرف سے گیلانی کی آواز تھی' جو یقیناً میرے منیجر کے آفس سے بول رہا تھا۔

''یار خان! جب تمہارے ماتھے پر پسینہ چمکتا ہے تو تم بڑے اچھے لگتے ہو۔ ابے اُلو میں نے تمہیں جو سرچ وارنٹ دکھایا تھا' اُسے تو کھول کر دیکھو۔ میں نیچے جیپ میں بیٹھا ہوں۔'' رابطہ ختم ہو گیا۔

گیلانی کی چہکتی ہوئی آواز نے مجھے وہ کاغذ فوراً کھولنے پر مجبور کر دیا۔ میں اپنی ٹینشن میں اس کاغذ کو بھول گیا تھا' جو گیلانی نے مجھے وارنٹ کے طور پر دیا تھا۔ یقیناً مجھے وہ کاغذ کھول کر دیکھنا چاہیے تھا۔

''ڈیئر شفیع خان! پرسوں بروز اتوار بمطابق 29 جنوری میری بیٹی کی منگنی ہے۔ تم اپنی بچیوں سمیت مجھے مطلوب ہو۔ شام آٹھ بجے میرے گھر پر تقریب ہو گی۔ اس سنگین مذاق کے لیے معذرت خواہ ہوں۔'' میں نے وہ کاغذ پڑھ کر فوراً کھڑکی سے باہر دیکھا تو گیلانی ٹوپی اُتار کر مجھے سلام کر رہا تھا اور ہنس رہا تھا۔ میں نے بھی ہنستے ہوئے اُسے مکہ لہرا کر دکھایا اور وہ چلا گیا۔

میں اور گیلانی کلاس فیلو تھے اور اچھے دوست بھی۔ دونوں ساتھ ساتھ پڑھے، جوان ہوئے۔ پھر وہ پولیس فورس کی طرف چلا گیا اور میں بزنس میں آ گیا۔ شادیوں کے بعد بچے ہوئے۔ بچے جوان ہو گئے اور آج میں سحرش کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہا تھا اور اس کی بیٹی کی منگنی تھی۔ وقت کتنی تیزی سے اُڑ گیا۔ پتہ ہی نہیں چلا تھا۔

سحرش اور شمع کے ساتھ میں گیلانی کی کوٹھی گیا تھا۔ وہاں سماں ہی اور تھا۔ تمام کوٹھی کو رنگین قمقموں سے سجایا گیا تھا۔ بیرونی دیوار پر ایسی لائیٹنگ کی گئی تھی کہ گماں ہوتا تھا، دیوار چل رہی ہے، کوٹھی کا لان بہت وسیع تھا جو کرسیوں اور ٹیبلوں سے بھرا پڑا تھا۔ کافی مہمان آ چکے تھے۔ گیلانی نے ہمیں گیٹ پر ویلکم کہا اور دونوں بچیوں کو سر پر پیار دیا اور بولا ''سحرش بیٹا! آپ تو کافی بڑی ہوگئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ نازی کی ہم عمر ہیں۔''

نازی گیلانی کی بیٹی کا نام تھا۔ سحرش فقط مسکرا کر رہ گئی۔

ہم لان میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اور بھی کئی فیملیز بیٹھی ہوئی تھیں۔ اتنی دیر میں مسز گیلانی ہمارے پاس آئیں۔ ان سے کافی فرینکنس تھی، لہٰذا آتے ہی برس پڑیں۔

''کیا آپ بھی خان بھائی مہمانوں کی طرح آئے ہیں!''

دونوں بیٹیوں نے اُٹھ کر سلام کیا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور سحرش اور شمع کو نازی کے پاس بھیج دیا اور خود میرے پاس کھڑی ہوگئیں۔

''بھابی! میں نے آپ سے ایک کام کہا تھا!'' میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''خان بھائی! وہ آپ کا کام نہیں بلکہ میری بیٹی کا کام ہے۔ اس سلسلہ میں گیلانی نے مجھ سے بات کی تھی۔ آپ فکر نہ کریں۔ دو ایک جگہ پر بات کی ہے بلکہ آج تو ایک فیملی کو سحرش کی جھلک بھی دکھا دیں گے۔ گیلانی کے دوست ہیں، وہ پوری فیملی انوائیٹڈ ہے۔ آپ بھی لڑکا دکھ لیجئے اور اُن سے مل لیجئے گا۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئیں۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سحرش کے لیے کچھ کام بنتا نظر آنے لگا ہے۔

لان مہمانوں سے بھر چکا تھا۔ بہت سے سیاسی لوگ اور سرکاری دفاتر سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی شامل تھے۔ دلہن کو تیار کر کے لایا گیا تھا۔ نازی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ پیازی رنگ کے لہنگا سوٹ میں اس کا حسن اور بھی نکھر گیا تھا۔ اُسے صوفے پر

بٹھایا گیا تھا اور سحرش اور شمع بھی ساتھ تھیں۔

اتنی دیر میں گیلانی میرے پاس آیا اور بولا

''آؤ خان! تمہیں ایک دوست اور اس کی فیملی سے ملاتا ہوں۔''

میں گیلانی کے ہمراہ چل پڑا۔ تین چار ٹیبل چھوڑ کر ایک فیملی بیٹھی ہوئی تھی۔ جس میں ایک مرد، ایک عورت، ایک لڑکا اور ایک لڑکی شامل تھے۔

وہ لوگ بھی گیلانی اور مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔

''ہاں تو خان بھائی! ان سے ملیئے، یہ میرے خاص دوست ہیں۔ مسٹر طاہر!''

اس نے مرد کی طرف اشارہ کیا تو اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے بھی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''یہ ہیں اُن کی مسز بھابی مائرہ۔'' عورت نے بھی سر جھکا کر میرے سلام کا جواب دیا اور پھر باری آئی لڑکے کی۔ ''یہ ان کا بیٹا فیصل اور ان کی بیٹی سونیا ہیں۔'' فیصل نے بھی سلام کیا اور سونیا نے بھی۔ لڑکا خوبصورت، ہینڈسم اور سمارٹ تھا۔

''اور محترم طاہر صاحب! یہ میرے دوست، کلاس فیلو اور خاص الخاص کاروباری شخصیت ہیں۔ ان کا نام شفیع خان ہے۔ کاروبار کافی وسیع ہے۔ کاروباری دنیا میں ان کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ لہٰذا لوگ انہیں جنرل شفیع خان کہتے ہیں۔'' گیلانی تعارف کروانے کے فن میں مہارت رکھتا تھا۔ ''آپ لوگ باتیں کریں، میں دوسرے مہمانوں کو دیکھتا ہوں۔''

گیلانی وہاں سے چلا گیا تو طاہر نے بات کا آغاز کیا۔

''آپ کاروبار کے سلسلہ میں فارن تو جاتے ہی رہتے ہوں گے۔''

''جی ہاں کئی مرتبہ بنکاک، تھائی لینڈ، یو کے اور ناروے جا چکا ہوں۔''

''کیا کبھی انڈیا گئے ہیں؟'' طاہر نے پوچھا تو میں چونک گیا۔

''جی کئی بار گیا ہوں۔ وہاں پر کاروباری نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ خواجہ غریب نواز حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ کے دربار کی زیارت کے لیے گیا ہوں۔''

''اب کبھی آئیں میرا مطلب ہے کبھی انڈیا جائیں تو ہمارے ہاں ضرور تشریف لائیے گا۔''

طاہر نے کہا تو میں پھر چونک گیا' کیونکہ ان کا تعارف تو کروایا گیا تھا لیکن یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ ان کا تعلق انڈیا سے ہے۔ کیا میں سحرش کی شادی انڈیا میں کر دوں۔ اتنی دُور......وہ مجھ سے دور رہ سکے گی؟ کیسے کوئی خیر خبر آیا کرے گی۔ میں سوچوں ہی سوچوں میں بہت دور نکل گیا تھا۔ میرے موبائیل کی بیل نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے دیکھا تو شمع کا نمبر تھا۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہی تھیں۔ میں نے انہیں بتایا تو وہ میرے پاس چلی آئیں۔ انہوں نے آتے ہی طاہر اینڈ فیملی کو سلام کیا اور خالی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔

''یہ میری بڑی بیٹی سحرش اور چھوٹی بیٹی شمع ہے۔ شمع بیٹی' یہ گیلانی انکل کے دوست ہیں۔ مسٹر طاہر اور یہ ان کی فیملی ہے۔'' میں نے بھی وہی تعارف کروایا جو گیلانی نے کروایا تھا۔ شمع' سحرش اور سونیا باتوں میں مصروف ہوگئیں جبکہ فیصل اور مسز طاہر کی نظریں بچیوں کا طواف کرنے لگیں۔ میں بھی کنکھیوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ بیٹی کی زندگی کا سوال تھا۔ میں بھی چاہتا تھا کہ سحرش اور فیصل ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ لیں اور کوئی بھی فیصلہ غلط نہ ہو' کیونکہ زندگی ان بچوں نے گزارنی ہوتی ہے۔ ہم بڑے اپنی جھوٹی انا اور ناک کی خاطر اپنی مرضی بچوں پر مسلط کر دیتے ہیں' جو شادی کی ناکامی کا سبب بنتی ہے اور تمام عمر خاک ہو جاتی ہے اور اس طرح آنے والی نسلیں وہ سب کچھ نہیں کر پاتیں جس کی ہم ان سے توقع کرتے ہیں۔

خیر ایک اچھا فنکشن تھا۔ گیلانی نے جو داماد پسند کیا تھا' وہ لڑکا بھی خوبصورت تھا اور نازی کے ساتھ کافی جچ رہا تھا۔ گیلانی کا سمدھی خود بھی جوان تھا اور سمدھن بھی۔ گل ایم بی اے تھا۔ جو ایک کامیاب بزنس مین تھا اور گیلانی کا عزیز بھی۔

ہم وہاں سے اجازت لے کر واپس آ گئے۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد سحرش کی شادی ہو جائے تاکہ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہوسکوں۔ اگلے دن میں نے سحرش اور شمع سے ناشتہ کی میز پر پوچھا:

''بیٹا! اب تمہاری ماں اور باپ بھی میں ہوں۔ مجھے پتہ نہیں ہے کہ کیسے بات کی جاتی ہے۔ مجھے اس لمحہ تمہاری ماں کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری شادی کر دوں' لیکن کافی دنوں سے اچھے رشتہ کی تلاش میں تھا۔ تمہارے

گیلانی انکل نے کل جو فیملی ملوائی تھی' میرا خیال ہے کہ وہ اچھے لوگ ہیں' لیکن میں ایک ظالم اور تنگ ذہن باپ نہیں ہوں۔ تم پر اپنی مرضی مسلط نہیں کروں گا۔ تم دونوں بہنیں بھی ہو اور اچھی دوست بھی۔ لہٰذا سحرش بیٹا! اگر تم نے کوئی لڑکا...... میرا مطلب ہے بیٹی کہ اگر تم کہیں اور شادی کرنا چاہتی ہو تو اپنی اس دوست شمع کو بتا دینا اور بعد میں اپنے اس دوست کو بھی۔''

یہ کہہ کر میں ٹیبل سے اُٹھ گیا۔ وہ دونوں چھری کانٹوں سے کھیل رہی تھیں اور کان میری باتوں پر تھے۔

یہ بیٹی بھی قدرت نے کیا چیز بنائی ہے۔ بانہوں کے جھولے جھلا کر' لاڈ پیار اور محبت سے والدین پالتے ہیں اور جب بڑی ہو جاتی ہیں تو باپ کو فکر میں ڈالتی رہتی ہیں' جس طرح صحن میں لگی بیری کے بیر پک جائیں تو آس پاس کے لوگ وہاں سے بیر توڑنے کے لیے پتھر مارنا شروع کر دیتے ہیں' بالکل اسی طرح بیٹی بھی جب جوان ہو جاتی ہے تو گھر میں لڑکوں کے رشتوں کی صورت میں پتھر آنا شروع ہو جاتے ہیں اور غریب گھروں میں تو لڑکیاں سج سنور کر جب رشتہ دیکھنے والوں کے سامنے آتی ہیں تو لڑکے کی ماں' بہنیں بھابی یا دوسری عورتیں' اس بچی سے طرح طرح کے سوالات کر کے زچ کر ڈالتی ہیں۔ یہاں تک کہ بچی سے اٹھ کر چلنے کی فرمائش کی جاتی ہے جیسے کوئی قصاب بھیڑ بکری خریدنے سے پہلے اس کا اچھی طرح معائنہ کرتا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے بھی یہ دو بیریاں جوان کھڑی تھیں۔ ان کی ماں کے بغیر ان کی شادیاں میرے لیے کٹھن ترین مرحلہ تھا' لیکن اب جانے والی کو کون واپس لاسکتا تھا۔ میں انہیں سوچوں میں ڈوبا چھوڑ کر آفس چلا آیا تھا۔

گیلانی کا فون تھا اور وہ طاہر اینڈ فیملی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

''کہو بھئی خان! تمہیں لڑکا کیسا لگا اور لوگ کیسے لگے؟''

''لوگ تو اچھے ہیں اور لڑکا بھی اچھا ہے۔ دراصل تم جانتے ہو کہ میں اپنی بچیوں کی ماں بھی ہوں' باپ بھی اور دوست بھی ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے کچھ ٹائم دو' میں سوچ لوں اور جس نے تمام زندگی گزارنی ہے' اس سے بھی پوچھ لوں۔''

''ارے یار خان! میں اُن لوگوں کی پوری ضمانت دیتا ہوں۔ وہ تمہاری بیٹی کو پھول

کی طرح رکھیں گے۔ بھلا بچوں سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ فیصلہ تو ہم بڑوں نے کرنا ہے۔''

''دیکھو گیلانی! ہمارے پیارے آقاؐ کا ارشاد مبارک ہے کہ شادی کرنے سے پہلے بچوں سے پوچھ لو کیونکہ زندگی انہوں نے گزارنی ہوتی ہے اور حضور ﷺ کا ارشاد تو سر آنکھوں پر اور وقت کا تقاضا بھی ہے۔''

''ٹھیک ہے مولوی صاحب! آپ ایک ہفتہ بعد مجھے بتا دیں' میں ان لوگوں کو مزید ایک ہفتہ تک روک لیتا ہوں اور ہاں یار! اس دن میں یہ بتانا بھول گیا تھا کہ اُن لوگوں کا تعلق انڈیا سے ہے۔ وہ یہاں اپنے رشتہ داروں کے ہاں آئے ہوئے ہیں اور وہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ او کے' میں تمہاری کال کا منتظر رہوں گا۔''

دوسری طرف سے رابطہ ختم ہو گیا تھا اور میں سوچ میں ڈوب گیا کہ نجانے سحرش کیا جواب دیتی ہے۔ انہی سوچوں میں دن گزر گیا۔ شام کو گھر جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ بیٹیوں سے کیسے بات کروں؟ کیا پوچھوں؟ کیا کہوں؟ کیا سنوں؟ وہ مجھ سے کیسے کہیں گی' لیکن نہیں' مجھے اپنی اولاد اور تربیت پر فخر تھا۔ میں گھر کی طرف چل پڑا۔

گھر پہنچ کر کھانا کھانے کے لیے ہم تین فیملی ممبرز ٹیبل پر اکٹھے ہوئے تو سکون سے کھانا کھایا۔ میں ان کے چہرے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا' لیکن میں چہرہ شناس نہ تھا۔ کچھ بھی اندازہ نہ کر پایا۔ شمع نے بات شروع کی۔ وہ پُر اعتماد لہجہ میں بولی:

''ڈیڈی! امی کی ڈیتھ کے بعد آپ نے بہت محبت اور شفقت سے ہمیں پالا ہے۔ ہم نے تو ماں کی صورت بھی اچھی طرح نہ دیکھی تھی۔ بس آپ کو ہی دیکھا ہے۔ آپ نے ہمیں محبت' خلوص اور اچھی تربیت کے ساتھ ساتھ دوستوں جیسا پیار اور اچھا ماحول بھی دیا ہے۔ ہم کوئی بھی بات اعتماد اور فخر سے کر سکتے ہیں۔ آپ ہمارا غرور ہیں ڈیڈی!''

''میں تمہارا ممنون ہوں بیٹا کہ تم دونوں نے میری عزت اور میرے نام کو اپنی ذات کا غرور بنایا' لیکن آج مجھ پر بہت مشکل وقت آیا ہے۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ تم سے کیسے پوچھوں کہ سحرش کو طاہر فیملی پسند ہے؟ کیا فیصل اُسے پسند ہے؟ میں نے شمع سے بات کی لیکن میں نے کنکھیوں سے سحرش کی طرف بھی دیکھا۔

وہ جذبات سے بالکل عاری چہرہ لیے بیٹھی تھی۔

''ڈیڈی! ہم آپ کے ہر حکم کی تعمیل کے پابند ہیں' لیکن ایک دوست کی حیثیت سے آپی نے مجھ سے بات کی ہے' وہ فیصل سے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ کیونکہ..........''

میں نے شمع کی بات کاٹ دی اور اُٹھ کر سحرش کی طرف بڑھا۔ وہ بھی کرسی سے اُٹھ گئی۔ شمع میرے ہاتھ کا اشارہ دیکھ کر بولنا رُک گئی تھی۔

''سحرش بیٹا! تم میری عزت اور مان ہو اور میں یہ چاہوں گا کہ تم نے جو بھی لڑکا پسند کیا ہے' وہ امیر ہو یا غریب' لیکن اچھے خاندان سے ہو۔ وہ لوگ شریف ہوں' عزت کرنا اور کروانا جانتے ہوں۔ میں فلمی باپ کی طرح لالچی نہیں ہوں۔ وہ جو بھی ہے اسے کل شام پانچ بجے گھر پر بلاؤ۔ ہم شام کی چائے اکٹھے پئیں گے۔'' میں اپنے کمرے میں جانے کے لیے مڑا' تو شمع کی آواز آئی۔

''تھینک یو ڈیڈی!''

میں نے مڑ کر شمع کے سر پر ہاتھ رکھا اور نفی میں سر ہلا کر بولا:

''ڈیڈی نہیں' دوست!'' میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

فراز سحرش کا کلاس فیلو تھا۔ اچھا لڑکا تھا' قبول صورت اور ہینڈسم۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ فراز کا آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ بس ایک منہ بولا چچا تھا۔ فراز کسی آفس میں ملازمت کرتا تھا۔ یہ کوئی مسئلہ نہ تھا' کیونکہ میں اُسے کسی بھی جگہ ایڈجسٹ کروا سکتا تھا۔ اُن سے ملنے کے بعد میں نے شادی کی تیاری شروع کر دی۔

گیلانی کو میں نے جواب دے دیا تھا کہ بچی سحرش نہیں مانتی۔ اس نے بُرا منایا' لیکن بچی کی خوشی پر خوش ہو گیا تھا۔ سحرش کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی اور بہت سے کام کرنا باقی تھے۔ بہت سی ذمہ داریاں تھیں' جو اللہ نے آہستہ آہستہ نبٹا دی تھیں۔ میری بچیوں کی دوست زیادہ نہ تھیں' شمع کی کلاس فیلوز نے مل کر سحرش کو مہندی لگائی۔ ڈھولک پر گیت گائے جا رہے تھے۔ میں نے گھر کو خوب ڈیکوریٹ کیا تھا' صبح میری بچی کی بارات آنے والی تھی۔

میں نے ملازمہ کو کہا کہ وہ سحرش اور شمع کو میرے پاس بھیجے۔ میں کمرے میں ان کا انتظار کر رہا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد دونوں میرے کمرے میں موجود تھیں۔ سحرش کے

چہرے پر خوشی چمک رہی تھی اور شمع بجھی بجھی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے شمع کے سر پر پیار سے چپت لگائی اور بولا:

''پگلی' تو کیوں اداس ہے؟''

''ڈیڈی! کل آپی تو چلی جائے گی نا!''

''ہاں' ظاہر ہے۔ وہ اپنے دولہا میاں کے ساتھ اپنے گھر چلی جائے گی۔''

''تو پھر میں اکیلی رہ جاؤں گی نا۔''

''اوہو تو یہ مسئلہ ہے۔ پھر ایسا کرتے ہیں کوئی اچھا سا لڑکا دیکھتے ہیں۔ اگر تم نے نہیں دیکھ رکھا تو........تو پھر تمہیں بھی ساتھ ہی رخصت کر دیں گے۔''

''ڈیڈی!'' وہ مصنوعی ناراضی سے بولی۔

''بیٹا! یہ گھر' یہ آنگن تمہاری شوخیوں' شرارتوں' تمہاری باتوں سے مہکتا تھا' تم کل چلی جاؤ گی۔ میں نے تمہاری پرورش میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ بیٹی جو ہوتی ہے وہ پرائی امانت ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں ماں بن کر پالا ہے۔ ان بانہوں میں جھلایا ہے۔ تمہاری انگلی پکڑ کر تمہیں پاؤں پاؤں چلنا سکھایا ہے اور کئی بار گرنے سے بچانے کے لیے سنبھل کر چلنا سکھایا ہے اور دنیا کی اونچ نیچ سمجھائی ہے۔'' میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ میں ان کے سامنے رونا نہیں چاہتا تھا' لیکن ان دونوں کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی دیکھ کر میرے آنسو ڈھلک گئے۔ ''میری پرورش میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو مجھے یہ سمجھ کر معاف کر دینا بیٹی کہ ماں ماں ہوتی ہے اور باپ باپ ہوتا ہے۔ وہ کبھی بھی ماں نہیں بن سکتا۔'' میں نے بیٹی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ وہ دونوں تڑپ کر میرے سینے سے لگ گئیں۔

''آپ کیوں ہمیں گناہگار کرتے ہیں! آپ نے تو ہمیں اس طرح رکھا ہے جیسے کوئی باغبان اپنے باغ کے پھولوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ انہیں مرجھانے سے بچانے کے لیے مناسب پانی دیتا رہتا ہے۔ آپ نے بھی بالکل اُسی طرح ہمیں اپنے خلوص اور چاہت سے سینچ کر پروان چڑھایا ہے۔

ڈیڈی! آپ نے دن رات ایک کر کے ہماری پرورش کی ہے۔ ہم اُن لمحات کا صلہ نہیں دے سکتیں جو آپ نے ہماری خاطر راتوں کو جاگ جاگ کر گزارے ہیں۔''

سحرش روتی ہوئی بولی تھی۔

''ہم تو ان جھولوں کا مول نہیں دے سکتیں جو آپ نے ہمیں بانہوں میں جھلائے ہیں۔ ہماری ہر خواہش پوری کی ہے آپ نے۔

زندگی میں کبھی آپ کا سر ہماری وجہ سے نہیں جھکے گا ڈیڈی! نہیں جھکے گا۔''

''بس بس! میں نے تم پر یہ کوئی احسانات نہیں کیے' بلکہ اپنا فرض اچھے طریقے سے نبھانے کی کوشش کی ہے۔''

''چلو اب جا کر سو جاؤ' پھر صبح کافی مصروفیات ہوں گی' تھکاوٹ ہو جائے گی۔''

وہ دونوں چلی گئیں اور مجھے مغموم کر گئیں۔

گیلانی اینڈ فیملی' طاہر اینڈ فیملی اور دوسرے چیدہ چیدہ مہمان مدعو تھے۔ یہ دونوں فیملیز مجھ سے خفا خفا لگ رہی تھیں' لیکن میں نے اپنی بیٹی کا سکھ دیکھا تھا۔

سحرش کی رخصتی کا جان گداز لمحہ آ پہنچا تھا۔ مختصر سی بارات تھی۔ فراز' اُس کا چچا اور کچھ ان کے محلّہ دار اور فراز کے دوست شامل تھے۔ ہر کام ان کی طرف سے سادگی سے ہوا تھا۔ میرے ملنے والوں کی لمبی فہرست تھی' لیکن چند ہی لوگ مدعو کیے تھے۔ بچی کو رخصت کرتے وقت میں نے بہت حوصلہ سے کام لیا تھا۔ اُس کی رخصتی کے بعد میں اور شمع خوب روئے تھے۔ وہ چلی گئی تھی ہمیں چھوڑ کر!......

فراز میرا داماد جو کہ کسی کمپنی میں ملازم تھا' میں اُسے جلد از جلد اپنی کسی فرم میں اچھی پوسٹ دینا چاہتا تھا' لیکن سحرش کی شادی کے بعد پتہ چلا کہ وہ کسی فرم میں ملازم نہیں ہے بلکہ کرائم رپورٹر ہے اور ایک اچھا جرنلسٹ ہے۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق سحرش کو جہیز دیا تھا۔ فراز کا گھر بھر گیا تھا۔ اچھے ماحول میں ایک ماہ گزر گیا تھا۔ اچانک خوشیوں کو نظر کھا گئی۔ فراز ایک دن مووی کیمرہ لے کر گھوم رہا تھا۔ وہ اور سحرش سیر کو نکلے تھے۔ اچانک ان کی گاڑی جو کہ ٹیکسی تھی کسی اجاڑ جگہ پر خراب ہو گئی تھی۔ انہوں نے اپنا کچھ سامان ٹیکسی میں ہی چھوڑا اور کیمرہ لے کر گھومنے نکل گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور کو گاڑی ٹھیک کرنے کا کہہ گئے۔

''تم یہیں ہمارا انتظار کرنا' ہم گھوم کر آتے ہیں' تم اُتنی دیر میں گاڑی ٹھیک کر لو۔''

''چلو سحرش ذرا گھوم پھر کر دیکھتے ہیں اور مووی بناتے ہیں۔'' وہ دونوں گھومنے پھرنے چلے گئے۔ وہ ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ فراز سحرش کی مووی بنا

رہا تھا۔ ایک پہاڑی پر کھڑے ہوکر اُس نے مووی بنانا چاہی تو سحرش نے نیچے دیکھا اور فراز کو بتایا کہ نیچے کچھ لوگ ہیں۔ فراز اپنے پیشے سے مجبور ہوکر اُن کی مووی بنانے لگا جبکہ سحرش کہتی رہی کہ یہ لوگ مجھے خطرناک لگتے ہیں۔ چلو بھاگ چلیں۔"

لیکن فراز نہ مانا کیونکہ وہ اپنے اخبار کے لیے اچھی اور اچھوتی ہیڈ لائن ڈھونڈ رہا تھا۔ تقریباً دس یا بارہ منٹ کی مووی بنی ہوگی کہ ٹیکسی ڈرائیور انہیں ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچا۔ اس نے اونچی آواز میں کہا: "صاحب جی! گاڑی ٹھیک ہوگئی ہے۔ جلدی آ جایئے۔" فراز نے اچانک گھوم کر پیچھے دیکھا تو اس کی جلد بازی میں ایک پتھر اس کے پاؤں سے نیچے گر گیا۔ ان لوگوں نے اوپر دیکھا تو فراز کیمرہ لے کر بھاگنا چاہتا تھا۔ وہ لوگ بھی اوپر کی جانب بھاگے۔

سحرش اور فراز بمشکل گاڑی تک پہنچے تھے۔ ٹیکسی اسٹارٹ ہوکر جانے لگی تو مجرموں کے ایک شخص نے فراز کو بہت قریب سے دیکھ لیا کیونکہ وہ لوگ بھی سڑک پر آ گئے تھے۔ وہ سیدھے میرے گھر پہنچے۔ انہوں نے ٹیکسی والے کو فارغ کیا۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ فراز نے جلدی سے کیمرہ سے فلم نکال کر مجھے دی اور کہیں چھپانے کے لیے کہا۔

میں پوچھتا رہا' لیکن اس نے کچھ نہ بتایا۔ بس یہی کہتا رہا کہ آپ اس فلم کو سنبھال کر رکھیں۔ میں بعد میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ سحرش الگ پریشان کھڑی تھی۔ جبکہ شمع کالج گئی ہوئی تھی۔ اچانک ایک دھماکے سے باہر کا گیٹ کھلا۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا تو ایک جیپ تیز رفتاری سے کوٹھی میں داخل ہوئی۔ اس میں کچھ آدمی سوار تھے۔ میں نے فراز کی جانب دیکھا تو اس نے فلم چھپانے کا کہا۔ میں نے فوراً فلم بیڈ کے میٹرس کے نیچے رکھ دی۔ فراز کمرے سے باہر نکلنا چاہتا تھا کہ اچانک فیصل ہاتھ میں ریپیٹر لے کر اندر داخل ہوا۔ اس نے آتے ہی مجھے نمستے سُسر جی کہا۔

میں نے غور کیا تو فیصل نے ماتھے پر تلک لگایا ہوا تھا جیسا ہندو لگاتے ہیں۔

"فیصل بیٹا! تم یہاں اور اس طرح؟" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ہاں سُسر جی! ہم تو آپ کے بیٹے بننے آئے تھے' لیکن آپ نے ہمیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ کی اس چھوکری نے......" اُس نے سحرش کی کلائی پکڑ لی۔ فراز آگے بڑھا تو اس نے گن کا بٹ اس کے چہرے پر مار کر کہا۔

"حرامزادے! ہماری فلمیں بناتا ہے۔ بڑا شوق ہے تجھے ڈائریکٹر بننے کا' بول کہاں ہے۔ تیری شاہکار فلم جس کا وِلن میں ہوں۔ بول!"

"نہیں بتاؤں گا۔" فراز اپنی ضد پر اڑ گیا۔

"فیصل بیٹا! ہم شریف آدمی ہیں۔ ہم پر رحم کرو' ہمیں ذلیل نہ کرو۔"

میں بولا تو وہ جھٹے سے اُکھڑ گیا۔

"تم شریف آدمی ہو تو ہم بدمعاش ہیں؟ ہاں' ہم بدمعاش ہیں۔ اب ہماری بدمعاشی دیکھو۔" وہ سحرش کو لے کر نیچے چلا گیا اور کمرے کو باہر سے لاک کر دیا۔

کوٹھی کے لان میں اُس نے سحرش کو لے جا کر اس کے تمام کپڑے پھاڑ دیئے۔ وہ روتی رہی' چلاتی رہی۔ وہ کوٹھی کے لان میں کبھی اِدھر بھاگتی اور کبھی اُدھر بھاگتی تھی' لیکن درندوں نے چاروں طرف سے کوٹھی کو گھیر رکھا تھا۔ انہوں نے میری بچی کی عزت......."

یہ کہہ کر شفیع خان رو پڑا۔ وہ بچوں کی طرح بلک رہا تھا۔ آ کاش اور تمام لوگ خاموش بُت بنے تمام کہانی سن رہے تھے۔ "میری بچی نے خدا رسول کیواسطے دیئے لیکن وہ کافر تھا۔ اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ میری بچی ہمیں مدد کے لیے پکارتی رہی۔ میں اور فراز نے مل کر دروازہ توڑا اور باہر لان کی طرف بھاگے۔ مجھ سے آگے فراز تھا۔ وہ جلدی سے بھاگتا ہوا سحرش سے لپٹ گیا۔ وہ بے جان' بے ہوش اور برہنہ حالت میں لان کی گھاس پر پڑی ہوئی تھی اور وہ درندے اُس کا گوشت' اس کی عزت نوچ چکے تھے۔ فراز نے اپنی شرٹ اُتار کر اس کے ننگے بدن کو ڈھانپنے کی کوشش کی۔ وہ روتا ہوا بے حال ہو رہا تھا۔ اس نے فیصل کو گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑنا شروع کر دیا تو اس نے اُسے دور دھکا دے دیا۔ وہ لان کے ساتھ لگی ہوئی باڑ میں جا گرا' میں اندر سے بستر کی چادر لے کر سحرش کے جسم کو ڈھانپ چکا تھا۔ انہوں نے اُٹھتے ہوئے فراز کو ریپیٹر کے کارتوس کا نشانہ بنایا۔ کارتوس سیدھا فراز کے پیٹ میں لگا۔ وہ وہیں گر گیا۔ اس پر بھی ظالموں نے بس نہ کی۔ انہوں نے پے در پے خنجروں کے وار کر کے اُسے لہولہان کر دیا۔ میں آگے بڑھا تو انہوں نے مجھے کس کر پکڑ لیا اور فیصل بولا:

"تمہیں زندہ اس لیے چھوڑ رہا ہوں کہ ان کی لاشوں پر ماتم کر لینا اور بعد میں وہ فلم مجھے اس پتہ پر پہنچا دینا۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت تم غصے میں ہو اور فلم مجھے نہیں دو گے۔ اس لیے سابقہ سُسر جی' نمستے! پھر جلد ہی ملاقات ہوگی۔"

وہ گیٹ تک گئے اور فیصل پھر واپس آ گیا اور منحوس شکل بنا کر بولا:

"میں تو بھول ہی گیا سُسر جی! اگر اپنی دوسری بیٹی کی عزت عزیز ہے تو کسی کو خبر نہ کرنا ورنہ اُس کا انجام بھی اس ملائی جیسا ہوگا۔ ویسے وہ بھی بہت چکنی ہے سالی۔"

وہ دفع ہوگیا تھا اور میرے لان میں میرے داماد کی لاش خون میں لتھڑی پڑی تھی۔ سامنے بے ہوش بیٹی تھی۔ میں چیخ چیخ کر رو دیا' کوٹھی کے در و دیوار ہل گئے۔ میں روتے ہوئے بے ہوش ہوگیا تھا۔ شمع کالج سے آئی تو کوٹھی میں داخل ہوتے ہی اس پر اس جان لیوا حادثے کا انکشاف ہوا۔ اس نے جلدی جلدی مجھے ہوش دلایا۔ پھر سحرش کی جانب لپکی' لیکن سحرش کی نبض تھامتے ہی پتہ چل گیا تھا کہ وہ ہم سے دور جا چکی ہے۔ اُن ظالموں نے میری بچی کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ میرے داماد کو بیدردی سے قتل کر دیا تھا۔ میری بچی چھین لی تھی مجھ سے۔ میری پھول جیسی بچی! ان بانہوں نے جھولا جھلایا تھا اُسے۔ ان کندھوں پر میں نے سواری کرائی تھی اُسے! آ کاش بیٹا! سب کچھ خاک میں مل چکا تھا۔ شمع پر غشی کے دورے طاری تھے۔ ڈاکٹرز اور اہل محلّہ ہمیں حوصلہ کرنے کی تلقین کر رہے تھے۔ گیلانی اپنی پوری فورس کے ساتھ موجود تھا۔ پولیس نے چاروں طرف سے کوٹھی کو گھیر رکھا تھا' لیکن یہ تمام لوگ' تمام پولیس فورس میری بیٹی تو واپس نہ لا سکتے تھے۔" وہ ایک بار پھر بلک بلک کر رونے لگا۔ "میں ایک بزنس مین تھا۔ ان غنڈوں اور بدمعاشوں سے دور رہتا تھا۔ گیلانی نے کئی بار مجھ سے پوچھا کہ کس نے ایسا کیا ہے' کیوں کیا ہے؟ تمہاری تو کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ مجھے بتاؤ تو سہی وہ کون لوگ تھے؟"

میں بات ٹال گیا۔ داماد اور بیٹی کے جنازے اُٹھے تو ہر آنکھ اشکبار ہوگئی' لیکن میں نہ رویا تھا۔ میں نے اُن سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ تدفین سے فارغ ہونے کے بعد عزیز و اقارب اور احباب نے افسوس کیا اور اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ میں اور میری بیٹی شمع ایک دوسرے کو دیکھ کر افسردہ ہوتے اور چپ چاپ رہتے۔ شمع نے بھی کئی

بار مجھ سے پوچھا' لیکن میں ٹالتا رہا اور میں اندر ہی اندر کسی ایسے گروپ کی تلاش میں تھا جو غنڈوں کی بولتی بند کر سکتا ہو اور جس کے نام سے غنڈے تھر تھر کانپتے ہوں اور پھر ایک دن باتوں باتوں میں شمع نے تمہارا ذکر کیا تو میں چونک اٹھا۔ ہم نے فوراً وہ گھر چھوڑ دیا اور ضروری سامان لے کر وہاں سے یہاں شفٹ ہوگئے۔ میں نے وہ فلم دیکھنے کی کوشش نہ کی تھی اور ابھی تک نہیں دیکھی ہے کہ وہ کون سی ایسی چیز تھی جس کی بناء پر فراز نے اپنی ضد نہ چھوڑی اور قتل ہوگیا' بلکہ اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ میں نے اخبارات میں تمہارے چرچے پڑھے ہیں' باقاعدگی سے اخبار پڑھتا ہوں اور تمہیں دیکھنے اور ملنے کے لیے بے تاب ہوگیا' لیکن کوئی ایسا راستہ نہ تھا کہ میں تمہیں اپنے پاس بلواتا' کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میری بیٹی تم سے محبت کرتی ہے اور شاید شادی بھی کرنا چاہتی ہو۔

اس دوران وہ لوگ مجھے پاگل کتوں کی طرح ڈھونڈ رہے تھے۔ اس جگہ کا مجھے ہی علم تھا۔ جبکہ میری بیٹی سحرش اور شمع بھی نہیں جانتی تھیں۔ شمع کو میں نے تمہیں بلوانے کے لیے بھیجا' لیکن کئی بار تمہارے گھر جانے پر بھی تم سے ملاقات نہ ہوسکی۔ میں تمہارے ساتھ بیٹھ کر فلم دیکھنا چاہتا تھا اور اپنی بچی اور داماد کے قاتلوں کو عبرت ناک سزا دلوانا چاہتا تھا۔ میں نے ایک خطرناک طریقہ اختیار کرنے کا سوچا۔ میں نے سوچا کہ شکار کو پھانسنے کے لیے خود ہی شکار بن جاؤں۔ یہ یقیناً بہت خطرناک سوچ تھی۔ میں نے شمع کو یہ بتلایا کہ میں ملک سے باہر جا رہا ہوں' دو ایک روز بعد میری واپسی ہوگی۔ بیٹی تھی پریشان ہوکر بولی...... "آپ نہ جائیں' وہ لوگ آپ کی راہ میں جگہ جگہ گھات لگائے بیٹھے ہوں گے۔"

"آپ فکر نہ کرو بیٹا! میں انشاء اللہ کامیاب لوٹوں گا۔" میں زبردستی وہاں سے پرانی کوٹھی آ گیا۔ میں نے تقریباً بیس دن اپنے کمرے کی لائٹیں جلائیں۔ ہر چیز جوں کی توں رکھی ہوئی تھی۔ میں نے یہاں سے فون کر کے پنجاب میں اپنے ایک ایم این اے دوست کو چند باڈی گارڈ بھیجنے کے لیے کہا اور نیچے ایڈریس بھی لکھ دیا کہ وہ کس جگہ پہنچ جائیں۔ میں دراصل کراچی میں کسی پر اعتماد نہیں کرنا چاہتا تھا' کیونکہ قائد کے اس شہر کو تخریب کاروں اور دہشت گردوں کی نظر لگ گئی تھی۔ دو دن تک میں اس مکان میں رہا۔ تیسرے دن میں نے گھر فون کر کے شمع کو بتایا کہ اس طرح چند آدمی بطور باڈی

گارڈ آ رہے ہیں۔ انہیں اچھی طرح کھانا وغیرہ کھلا دینا اور انہیں فلاں فلاں جگہ پر کمرے دے دینا۔ میں یہاں واپس آ گیا تو پانچ آدمی میری حفاظت کے لیے موجود تھے۔ وہ پنجاب سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے انہیں تمام بات سمجھا دی کہ انہوں نے میرے اس گھر کی کم اور میری عزت کی زیادہ حفاظت کرنی ہے۔ ایم این اے صاحب نے انہیں سمجھا کر بھیجا تھا اور وہ پنجابی تھے جو اپنی عزت کی خاطر مر مٹنے اور مار دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ مجھے ان پر مکمل اعتماد تھا۔ میں اس طرف سے بے فکر ہو کر اپنے مشن میں لگ گیا۔ جونیئر بھی جو کہ پنجابی ہے' میرا خاص آدمی بن گیا۔ یہ لڑائی بھڑائی کے فن میں بھی ماہر ہے۔ یہ بھی ان پانچوں میں سے ایک ہے۔

میں اور جونیئر پرانی کوٹھی میں اپنے کمرے کی لائٹ جلا کر اپنے مشن کی تکمیل کا انتظار کرتے تھے۔ اسی طرح ڈیڑھ ماہ گزر گیا' لیکن میرا منصوبہ ناکام ہونے سے بچ گیا۔ اس دوران تمہارے کارنامے رسائل و جرائد کے ذریعے مجھ تک برابر پہنچ رہے تھے۔ اور میں نے تمہیں پوچھے بغیر ہی ایک بہت بڑی ذمہ داری سونپنے کی ٹھان لی تھی۔

ہوا یوں کہ ایک کار تیز رفتاری سے کوٹھی کے سامنے رُکی' اس کے ٹائر چرچرا اٹھے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ ہمسائے بھی اپنی کوٹھیوں سے باہر نکل آئے تھے' لیکن گاڑی سے اترنے والے لوگوں کے خطرناک تیور اور ہاتھوں میں اسلحہ دیکھ کر وہ لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے۔ سات افراد پر مشتمل یہ گروہ میری کوٹھی کے اندر داخل ہوا تو میں نے جونیئر کو ہوشیار کر دیا۔

کمرے کی جلتی ہوئی لائٹ دیکھ کر ان لوگوں نے دروازہ کھٹکھٹانا گوارہ نہ کیا۔ زوردار ٹانگ مار کر دروازہ کھولا اور اسلحہ تان کر اندر داخل ہو گئے۔

اُن میں سے پانچ افراد میرے لیے نئے تھے جبکہ دو وہی تھے جنہوں نے میری بیٹی کی عزت لوٹ کر اُسے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ یک دم میرا خون کھول اٹھا' لیکن میں نے اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انہوں نے جونیئر کو کچھ نہ کہا۔ میری طرف متوجہ ہوئے۔

''ہاں تو فیصل کے سُسر صاحب! وہ فلم کہاں ہے' جو ابھی تک چھپا رکھی ہے؟''

''میں وہ فلم تمہیں نہیں دوں گا۔ وہ میں نے کسی کو دے دی ہے۔'' میں نے تن کر جواب دیا' تو جواب میں ایک زناٹے دار تھپڑ میرا گال سرخ کر گیا۔

''سالے حرامزادے! بچھو کو نخرے دکھاتا ہے۔ جانتا نہیں میرا ڈنک کتنا زہریلا ہے۔ تیری بیٹی نے تو پانی بھی نہیں مانگا اور تو سالے نخرے دکھاتا ہے۔'' ایک اور تھپڑ میرے دوسرے گال پر پڑا۔

''باس اس وقت یہاں نہیں ہیں ورنہ تیری ہڈیاں بھی اگل دیتیں کہ فلم کہاں ہے؟''

بچھو مجھ سے مخاطب تھا۔ پلان کے مطابق جونیئر نے آہستگی سے جیب سے خالی پسٹل نکالا اور ان پر تان لیا۔ یک دم وہ لوگ چونک گئے' لیکن غور کیا تو پسٹل جونیئر کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا۔ انہوں نے قہقہہ لگایا تو کمرے کی دیواریں لرزتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

''اس گیدڑ کو بھی گاڑی میں ڈالو اور اس نام کے شیر کو بھی۔ دو دن میں باس خود ہی ان کا فیصلہ کریں گے۔'' انہوں نے جونیئر کو ریوالور کے بٹ مار کر بے ہوش کیا اور مجھے دوائی سنگھا دی۔ مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ جب ہوش آیا تو میں کرسی پر بندھا ہوا تھا اور پاس ہی فرش پر جونیئر بندھا پڑا تھا۔ وہ بھی بے ہوش تھا۔ میں نے جونیئر کی طرف سے نظریں ہٹا کر ماحول کا جائزہ لیا تو جگہ کچھ جانی پہچانی لگی۔ کمرے میں گو کہ تھوڑی سی تبدیلی کی گئی تھی' لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ کمرہ سکندر ہوٹل کی دوسری منزل پر ہے' کیونکہ سکندر ہوٹل میری ہی ملکیت ہے۔'' یہ کہہ کر شفیع خان خاموش ہو گیا......

آکاش حیران تھا کہ سکندر ہوٹل شفیع خان کی ملکیت ہے اور شفیع خان کی کہانی دکھ بھری ضرور تھی' لیکن اس میں آکاش کا کیا کردار تھا۔ وہ یہی سوچ کر کہانی سنتا جا رہا تھا۔ شفیع خان پھر گویا ہوا جبکہ باہر شام ہو چکی تھی۔ باوردی گارڈ پوری مستعدی سے پہرہ دے رہے تھے۔ آکاش گروپ شفیع خان کی باتوں میں محو تھا۔

''میں نے جونیئر کو آوازیں دیں۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ جلد ہی ہوش میں آ گیا۔ اس نے اٹھ کر اردگرد دیکھا تو سر میں گومڑے کا احساس ہوا' اس نے درد سے کراہ کر آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ دیر بعد آنکھیں کھول کر بولا:

''جنرل صاحب! ہم کہاں ہیں؟''

''یہ بات تو اپنے میزبانوں سے پوچھو۔ مہمان کو کہیں بھی رکھیں' چپ چاپ رہ لینا چاہیے۔'' میں نے جونیئر کو نہیں بتایا کہ یہ کون سی جگہ ہے' کیونکہ وہ پنجابی تھا اور اس جگہ سے ناواقف تھا۔

"سنو جونیئر! تمہیں جو کچھ سمجھایا گیا ہے تم نے وہی کرنا ہے۔ میری جان کی پرواہ مت کرنا۔" میں نے اسے سمجھانا شروع کر دیا تو یکدم دروازہ کھلا اور اندر فیصل داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر شاطرانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ میری کرسی پر پاؤں رکھ کر تھوڑا سا جھکا اور بولا:

"سُسر جی! کیا اب بھی آپ کے چودہ طبق روشن نہیں ہوئے یا پھر دوسری ناری کی عزت گنوا کر پتہ چلے گا۔ ڈیڑھ ماہ تک کہاں رہے ہو۔ بہت ستایا ہے تم نے مجھے۔ زمین آسمان ایک کرنا پڑے مجھے تیرے لیے حرامزادے! تو کہیں موج مستی کرتا رہا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے غصے سے کرسی کو لات ماردی۔ میں الٹی طرف گر گیا۔ چوٹ تو نہ لگی، مگر اس طرح بندھے ہونے سے میں خود کو بہت بے بس محسوس کر رہا تھا۔

"سُسر جی! بھگوان کی کرپا سے آج تک کسی بھی مشن میں گوپال کو ناکامی نہیں ہوئی۔ اور تمہارے کیس نے میری راتوں کی نیندیں اڑا دی ہیں۔ وہ سالی تمہاری چھوکری وہ کیا نام تھا اس حور کا، ہاں شمع! ارے یار کیا چیز پیدا کی ہے تُو نے!" اس نے بھونکنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ اس کا نام گوپال ہے اور ہندو ہے۔ وہ پھر بھونکا:

"کیا ادائیں تھیں اُس کی! ہاتھوں میں موبائل لیے وہ کبھی آنچل کو ادھر اور کبھی اُدھر لہراتی تھی۔ ارے یار! بس دل ہی نکال کر لے گئی۔ کاش اس دن تیری بڑی چھوکریا کے ساتھ وہ بھی ہوتی تو اس کی جوانی کا رس بھی پی لیتے۔" اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری جیسے اُسے بہت افسوس ہوا ہو۔

"چلو، خیر کوئی بات نہیں۔ اب پی لیں گے۔" اس نے تالی بجائی، تو وہی دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ ایک جو خود کو بچھو کہتا تھا اور دوسرے کا نام انور تھا۔ اس نے انور کو کہا:

"جنرل صاحب کی کرسی سیدھی کرو اور ایک عدد پلاس لے کر آؤ، میں دیکھتا ہوں کہ یہ حرامزادہ فلم کے بارے میں کیسے نہیں بتاتا؟ ......اور اس کو بیکار میں اُٹھا لائے ہو۔ گولی مار کر سمندر میں پھینک دو اس کتے کے بچے کو۔" اس نے جونیئر کو ایک ٹھوکر رسید کی۔

انور باہر چلا گیا تھا۔ میں اب کرسی پر بندھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد انور پلاس لے کر آیا تو گوپال نے کوئی بات کیے بغیر میرے ہاتھ کا انگوٹھا پلاس سے دبانا شروع کر دیا۔ وہ

آہستہ آہستہ دباؤ بڑھاتا جا رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا۔ "فِلم ...... فِلم ...... فِلم ...... فِلم ...."

میں شدتِ درد سے بلبلا اُٹھا تو جونیئر بول پڑا۔

"میں بتاتا ہوں۔ میں بتاتا ہوں فِلم کہاں ہے۔ میرے صاحب کو چھوڑ دو۔ میں بتاتا ہوں فِلم کہاں ہے۔" جونیئر پلان کے مطابق ٹھیک کام کر رہا تھا۔ میں نے مصنوعی غصے سے آنکھیں نکال کر جونیئر کو گالیاں دینا شروع کر دیں اور دھمکیاں بھی ......

"جونیئر، میں تمہیں نوکری سے نکال دوں گا۔ سؤر کے بچے! تو نمک حرامی کرے گا میں جانتا تھا کہ تُو ان کے ساتھ مل جائے گا ...." اس نے میری بات کاٹ کر بولنا شروع کیا۔

"بس، بس، بس...... میرے مہان سُسر جی، بس! اب تمہاری آواز نہ نکلے ورنہ گولی تمہارا بھیجہ اُڑا دے گی۔" گوپال نے جیب سے پسٹل نکال کر میرے سر پر رکھ دیا۔ میں خاموش ہو گیا تو جونیئر کی باری تھی۔

"گوپال صاحب! آپ میرے صاحب کو چھوڑ دیں۔ اُن کا کوئی قصور نہیں ہے۔ فلم ان کے داماد نے بنائی تھی، جنہیں آپ نے مار ڈالا ہے۔ گوپال صاحب آپ........."

"کام کی بات کرو جونیئر! فلم ملتے ہی ہم تمہیں اور تمہارے صاحب کو چھوڑ دیں گے۔" وہ پھر بات کاٹ کر بولا:

"صاحب، ہمارے ہاتھ پاؤں تو کھول دیں۔ بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ پلیز گوپال صاحب!"

جونیئر دوبارہ بولا تو اس نے بچھو کو اشارہ کیا۔ بچھو نے آگے بڑھ کر جونیئر کے ساتھ پاؤں کھول دیئے تو اس نے ہاتھ پاؤں مل کر سکون کا سانس لیا اور بولا:

"صاحب! جنرل صاحب سے فلم آکاش لے گیا ہے۔"

شفیع خان کی بات سن کر آکاش جو کہ بُت بنا ہوا تھا، ایک دم اچھل پڑا۔ جنرل صاحب نے مسکراتے ہوئے اسے پُرسکون رہنے کا اشارہ کیا تو آکاش ریلیکس ہو گیا اور پھر جنرل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

گوپال نے جونیئر کو پیار سے پچکارا اور پھر بولا:

''ہاں تو جونیئر صاحب! یہ آکاش صاحب کون ہیں اور یہ کہانی میں کہاں سے آن ٹپکے؟ فوراً اس حرامزادے کا حدود اربعہ بیان کرنا شروع کرو ورنہ تمہارے صاحب کی کھوپڑی میرے ریوالور کی گولی کا انتظار کر رہی ہوگی۔'' اس کی دھمکی بظاہر کارگر ثابت ہوئی تو جونیئر نے فوراً بولنا شروع کر دیا۔

''جنرل صاحب کی چھوٹی بیٹی شمع بی بی کا کلاس فیلو ہے۔ اس شہر میں غنڈہ گردی' مار پیٹ' دنگا فساد' جگا ٹیکس' قتل و غارت' ڈکیتی' رہزنی اور نجانے کیسی کیسی بری عادتوں سے لبریز اس شخص سے شمع بی بی عشق کرتی ہیں۔ جس دن آپ نے ان کے داماد اور بیٹی کو قتل کیا تھا' اُسی شام آکاش بابو ان کے گھر آئے۔ شمع سے تمام بات پوچھی تو چھوٹی بی بی نے ساری تفصیل آکاش کو بتا دی اور ساتھ ہی فلم بھی دے دی۔ اور آکاش نے فلم لے کر کہا تھا کہ یہ فلم وہ گیلانی صاحب کو دے گا اور اس میں ملوث تمام افراد کو چُن چُن کر موت کے گھاٹ اتارے گا۔ گوپال صاحب! آپ اس آکاش کو ڈھونڈیئے اور ہمیں چھوڑ دیجیے۔'' جونیئر بہت اچھا اداکار تھا جو اس نے اتنے لمبے مکالمے یاد کر رکھے تھے اور فرفر بول دیئے تھے۔

''تمہیں چھوڑ دوں گا' لیکن آکاش ملنے کے بعد۔ یہ بتاؤ یہ آکاش نام کی بیماری کہاں سے لگے گی؟'' گوپال نے میری طرف دیکھ کر پوچھا تو میں خاموش رہ گیا' کیونکہ جونیئر ہی سب کچھ بول رہا تھا۔

''گوپال بابو! جنرل صاحب کو کیا پتہ؟ یہ تو شمع بی بی ہی بتا سکتی ہیں۔''

یہ ایک بہت بڑا رسک تھا جو میں نے لیا تھا شمع کا نام لے کر' کیونکہ گوپال پہلے ہی بھیڑیا بنا ہوا تھا اور اب تو اس کی کہانی میں شمع بھی ملوث ہوگئی تھی۔ اُس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ رینگ گئی۔ ''فون لے کر آؤ اور اس جنرل کو دو' یہ اپنی بیٹی سے بات کرے۔ اس آکاش کا پتہ کر کے اُسے کُتے کی طرح گھسیٹتے ہوئے یہاں میرے قدموں میں لا کر پھینک دو۔ میں اُس کی ایک ایک آنت ادھیڑ کر اس سے فلم نکلوالوں گا۔ انور تم جاؤ۔'' اس نے انور سے کہا تو وہ باہر چلا گیا۔

بچھو بول اٹھا۔ ''باس' میں آکاش کے بارے میں جانتا ہوں۔ وہ ایک شاطر اور ہوشیار آدمی ہے۔ وہ اس طرح ہمارے قابو نہ آئے گا۔ کیا ایسا نہ کریں کہ ہم شمع کو یہاں لے آئیں وہ خود بخود ہی سر کے بل چل کر آ جائے گا۔''

میرے ذہن میں آندھیاں چلنے لگیں۔ میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اگر ایسا ہو گیا تو کیا میری دوسری بیٹی بھی ان درندوں کا شکار بن جائے گی۔ میں کرب سے چلا اٹھا۔

''نہیں نہیں' تم ایسا نہیں کر سکتے۔ خدا تمہیں کبھی معاف نہ کرے گا۔''

''اوئے خدا کے بچے! میں کیوں نہیں ایسا کر سکتا۔ کون روکے گا مجھے ایسا کرنے سے؟ تُو روکے گا' تیرا یہ جونیئر یا تیرا خدا آئے گا مجھے ایسا کرنے سے روکنے کے لیے؟''

''میرا قانون روکے گا۔ اس ملک کی پولیس روکے گی تمہیں۔ تمہاری بوٹی بوٹی نوچ لوں گا میں اگر میری بیٹی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو۔''

میں ہذیانی انداز میں بول رہا تھا۔

وہ ایک بھیانک قہقہہ لگا کر بولا۔ اس کا انداز فلمی ولنوں جیسا تھا۔

''تیرا قانون! تیرے ملک کی پولیس اور تُو! تیرے ملک کا قانون کسی امیر آدمی کی رکھیل ہے' داشتہ ہے وہ کسی وزیر سفیر اور ایم این اے جیسے لوگوں کی۔ تیری پولیس! دس دس روپے پر بکتی ہے تیری پولیس فورس...... دس دس روپے پر۔ کبھی کنجری کو دیکھا ہے تماش بین کے ہاتھ میں نوٹ دیکھ کر ناچتی ہوئی' سو سو ادائیں دکھاتی ہوئی اس کی جھولی میں گر جاتی ہے اور نوٹ لے کر نئے تماش بین کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ اس پولیس کی بات کرتا ہے سالے! اس پولیس کی بات کرتا ہے جو ناکے لگا کر شریف آدمیوں کی جیبوں سے نوٹ نکلواتی ہے اور کوئی بھی گاڑی والا دس کا نوٹ پکڑا دے تو اُسے جانے دیا جاتا ہے۔ اس میں جو جی چاہے لے جاؤ' چاہے اسلحہ' منشیات' زہر اور کچھ بھی ہو۔ اس قانون کی بات کرتا ہے جو کسی گواہ کے بغیر بالکل اندھا ہے۔ مت کر قانون کی باتیں' ورنہ ایسے قانون دان سے ملواؤں گا تیری ہوا ٹائٹ ہو جائے گی۔ اے بچھو! بول اس کُتے جنرل سے کہ میرے سامنے کسی پولیس کی' کسی قانون کی بات نہ کرنا' ورنہ گوپال سے بڑا پاگل کوئی نہیں ہے۔ بول اِس سے!'' اس نے میرے قانون اور میری

پولیس کی اچھی خاصی سٹوری سنا ڈالی۔ اور مجھے لگا کہ وہ ٹھیک ہی کہتا ہے۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔

''جاؤ بچھو! اس کی چھمیا کو لے کر آؤ۔ ہم کچھ دیر آرام کر لیں اور پھر بعد میں کچھ کھیل بھی تو کھیلنا ہے۔ تھوڑی سی بیڈ ریسٹ تو چاہیے نا!'' اس نے بچھو سے کہا اور بچھو ہماری طرف متوجہ ہو کر بولا: ''اِن کا کیا کریں؟''

''انہیں کھانا کھلاؤ اور نیچے تہہ خانہ میں بند کر دو۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ بچھو وہیں رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد کھانا آ گیا۔ جو شخص کھانا لے کر آیا وہ میرے ہی ہوٹل کا ویٹر تھا۔ وہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر حیران رہ گیا' لیکن کچھ نہ بولا۔ وہ کچھ بولنا چاہتا تھا' لیکن بچھو نے اُسے باہر بھیج دیا۔

''کھانا کھاؤ۔ جونیئر اپنے باس کے ہاتھ کھول دو تا کہ وہ کھانا کھا سکے۔'' جونیئر نے میرے ہاتھ پاؤں کھول دیئے۔ کلائیوں پر رسیوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ میں نے ہاتھوں سے کلائیوں کو مسلنا چاہا تو بہت تکلیف ہوئی۔ ہم نے کھانا کھانا شروع کر دیا۔ ابھی دو چار نوالے ہی لیے ہوں گے کہ مجھے اپنا سر گھومتا ہوا لگا۔ یہی حالت جونیئر کی تھی۔ اُس کے بعد ہمیں کچھ ہوش نہ تھا۔ بس آخری احساس جو تھا وہ یہ کہ شمع ان ظالموں کے ہاتھ نہ لگ جائے۔

دوبارہ ہوش آیا تو خود کو اُسی تہہ خانہ میں پایا جہاں تم بھی قید تھے۔ میرے اردگرد سات افراد تھے۔ گوپال سامنے والی کرسی پر غصہ میں بیٹھا ہوا تھا۔

''دیکھو جنرل! ہمیں تمہاری بیٹی کا کوئی پتہ نہیں چلا ہے۔''

''شکر ہے میرے مالک!'' میں نے دل ہی دل میں پروردگار کا شکر ادا کیا۔ اس کا مطلب ہے کہ میرا فارم ان کی نظروں میں نہ آیا تھا...... وہ پھر بولا۔

''میں نے ایک اور پلاننگ بنائی ہے۔ تم اس میں مرکزی کردار ادا کرو گے۔ تمہارے جسم کے ساتھ ٹائم بم بندھے ہوں گے' جن کا ریموٹ کنٹرول میرے ہاتھ میں ہوگا۔ ہم تمہارے کارندے ہوں گے۔ تم ہمارے باس بنو گے۔ ہم شمع کو تو نہیں ڈھونڈ سکے۔ اس سلسلہ میں ناکام لوٹ کر آنے والے میرے ہاتھوں اپنی جانیں گنوا چکے ہیں۔ تم جانتے بھی ہو اور دیکھ بھی چکے ہو کہ میرے لیے بندہ مارنا کتنا آسان ہے۔ آکاش

کے گروپ کو ہم پولیس والوں کے روپ میں اغوا کریں گے اور یہاں لے کر آئیں گے۔ پھر اس گروپ سے تمام تفصیلات طے کی جائیں گی۔ آکاش سے فلم کے متعلق پوچھ کر اگلا قدم اٹھایا جائے گا۔

عنقریب وہ لوگ تمہارے ساتھ ہوں گے۔ تم تمام لوگ جاؤ اور پولیس کی گاڑی لے کر پولیس یونیفارمز میں انہیں لے کر یہاں آؤ۔'' اس نے اپنے تمام آدمیوں کو جانے کا کہا اور خود بھی باہر چلا گیا۔ میں اور جونیئر وہاں اکیلے رہ گئے۔ ہم بندھے ہوئے تھے اور سوچ رہے تھے کہ ان کا مقصد کیا ہے۔ اس فلم میں کون سی ایسی خاص بات ہے' جو یہ گوپال اتنی لمبی گیم کھیل رہا ہے' لیکن ہم سمجھ نہ پائے۔

''وہ لوگ پولیس کی وردیوں میں تمہارے گھر گئے۔ انہوں نے تلاشی لینا چاہی تو مانی جو کہ تمہارے گروپ کا آدمی ہے' اُسے شک پڑ گیا کہ یہ نقلی پولیس ہے۔ اس نے تمام دوستوں کو خبردار کر دیا۔ وہ وہاں سے تمہاری کار لے کر فرار ہو گئے اور یہ پولیس ان کا پیچھا کرتی ہوئی آندھی کی طرح ان کے سروں پر پہنچ گئی۔ انہوں نے گروپ والوں کو پکڑ لیا اور یہاں لے آئے۔ میں نے پہلی بار آکاش گروپ کو دیکھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں کے چرچے میں اخبارات میں پڑھتا تھا۔ آج میرے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ بالکل بے بس اور لاچار!

گوپال نے اندر داخل ہوتے ہی مانی کو پکڑا اور پوچھنا شروع کر دیا۔

''بتاؤ حرامزادے کہ تمہارا باپ آکاش کہاں ہے؟'' یہ کہہ کر اس نے ایک تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔

دوسرے لڑکے اُٹھ کر غصے سے چلائے' تو اس نے اپنے آدمیوں کو کہہ کر اُن پر اسلحہ تان لیا۔ یہ بے چارے بے بس ہو گئے۔ مانی کو بہت غصہ تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر ایک ٹانگ گوپال کے پیٹ میں رسید کی۔ اُس نے اسلحہ کی پرواہ نہ کی تھی۔ پھر یہ تمام گروپ اُن سے اُلجھ پڑا۔ اسلحہ کی پرواہ کیے بغیر یہ جوانمردی سے لڑ رہے تھے۔ واقعی یہ لوگ شہرت اور تعریف کے قابل ہیں۔ میں نے سوچا۔

گوپال وغیرہ نے ہوائی فائرنگ کر کے اُن لوگوں کو یاد دلایا کہ ہم اسلحہ چلا بھی سکتے ہیں۔ یہ لوگ خالی ہاتھ تھے۔ لہٰذا عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ پُرسکون ہوئے تو

ان لوگوں نے مانی کے علاوہ تمام لوگوں کو باندھ دیا۔ باندھنے کے بعد انہیں بہت مارا پیٹا۔ اتنا مارا کہ یہ سب بے ہوش ہوگئے...... مانی کی تو ان لوگوں نے ٹانگ توڑ دی۔ یہ کہہ کر کہ اس کی ٹانگ گوپال پر اٹھی ہے۔ ''انہیں ہوش میں لاؤ۔'' گوپال چیخ اُٹھا۔

تہہ خانے کے ایک کونے میں مانی درد سے تڑپ رہا تھا' لیکن اس کی طرف کوئی متوجہ نہ تھا۔

پانی کا ایک ایک جگ ان کے چہروں پر پھینکا گیا تو لالہ ہوش میں آتے ہی بول پڑا!

''اوئے کتے کے بچے! ہمیں باندھ کر مار رہا ہے! اگر تیرا باپ ایک ہے تو کھول اور دیکھ کہ ہم تیری تکہ بوٹی کیسے کرتے ہیں۔ تم نے صرف نام سُنا ہے۔ دیکھا نہیں کہ آکاش گروپ کیا ہے؟''

''دیکھو بچو! ضد بُری چیز ہے۔ اپنے اس ساتھی کی طرف دیکھو۔'' اس نے مانی کی طرف اشارہ کیا جو درد کی شدت سے بے ہوش ہوگیا تھا۔'' اس کی ٹانگ توڑ دی گئی ہے۔ اگر تم نے آکاش کا پتہ نہ بتایا تو اس بے ہوش پڑے کتے کو گولی مار دوں گا۔ لہٰذا جلدی بولو۔ میں صرف پانچ تک گنوں گا۔'' اس نے گنتی شروع کر دی۔ ایک...... دو...... تین...... چار اور اس سے پہلے کہ وہ پانچ کا ہندسہ بولتا۔ راجو بول اُٹھا۔ ''ٹھہرو! تم مانی کو کچھ نہیں کہو گے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ آکاش کہاں ہے!'' اس نے اپنے دوستوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''معافی چاہتا ہوں یارو۔ میں اپنے اس دوست کو یوں بے بسی کی موت مرتا نہیں دیکھ سکتا۔''

اُس نے تمہارے بارے میں تفصیل بتانا شروع کر دی کہ اس وقت تم کہاں ہو گے اور کیا کر رہے ہو گے۔ اُن لوگوں نے تمہیں ٹریس کر لیا اور ہوٹل آنے کو کہا۔ وہ تمہیں اغوا نہیں کر سکتے اور نہ ہی کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے تمہیں رات دس بجے کا وقت دیا اور تمہاری پل پل کی خبر رکھی اور تمہیں رسیدیں دیتے رہے' یہ ثابت کرنے کے لیے کہ تم ان کی نظر میں ہو۔ تم دس بجے سکندر ہوٹل کے باہر پہنچ گئے تو ان لوگوں نے تمہارے تمام ساتھیوں کو چھوڑ دیا اور مانی کا علاج کروانے کا کہا۔ تمہیں گاڑی میں بٹھا کر شہر کی

سڑکوں پر گھما پھرا رہے تھے اور اُدھر مجھے اور جونیئر کو انہوں نے اپنے گروپ کا بندہ ظاہر کرنے کے لیے میرے جسم کے ساتھ ریموٹ کنٹرول بم باندھ دیئے اور ہمیں اس تہہ خانہ سے نکال کر واپس اُسی کمرہ میں لے آئے جہاں ہمیں پہلے قید کیا تھا۔ گوپال نے ہمیں بریفنگ دینا شروع کر دی کہ میں یعنی جنرل شفیع ان کا باس ہوں اور مجھے سبق دے دیا کہ کیا کرنا ہے۔ جب تم تہہ خانہ میں پہنچ گئے تو میں نے سپیکر آن کیا جو کہ تہہ خانہ میں نصب تھا جبکہ مائیک میرے ہاتھ میں تھا اور سامنے گوپال گروپ مجھ پر گنیں تانے کھڑا تھا اور ریموٹ کنٹرول بھی گوپال کے ہاتھ میں تھا۔ سونیا کی آواز سن کر میں آٹھ آدمیوں کے ساتھ ہال کے اندر داخل ہوا تو مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا کیونکہ سونیا وہی لڑکی تھی جس کا تعارف گیلانی نے اپنی بیٹی کی منگنی پر طاہر کی بیٹی اور اس فیصل کی بہن کی حیثیت سے کرایا تھا۔ وہی فیصل جو اب گوپال کے روپ میں میرے سامنے کھڑا تھا' میں کچھ کچھ سمجھ چکا تھا اور بہت کچھ سمجھنا ابھی باقی تھا۔ جونیئر بھی ان لوگوں کے ساتھ تھا' جو تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ کر تمہیں لائے تھے۔ لہٰذا جونیئر کو پتہ نہ تھا کہ میرے جسم پر ریموٹ کنٹرول بم باندھا جا چکا ہے۔ پھر اُس کے بعد کے حالات تمہارے سامنے ہیں۔''

اگلے دن انہوں نے ناشتہ بھیجا۔ وہی آدمی جو کہ سکندر ہوٹل کا ویٹر تھا اس نے مجھے آ کر سلام کیا اور بولا: ''صاحب جی! آپ اس حالت میں؟''

''ہاں' کیا تم میری کوئی مدد کر سکتے ہو؟'' میں نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

''آپ حکم کریں' آپ کے لیے تو جان بھی حاضر ہے!''

''ہمیں یہاں سے نکالو...... کسی طرح بھی اور کسی قیمت پر بھی۔''

''یہ تو ناممکن ہے صاحب! وہ بہت ظالم لوگ ہیں۔ انہوں نے منیجر صاحب کو قتل کر دیا ہے اور پندرہ دن سے ہمیں بھی اس ہوٹل میں یرغمال بنا کر رکھا ہے۔ ہم اپنے گھروں کو بھی نہیں گئے۔ یہ تو کہتے تھے کہ ہم جنرل صاحب کے دوست ہیں۔'' وہ دھیمے لہجہ میں بات کر رہا تھا۔ اتنی دیر میں انور اندر داخل ہوا اس نے ویٹر کو گھور کر باہر جانے کو کہا اور جونیئر سے کہنے لگا۔

"ناشتہ کرنے کے بعد اس دروازہ کو تین بار کھٹکھٹا دینا' کیونکہ گوپال صاحب نے کہا ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی آدمی آکاش کے سامنے نہیں جائے گا۔ تم اس کے لیے ناشتہ لے کر جاؤ گے۔"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ میں نے جونیئر کو کاغذ پنسل نکالنے کے لیے کہا۔

جونیئر نے جیب سے پنسل نکالی اور ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر بولا: "فرمایئے۔"

میں نے وہ عبارت لکھوائی' حالانکہ میں نہیں جانتا تھا کہ ان کا مشن کیا ہے۔ جونیئر تمہیں ناشتہ دے کر آیا تو کاغذ بھی دے آیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ویٹر بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ گھبرایا ہوا بولا:

"جنرل صاحب! جلدی کریں۔ آپ لوگ یہاں سے نکل جائیں' میں نے ان کے ناشتے میں بے ہوشی کی دوائی ملا کر تمام لوگوں کو بے ہوش کر دیا ہے۔ وہ تمام ایک ہی کمرے میں بند ہیں۔ جلدی کریں' صاحب! اگر ان میں سے کسی کو ہوش آ گیا تو آپ کے ساتھ ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا۔" وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔

میں نے اور جونیئر نے مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں بھاگ کر وہاں سے نکلے۔ جونیئر تہہ خانہ کی طرف گیا' لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ تم وہاں سے باہر نکلنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ باہر ان کی گاڑی کھڑی تھی۔ میں اور جونیئر بھاگ کر گاڑی میں سوار ہوئے۔ گاڑی تاریں جوڑ کر سٹارٹ کی اور ہوٹل کے پچھلے دروازے کی طرف لے آئے۔ میں جانتا تھا کہ تم یقیناً نکل آؤ گے کیونکہ تم آکاش تھے اور آکاش کبھی جھکتا نہیں ہے اور میری توقع کے عین مطابق تم روشن دان تک پہنچ گئے تھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اُن کے آنے سے پہلے ہی ہم لوگ تمہیں وہاں سے لے کر نکل آئے۔ وہ کلفٹن کے ساحل پر میکڈونلڈ بھی میرا ہے۔ میں نے تمام انتظامات مکمل کرنے کے بعد تمہارے دوستوں کو کال کر کے یہاں بلوایا۔ یہ لوگ ہم سے پہلے ہی پہنچ گئے تھے' کیونکہ ہم شہر سے نہیں سمندر کے راستے آئے ہیں۔ باقی سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔" شفیع خان کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولے۔ "آکاش بیٹا! میں نے ان دو ماہ میں بہت کچھ کھویا ہے۔ اگر پایا ہے تو تمہاری شکل میں ایک بیٹا پایا ہے۔ گوپال کا کوئی

بھی مشن ہم پر آشکارا نہیں ہوا۔ ہم بالکل اندھیرے میں ہیں۔ میں نے بہت مان اور فخر کے ساتھ ساری گیم تم پر ڈال دی تھی' کیونکہ میں جانتا ہوں میری بیٹی شمع تم سے بے پناہ محبت کرتی ہے اور مجھے اپنی بیٹی کی پسند پر ناز ہے۔"

جنرل صاحب نے کہا تو شمع کے چہرے پر رنگ بکھر گئے۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے سب سے نظر بچا کر مجھے آنکھ مار دی۔ میں سٹپٹا گیا۔

"آکاش بیٹا! مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔ تم میری بیٹی کی صحیح رکھوالی کر سکتے ہو۔ اُس کی حفاظت تم جیسا کوئی مضبوط آدمی ہی کر سکتا ہے۔ میں ان کی نظر میں آ گیا ہوں' وہ لوگ کبھی بھی مجھے مار سکتے ہیں۔ تمہیں خدا کا واسطہ' میری بیٹی کی حفاظت کرنا! میری یہ تمام جائیداد' کاروبار' سب کی وارث شمع ہے اور اس اعتبار سے تم بھی۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں روپے پیسے کا کوئی لالچ نہیں ہے' لیکن شمع کی عزت کی خاطر اور اس کی محبت کی خاطر ان چیزوں کو قبول کرو۔"

"دیکھیے جنرل صاحب! اب آپ کو کوئی فکر نہیں کرنا چاہیے۔ سب سے پہلے تو ہمیں مانی کو ہسپتال سے گھر پہنچانا ہے بلکہ کسی محفوظ جگہ پہنچانا ہے۔ وہ لوگ پھر سے مانی کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور دوسری بات یہ کہ ہمیں وہ فلم فوراً دیکھنی چاہیے' جس کے لیے آپ کی بیٹی اور داماد نے قربانی دی ہے۔ آپ کا دکھ بہت بڑا ہے اور الفاظ بہت چھوٹے ہیں۔ میں الفاظ استعمال کر کے آپ کے بہت بڑے دکھ کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔ بس یہی کہوں گا کہ اللہ کی رضا تھی' لیکن اب ان کی موت آکاش خود لکھے گا اور انہیں اتنی بھیانک موت مارے گا کہ آج کے بعد کوئی گوپال پاکستان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے گا۔" آکاش کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے تو شمع بھی کانپ اٹھی' جبکہ جنرل صاحب ساکت ہو گئے تھے۔

فون کی گھنٹی نے انہیں چونکا دیا۔ دوسری طرف ان کا کوئی آدمی تھا۔ جنرل صاحب نے کہا "ٹھیک ہے' لے آؤ میں اِدھر ہی ہوں۔" ریسیور رکھ دیا۔

تھوڑی دیر خاموشی چھا گئی۔ بیرونی دروازے سے مانی بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ آکاش اُسے دیکھ کر حیران ہوا اور پھر بھاگتا ہوا اس سے لپٹ گیا۔

"کیسے ہو آکاش بھائی!" اس نے آتے ہی پوچھا۔

"تمہیں پتہ ہے کہ آکاش ٹھیک ہی ہوتا ہے۔ اپنی بات کرو' اب درد تو نہیں ہو رہا؟"

"نہیں' اب میں پہلے سے بہتر محسوس کرتا ہوں۔" وہ سہارا لیتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا۔

"شکریہ جنرل صاحب! آپ نے مانی کا خیال رکھا اور اُسے یہاں بلوالیا۔" آکاش نے جنرل کا شکریہ ادا کیا تو وہ مسکرا کر بولے۔

"تکلفات میں پڑ گئے ہو۔ خیر' چلو فلم دیکھیں....."

ہم تمام لوگ نیچے کی طرف چلے گئے۔ مانی کو بھی اٹھا کر لے جایا گیا۔

وی سی آر پر وہ فلم چلا دی گئی۔ ابھی پہلا ہی سین آیا تھا کہ جنرل صاحب چلّا اُٹھے۔ "ارے ارے ارے! یہ تو...... یہ تو...... گیلانی ہے۔ ذرا پیچھے کرنا' پھر سے ریورس کرنا۔" سین ریورس کیا گیا تو جنرل صاحب بول اُٹھے:

"آکاش! آکاش! یہ گیلانی ہے۔ ایس پی گیلانی۔ میرا دوست!" وہ فرطِ جذبات سے پھٹ پڑے۔ "یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ کیا یہ بھی گوپال کے ساتھ ملا ہوا ہے؟"

"آپ خاموشی سے فلم دیکھیں۔ میں آپ کو بتاؤں گا کہ تمام قصہ کیا ہے۔" میں نے جنرل صاحب کو کہا۔ وہ واقعی ایس پی گیلانی تھا۔ میں اُسے اچھی طرح جانتا تھا۔ پوری فلم دیکھ لی تھی۔ وہ لوگ بڑے بڑے بریف کیس رکھ رہے تھے۔ پہاڑ کی غار میں ایک بڑا دہانہ تھا۔ فراز نے بہت کلوز سے تمام فلم بنائی تھی۔ اچانک ایک لڑکی دہانے سے نمودار ہوئی۔ اس نے گیلانی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اندر آنے کا اشارہ کیا جبکہ گوپال وہیں کھڑا رہا۔ اچانک انہوں نے اوپر دیکھا اور اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ بس پھر رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔

☆..............☆

احمد رضا کو ایک نظر دیکھنے کے بعد چاندنی کی عجیب حالت ہوگئی تھی۔ حالانکہ کافی لڑکے اس سے دوستی کے خواہش مند تھے۔ لیکن رضا میں کوئی خاص ہی بات ہوگی جو چاندنی کو بھا گئی تھی۔ احمد طماس بھی اب صحت یاب ہو گیا تھا اور اس نے پھر سے کالج جانا شروع کر دیا تھا۔ حملہ آوروں کا کوئی پتہ نہ تھا' وہ کون تھے' کہاں سے آئے اور طماس

کو کیوں مارنا چاہتے تھے۔ اخبارات میں چند دن یہ خبر چھپتی رہی اور بعد میں غائب ہوگئی تھی۔ جیسا کہ پاکستان میں ہوتا ہے۔ اس عظیم ملک میں کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہ سکتی۔ کسی جرنلسٹ کے ہاتھ کوئی خبر لگ جائے تو اسے اپنے اخبار کی زینت بنانے کے لیے خوب مرچ مصالحہ لگا کر پیش کرتے ہیں اور بعد میں اُسے فراموش کر دیتے ہیں۔ بالکل یہی مسئلہ طماس کے ساتھ تھا۔ ابھی تک دوبارہ کوئی خبر اخبار میں نہ چھپی تھی جبکہ پندرہ بیس دن ہو گئے تھے وہ ریگولر کالج آ جا رہا تھا۔ احمد رضا سے اس کی دوستی گہری ہوتی جا رہی تھی جبکہ احمد رضا اس سے دور ہی رہنا چاہتا تھا' لیکن چاندنی کا اُس کی بانہوں میں گرنا اور شرم سے نگاہیں جھکانا' اس کا حسن' اس کی ادائیں' اس کی آواز' اس کی رنگت' اس کی آنکھیں' اس کی باتیں۔ اور نجانے کیا کیا رضا کے من میں سما گیا تھا۔ اس کا نام ہی چاندنی نہ تھا' بلکہ وہ مجسم چاندنی تھی۔ لیکن گرم مزاج کی' ٹھنڈک اور دھیمے لہجے سے اس کا واسطہ نہ لگتا تھا۔ وہ بولتی تو لگتا تھا ابھی پستول اٹھائے گی اور سامنے والے کو گولی مار دے گی۔ لڑاکی' جھگڑالو اور فساد پسند کرنے والی تھی۔ لیکن پھر بھی چاندنی تھی۔

[محبت اندھا کر دیتی ہے۔ تمام راستے' تمام فاصلے' تمام دیواریں' تمام حدیں یکدم عبور کر جاتی ہے۔

محبت انتہا تک پہنچ جائے تو کان چھدوا دیتی ہے۔ تھلوں میں رُلوا دیتی ہے۔

محبت ہو تو کچے گھڑے پر بھی دریا عبور کرنا پڑتا ہے۔

محبت ہو تو راتوں کو تارے گننا بھی ایک مشغلہ بن جاتا ہے۔

محبت سچی ہو تو خدا بھی ساتھ دیتا ہے اور خدائی بھی۔

محبت سچی اور لگن بے لوث ہو تو راتوں کو جاگنا بھی عبادت بن جاتا ہے۔

محبت زر اور زمین کے ہر قسم کے جھگڑوں سے پاک ہوتی ہے۔ اس میں کسی قسم کا لالچ یا ہوس نہ ہو تو محبت عبادت ہوتی ہے۔]

بالکل اسی طرح احمد رضا بھی اپنی اوقات بھول رہا تھا۔ یہ احمد رضا کا قصور نہ تھا بلکہ دل تھا جو پاگل ہو رہا تھا۔ اور احمد رضا کو بہکا رہا تھا۔ محبت کی جوت جگا رہا تھا۔ احمد رضا کو اپنا کشکول بھول کر راجہ سلیم کے محل کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے تھا مگر کیا کریں اس نادان دل کا جو زخم کھانے کے لیے مچل رہا تھا۔

راتوں کی نیندیں اُڑ گئی تھیں۔ دن کا سکون اور قرار چھن گیا تھا۔ دل کی دنیا اتھل پتھل ہو چکی تھی' لیکن اپنی غربت اور کم مائیگی کا احساس ضمیر کو کچوکے بھی لگا رہا تھا۔ وہ ایک عظیم الشان محل میں رہنے والی رانی اور وہ خود ایک فقیر کے ٹوٹے پھوٹے گھر میں رہنے والا نام کا راجہ۔ کیسے ممکن ہے یہ سب کچھ۔ ٹاٹ میں مخمل کا پیوند لگ سکتا ہے۔ ہرگز نہیں' ہرگز ہرگز نہیں۔ چھوڑو یار' کس چکر میں پڑ گئے ہو۔ وہ عجیب تذبذب کا شکار تھا۔ کبھی چاندنی کو جھٹلا دیتا اور کبھی وہ حقیقت بن کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی۔ کتابوں میں' خوابوں میں' سوالوں میں' جوابوں میں' کلیوں میں' گلابوں میں' رت جگے کے عذابوں میں' بس چاندنی ہی چاندنی تھی۔ آج بھی وہ اپنی ٹوٹی چار پائی پر لیٹا سوچ رہا تھا کہ اس کے لیے کچھ لکھنا چاہیے۔ اپنے قلم کو' اپنے ذہن کو' دماغ اور دل کو باوضو کر کے' باشعور کر کے' اپنی ساری تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہیے۔ اس نے خیر دین کی طرف دیکھا۔ وہ بھی جاگ رہا تھا اور ایک ٹک چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ وہ اپنی منجی سے اٹھتا ہوا بولا:

''ابا جی' کیا بات ہے؟ خدانخواستہ طبیعت تو خراب نہیں؟''

خیر دین نے بیٹے کی بات کا کوئی جواب نہ دیا' بس چھت کو گھورتا رہا تو رضا کو تشویش ہوئی۔ اس نے خیر دین کی چار پائی کے پاس جا کر اوپر چھت کی طرف دیکھا اور بولا:

''پیارے ابا جی! کیا چھت گرنے والی ہے؟'' لہجہ مزاحیہ تھا۔

''چھت تو کب کی گر چکی ہے۔ اب تو ملبے میں سے زندہ بچ نکلنے کی آس میں چند سانسیں بچائی ہوئی ہیں۔'' خیرو کا جواب اور لہجہ بھی عجیب تھا۔

''مجھے معلوم ہے ابا جی! آپ کو امی کی یاد آ رہی ہے۔'' رضا نے پھر مذاق کیا۔

''یاد تو انہیں کیا جاتا ہے جنہیں بھلا چکے ہوں۔'' خیر دین بیٹے کی طرف دیکھ کر مسکرا کر بولا:

''ابا! کیا ہم دوست ہیں؟''

''ہاں' پکے دوست!''

''کیا آپ کو میری امی سے محبت تھی' اتنی محبت کہ آپ اب بھی انہیں یاد کرتے ہیں۔'' رضا باپ کی کیفیت جانتے ہوئے سیریس ہو گیا تھا۔

''تیری ماں ایک جنتی عورت تھی۔ وہ بہت خوبصورت تھی' لیکن اس نے اپنی پاکیزگی اور حیاء پر کبھی آنچ نہ آنے دی۔ وہ ایک عظیم عورت تھی۔ تو نہیں جانتا اس نے اس خیر دین کا کتنا ساتھ دیا ہے۔ آج جب اس کی وفائیں مجھے یاد آتی ہیں تو دل اداس ہو جاتا ہے۔'' خیر دین نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

''ابا! کیا آپ کے پاس امی کی کوئی تصویر ہے؟'' رضا اشتیاق سے بولا' تو خیر دین نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''اچھا ابا! امی کی کوئی اور بات بتائیں نا۔ میں نے سنا ہے ماواں ٹھنڈیاں چھاواں ہوتی ہیں۔ ابا! یہ ماں کیسی ہوتی ہے۔ اس کی ممتا' اُس کی گود کی گرمی' اُس کے لہجے کی مٹھاس' اُس کی جھڑکیاں' اُس کا لوری سنانا' تھپک تھپک کر سُلانا' بیماری میں بچے کی صحت یابی کی خاطر رات بھر جاگنا' رو رو کر خدا سے دعائیں مانگنا' محبت انسانیت اور شفقت' یہ سب کچھ ہی خدا نے ماں کو کیوں دیا ہے ابا۔ یہ سب کچھ باپ کو کیوں نہیں دیا؟''

''اوئے میرے جھلّے پتر! تُو تو پڑھا لکھا ہے۔ میری طرح ان پڑھ تھوڑی ہے۔ تُو تو خود سمجھدار ہے۔'' خیر دین اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''سُنا ہے ابا! خدا نے جب ماں کو بنایا تو فرشتوں سے کہا۔

چاند کی ٹھنڈک' زمین کی چمک' پھولوں کی مہک' گلاب کے رنگ' چکوری کی تڑپ' کوئل کی کوک' سمندر کی گہرائی' بُلبل کے نغمے اور موجوں کا جوش لاؤ۔ اور جب ماں کو اللہ تعالیٰ نے بنا لیا تو فرشتوں نے خداوند کریم سے عرض کی' اے رب العالمین! تم نے اس میں اپنی طرف سے کیا شامل کیا تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: محبت! ابا اگر ماں کو اتنی چیزوں سے اللہ نے بنانا ہی تھا تو پھر اتنی پیاری چیزیں سمیٹ کر اپنے پاس کیوں بُلا لیتا ہے۔ کیا ماں کو بھی موت آتی ہے۔ میں نے تو دیکھا بھی نہیں کہ ماں کیسی ہوتی ہے۔ اُس کی محبت' اس کی ممتا' اس کی گود اور اس کی خوشبو بھی نہیں سونگھی۔ یہ دنیا میرے لیے تو ایک قبرستان ہے۔ اس دنیا میں میری ماں نہیں تو یہ زندہ انسانوں کی دنیا میرے لیے بے کار ہے ابا۔ بے کار ہے میں تو یہی کہوں گا کہ

بے رنگ ساری دنیا بے نور سا جہان لگتا ہے
ماں تیرے بنا اب تو گھر قبرستان لگتا ہے''

یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔ خیر دین کی آنکھیں بھی جھلملانے لگیں۔ وہ باپ تھا بیٹے کا سر اپنی گود میں رکھ کر بولا:

"موت تو موت ہوتی ہے۔ وہ نہ کوئی بوڑھا دیکھتی ہے اور نہ کوئی جوان' ولی پیغمبر اور نبیوں کو بھی خدا نے اپنے پاس بُلا لیا ہے۔ اور پھر اس نے اپنے پیارے محبوب حضرت محمد ﷺ کو خود اپنے ہاتھوں سے بنایا۔ اُن کی خاطر اس ساری کائنات کو زندگی بخشی۔ ان کا صدقہ ہم کھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی اپنے پاس بُلا لیا۔ تمہاری ماں بھی ایک ذی روح اور جان دار تھی اور اللہ پاک فرماتے ہیں' ہر جان دار کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ خدا سے گِلا نہیں کرتے بیٹا! اس کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔ وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔ جا جا کر سو جا۔ اور مجھے بھی سونے دے۔ اوئے جھلے پُتر تو مرد ہے اور مرد کبھی رویا نہیں کرتے۔ جا سودائی نہ ہووے تے۔ مجھے بھی پریشان کر رہا ہے۔"

اس نے بیٹے کو سمجھا بجھا کر اس کی چارپائی پر لٹا دیا اور پھر اس کو تھپک تھپک کر سُلانے لگا۔

صبح ہر کام معمول کے مطابق کرنے کے بعد رضا کالج اور خیر دین اسٹیشن کی طرف جانے والی بس میں سوار ہوئے۔ رضا کالج کے گیٹ پر پہنچا تو خلاف توقع گیٹ پر احمد طماس کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس نے پاس جا کر دیکھا تو طماس گاڑی میں نہ تھا بلکہ کالج سے باہر آ رہا تھا۔ اس نے رضا کو گیٹ پر ہی روک لیا اور بولا:

"میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"کیوں بھئی' خیریت ہے نا؟" رضا نے حیرانی سے پوچھا۔

"یار ایک تو تم لوگ ہمارے خلوص کو نہیں سمجھتے۔ اچھا گاڑی میں بیٹھو جلدی کرو۔"

وہ خود اسٹیرنگ پر بیٹھ گیا اور رضا دوسری طرف سے گھوم کر اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ وہ پہلی بار اتنی شان دار گاڑی میں بیٹھا تھا۔ وہ بڑی حسرت سے ہر ایک چیز کو دیکھ رہا تھا۔ طماس نے گاڑی ریورس کی اور سڑک پر دوڑا دی۔ صبح کا وقت تھا۔ لوگ دفاتر اور کاروبار کے لیے جبکہ سٹوڈنٹس سکول و کالج کے لیے آ جا رہے تھے۔ اس پر سے گاڑی کا سحر ختم ہوا تو بولا:

"طماس ہم کہاں جا رہے ہیں؟ یار کالج کا ٹائم ہو گیا ہے۔"

"بس خاموشی سے بیٹھے رہو۔ میں تمہیں ایک شخصیت سے ملوانا چاہتا ہوں۔"

طماس کی نظریں بدستور سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے گاڑی اپنے محل کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ دی۔ یہ وی آئی پی روڈ تھی۔ راجہ سلیم حکومت میں خاصی اہمیت رکھتے تھے۔ ان کے گھر تک اسپیشل سڑک بنی ہوئی تھی۔ گاڑی تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ رضا ایک بار پھر بولا:

"کس سے ملوانا چاہتے ہو' کون ہے وہ؟ اور یہ تو تم اپنے محل کی طرف جا رہے ہو۔"

"محل !!" طماس حیرت سے بولا۔ "محل کیسا!؟ وہ تو گھر بھی نہیں ہے۔ تم تو خود شاعر ہو۔ وہ شعر نہیں پڑھا کہ ؎

میرے خدا مجھے اِتنا تُو معتبر کر دے
میں جس مکاں میں رہتا ہوں اُسے گھر کر دے

لگتا ہے شاعر نے حسرت سے کہا ہے' کیونکہ اس کا بھی کوئی محل ہوگا۔" طماس نے گاڑی کی سپیڈ کم کر دی کیونکہ وہ کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ چکے تھے۔

رضا نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے نظارہ کیا۔ وہ بہت وسیع و عریض کوٹھی تھی۔ اس کا لان بہت بڑا تھا۔ سفید سنگ مرمر کی خوبصورت اینٹوں نے اُسے مزید خوبصورت بنا دیا تھا۔ کار پورچ میں پہلے بھی دو گاڑیاں کھڑی تھیں جو اس کی طرح بیش قیمت تھیں۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا' گاڑی پورچ میں جا کر رُکی۔ کوٹھی میں ہُو کا عالم تھا۔ لگتا تھا کہ کوئی بھی ذی روح اس میں آباد نہیں ہے۔

طماس نے رضا کو صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا اور خود دوسری طرف چلا گیا۔ وہ فوراً ہی لوٹا۔

"لگتا ہے چاندنی اور آپی میرے کمرے میں ہیں۔ تم یہیں بیٹھو میں انہیں لے کر آتا ہوں۔"

وہ باہر چلا گیا تو کمرے کے ایک کونے سے چاندنی برآمد ہوئی۔ وہ یقیناً باتھ روم سے نہا کر نکلی تھی' بال گیلے تھے جبکہ خوبصورت سی شلوار قمیض میں وہ جگمگا رہی تھی۔ وہ بے خیالی میں تولیے سے بال خشک کر رہی تھی جبکہ احمد رضا قدرت کی فیاضی پر حیران تھا۔ کتنا

حسن دیا تھا خدا نے اس کو۔ لگتا ہے فرصت میں بیٹھ کر بنایا ہے۔ سیاہ رنگ کا لباس اس کے حُسن کو مزید دوبالا کر رہا تھا۔

وہ بالوں کو خشک کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ گنگنا رہی تھی۔ تیری یاد آئی تیرے جانے کے بعد۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی رضا کے پاس پہنچی تو اُسے احساس ہوا کہ وہ کمرے میں اکیلی نہیں ہے۔ اُس نے سر جھٹک کر اوپر کی طرف دیکھا تو جیسے وقت تھم گیا تھا' لمحات رُک گئے تھے۔

رضا اس کے سامنے اس کے کمرے میں کھڑا تھا۔ آنکھوں سے آنکھیں ملیں بے قرار دلوں کو قرار مل گیا۔ ابھی ابھی وہ گنگنا رہی تھی کہ تیری یاد آئی تیرے جانے کے بعد۔ جس کی یاد آ رہی تھی وہ خود زندہ حقیقت اس کے سامنے موجود تھا۔ نجانے کتنے لمحے اسی طرح گزر جاتے کہ یکدم چاندنی کو احساس ہوا کہ وہ کس حالت میں ہے۔ وہ اپنا خوبصورت وجود سمیٹتی ہوئی بولی۔

''آپ؟! اِس وقت؟ یہاں میرے کمرے میں؟!'' اس کی ساری شوخی ہوا ہو گئی تھی۔ ''جی' خادم کو زحمت دی گئی ہے۔'' احمد رضا شوخ انداز میں بولا۔ وہ ابھی کھڑا ہی تھا کہ چاندنی کمرے کے دوسری طرف چلی گئی جبکہ احمد طماس اندر داخل ہوا تو اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ طماس نے اس کا تعارف کروایا۔

''رضا! یہ میری بڑی بہن کاجل ہیں۔'' کاجل چاندنی جیسی تھی لیکن چاندنی نہ تھی۔

''اور آپی! یہ ہیں میرے دوست احمد رضا۔'' رضا نے اپنا سر تھوڑا سا خم کیا۔

''بیٹھو' میں تمہاری بے حد ممنون ہوں کہ تم نے میرے بھائی کی جان بچائی ہے۔ یہ تمہارا احسان ہے ہم پر۔ کبھی زندگی میں موقع آیا تو ضرور اتاریں گے۔'' کاجل بولی اور ساتھ ہی رضا کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''میں نے کوئی احسان نہیں کیا بلکہ اپنا فرض نبھایا ہے۔ میں نے اپنے دوست کی جان بچائی ہے اور کسی کی جان بچانا یقیناً نیکی ہے۔ آپ بار بار احسان کہہ کر میری نیکی ضائع نہ کریں۔ پلیز اٹز مائی ریکویسٹ۔'' رضا نے کہا۔

''رضا! یہ ہماری آپی ہیں۔ ہم ان سے بہت پیار کرتے ہیں۔ یہ امریکہ میں رہتی

ہیں۔ گزشتہ پندرہ دن سے ہمارے ساتھ رہ رہی ہیں اور آج کراچی جا رہی ہیں۔ اور ہم لوگ یعنی تم' میں اور چاندنی انہیں سی آف کرنے جائیں گے۔ عجیب منطق ہے۔ میں نے کہا بھی ہے کہ آپ بائی ائیر جائیں لیکن آپی کی خواہش کہ وہ اپنے ملک میں سفر بذریعہ ٹرین ہی کریں گی۔ جبکہ ان کی واپسی بھی بذریعہ ٹرین ہی ہوئی تھی۔'' طماس نے منطق بیان کی۔ اندر سے چاندنی داخل ہوئی تو وہ ایسے لگ رہی تھی جیسے کوئی نئی نویلی دُلہن اپنی سسرال آئی ہو۔ چاند زمین پر اُتر آیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئلے کی کان سے ہیرا نکل کر آ گیا ہو۔ رضا اِردگرد سے بیگانہ ہو گیا تھا لیکن اُسے اس چیز کا احساس تھا کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔

''طماس چلیں' آپی کاجل' چلیں' جلدی کریں۔ ٹرین آپ کا انتظار نہیں کرے گی بلکہ چلی جائے گی۔'' وہ آتے ہی شوخی کے انداز میں بولی تھی جبکہ اُس کے دل کی ہلچل بتا رہی تھی کہ وہ دھڑکنوں پر قابو نہیں رکھ رہی۔ رضا کے سامنے آتے ہی ایسا ہوتا تھا۔ کیوں ہوتا تھا' یہ اُسے معلوم نہ تھا۔

''ہاں بھئی' جلدی کرو۔'' کاجل اُٹھتی ہوئی بولی۔ سبھی لوگ اُٹھ گئے' کاجل اور طماس کمرے سے باہر نکل گئے تو چاندنی بول پڑی۔

''آپ بھی چلئے نا' میں کمرے کو تالہ لگاؤں گی۔''

''کیا کوئی چیز کھونے کا ڈر ہے؟'' احمد رضا کے انداز میں شوخی تھی۔

''سب سے قیمتی چیز تو آپ نے چھین لی ہے۔ اب اور کیا کھونا باقی ہے۔'' اُس نے رضا کی طرف دیکھ کر من ہی من میں کہا لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔

''اگر آپ ہمیں اپنے کمرے سے نکالنا ہی چاہتی ہیں تو ایز یُو وِش! ہم چلے جاتے ہیں۔'' رضا باہر نکل گیا۔ چاندنی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہ سکی۔

''کمبخت نجانے کیا کشش ہے اُس کی آنکھوں میں۔ زبان گُنگ ہو جاتی ہے۔'' چاندنی نے بڑبڑاتے ہوئے کمرے کو بند کیا اور نیچے پورچ میں آ گئی۔ گاڑی تیار کھڑی تھی۔

احمد طماس اسٹیئرنگ پر تھا۔ اگلی سیٹ پر کاجل جبکہ پیچھے چاندنی اور رضا تھے۔ لینڈ کروزر کوٹھی سے نکل کر لاہور شہر کی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

محبوب کو راتوں کو یاد کیا جاتا ہے۔ دن رات اُس کی چاہت کے گُن گائے جاتے ہیں۔ اس کی قربت کے لئے تڑپا جاتا ہے۔ ایک ایک لمحہ اس کے دیدار کو ترسا جاتا ہے۔ اب تو معاملہ ہی اُلٹ تھا۔ محبوب بھی پاس تھا بلکہ بہت قریب' اتنا قریب کہ دونوں ایک دوسرے کی دھڑکنوں کو سُن سکتے تھے۔ محسوس کر سکتے تھے کہ ایک دوسرے کے دل پر کیا بیت رہی ہے۔۔ بظاہر دونوں ایک دوسرے سے انجان تھے لیکن ایک دوسرے کی جان تھے۔ چاندنی نے رضا کے پاؤں پر اپنا پاؤں مارا تو وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگا' لیکن وہ انجان بنی باہر دیکھتی رہی۔ رضا نے بھی باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ اس نے طماس اور کاجل کی آنکھ بچا کر رضا کی کمر میں چٹکی بھر لی۔ وہ بے چارہ سی کر کے رہ گیا۔

چاندنی اپنی شرم اور جھجک اُتارنا چاہتی تھی۔ وہ اتنی خاموش کبھی نہ بیٹھی تھی۔ اب تو اس کے منہ میں زبان ہی نہ لگ رہی تھی۔ اتنی معصوم بن کر بیٹھی تھی جیسے وہ ازل سے یتیم و مسکین ہو۔ ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر گاڑی رُکی تو ایک بھکاری چلتا ہوا آیا۔ اس نے اپنا سوال کیا اور کاسہ آگے کر دیا۔

''اللہ کے نام پر بابا؟''

یہ آواز رضا کے کانوں میں پڑی۔ اس نے چونک کر فقیر کی طرف دیکھا تو اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے' گاڑی گھومتی ہوئی محسوس ہوئی' کیونکہ وہ اپنے باپ کی آواز اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس نے گھبرا کر چاندنی کی طرف دیکھا لیکن وہ باہر نکل چکی تھی۔ کاجل نے اپنے پرس سے کچھ پیسے نکال کر طماس کے سر سے وارے اور فقیر کے کشکول میں ڈال دیئے۔ طماس نے آگے بڑھ کر رضا کی طرف والا دروازہ کھولا اور بولا:

''آیئے جناب محترم وزیر صاحب! تشریف لے آیئے۔ کیونکہ ٹرین جانے والی ہے۔'' رضا چونک کر باہر نکلا تو اس بار چونکنے کی باری خیر دین کی تھی جو تجلی کے بچوں کے ساتھ اپنے بیٹے کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

خیر دین کتنے ہی دنوں سے ڈسٹرب تھا۔ وہ جب سے راجہ سلیم کی کوٹھی سے واپس آیا تھا' کسی پل بھی چین سے نہ بیٹھا تھا۔ دن رات بے قراری میں گزار رہا تھا اور اب بیٹا بھی تجلی اور راجہ سلیم کے بچوں کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ ہوسکتا ہے یہ تجلی کے بچے نہ ہوں'

لیکن یہ گاڑی وہی تھی جس میں پہلے دن تجلی سوار ہو کر گئی تھی۔ احمد رضا کو روکنا چاہیے۔ اُسے ان لوگوں سے نہیں ملنا چاہیے۔ نہیں نہیں اُسے ملنا چاہیے بلکہ اسے تجلی کی بیٹی کے ساتھ راہ و رسم بڑھانی چاہیے اور راہ و رسم اس حد تک بڑھنی چاہیے کہ بات شادی تک پہنچ جائے۔ اُسے آگے بڑھنا چاہیے' وہ خود ہی رضا کا مقدر لکھ رہا تھا۔ کبھی اُس کے حق میں' کبھی اس کے خلاف۔

☆..............☆

بوسیدہ سے بستر اور ٹوٹی سی چارپائی پر لیٹا وہ کب سے سوچوں میں گم تھا کہ احمد رضا اندر داخل ہوا۔ اس نے اندر آتے ہی دروازہ اندر سے بند کیا۔ اور باپ سے نظریں چراتے ہوئے بجلی کے بورڈ کے پاس جا کر لائٹ آف کی اور اپنی چارپائی پر لیٹنے کے لیے آگے بڑھا تو خیر دین کی آواز آئی۔

''رضا بیٹا! مجھے ایک پیالی چائے تو بنا دے۔ آج صبح سے سر میں درد ہو رہا ہے۔''

رضا نے اٹھ کر بلب آن کیا اور باپ کی چارپائی پر اس کے پاؤں کی طرف بیٹھ گیا۔

''ابا! کیا تیرے اس سر درد کی وجہ میں ہوں؟'' وہ باپ کے پاؤں دباتے ہوئے بولا۔

''یہ تم نے کیسے سوچ لیا؟'' خیر دین نے آنکھیں بند کیے ہی پوچھا۔

''وہ ابا صبح ریلوے اسٹیشن پر جب آپ ملے تو مجھے لگا کہ آپ مجھے دیکھ کر خفا ہوگئے ہیں۔''

''مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ میرا بیٹا' ایک فقیر کا بیٹا ایک ایم این اے کی گاڑی میں بیٹھا ہے۔'' وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور رضا کو بس کرنے کا اشارہ کیا۔

رضا اُٹھتا ہوا بولا اور چائے بنانے کے لیے چولہا جلانے لگا۔

''ایم این اے! لیکن آپ کو کیسے معلوم کہ وہ گاڑی کسی سیاسی لیڈر کی ہے؟''

خیر دین کا قہقہہ گونجا۔

''اوئے پگلے! میں فقیر ہوں۔ فقیر کی نگاہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے امیر کی جیب پر ہوتی ہے۔ جب کچھ مل جائے تو ٹھیک اور جب کچھ نہ ملے تو نگاہ غصے سے نمبر پلیٹ پر جاتی ہے کہ آیا یہ گاڑی ہمارے شہر کی ہے یا باہر کی۔ بالکل اُسی طرح آج بھی جب

میں نے اپنا سوال دہرایا تو کاجل بیٹی نے کچھ پیسے مجھے اپنے بہن بھائی کا صدقہ اتار کر دیئے میں نے حسب معمول گاڑی کی طرف دیکھا تو میں چونک گیا' کیونکہ گاڑی پر ایم این اے کی نیم پلیٹ بھی نمبر پلیٹ کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔''

خیر دین کے منہ سے کاجل کا نام سُن کر رضا کے ہاتھوں سے چائے گرتے گرتے بچی تھی۔ ''ابا آپ کو کیسے علم کہ ان کی بڑی بیٹی کا نام یعنی جو میرے ساتھ بڑی لڑکی تھی اس کا نام کاجل تھا؟'' خیر دین ایک لمحہ کو تو سٹپٹا گیا لیکن اس نے دنیا دیکھی ہوئی تھی۔ یک دم سنبھل کر بولا:

''بیوقوف! اس کا جو بھائی تھا اس نے کہا تھا کہ چلیں کاجل آپی دیر ہو رہی ہے۔''

''اور آپ کو کیسے پتہ کہ وہ لڑکا اور لڑکی آپس میں بہن بھائی تھے؟''

''تو پڑھ لکھ گیا ہے مگر تجھے عقل نہ آئے گی' پگلے۔ میرے لاڈلے بیٹے! میری نا سمجھ اولاد جب ایک لڑکا کسی دوسری لڑکی کو آپی کہے گا تو بھائی ہی ہوگا یا دادا جان ہوگا!''

خیر دین کی دلیل معقول تھی جبھی تو رضا سر ہلا کر رہ گیا۔

دونوں باپ بیٹا چائے پینے لگے تو خیر دین رضا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''وہ لڑکی جو پیچھے تمہارے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی' وہ کیا چکر ہے بھئی۔ کوئی معاملہ گڑ بڑ لگتا ہے۔''

''ابا! وہ چاندنی ہے۔ پتہ ہے ابا! وہ بہت بڑے محل میں رہتی ہے۔ یہ لمبی لمبی گاڑیاں' نوکر چاکر' دولت کی ریل پیل' بہت امیر ہے ابا' بہت امیر ہے۔'' رضا نے شرماتے ہوئے بتایا۔

''یہ تو مجھے علم ہے کہ وہ بہت امیر ہے۔ میں نے اس کا تعارف نہیں پوچھا بلکہ جو بات گول کر گئے ہو وہ بتاؤ۔ کیا کوئی معاملہ گڑ بڑ ہے برخوردار!''

''ابا! وہ چاندنی ہے نا میری سٹوڈنٹ ہے۔''

''تو کیا پرنسپل لگ گیا ہے؟ دیکھ رضا میں تیرا باپ ہوں۔ اتنا سا تھا تو تجھے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا ہے۔ ارے بھوندو ان کندھوں پر مُوتا ہے تُو نے۔'' خیر دین نے اپنے ہاتھوں سے کندھوں کو پکڑ کر پھر کہنا شروع کیا۔ ''دیکھ میرا بچہ! مجھے بتا کیا معاملہ ہے۔ سچ سچ بتا' میں تجھے کوئی نہ کوئی حل بتاؤں گا۔ چل بول!''

وہ رضا کو ایسے پکار رہا تھا جیسے کوئی لاڈ سے بچے کو پچکار رہا ہو۔

''آپ کیا حل بتائیں گے جبکہ معاملہ ہی کوئی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے اب سونا چاہیے۔ صبح جلدی کالج جانا ہے۔'' رضا جان چھڑوا رہا تھا۔ جبکہ خیر دین پھر بولا۔

''اُلو کے پٹھے! مجھے لدھڑ سمجھتا ہے۔ ہائیں۔ صبح اتوار ہے اور کالج بند ہے۔ چل بول کیا معاملہ ہے۔ شاباش اچھے بچے ضد نہیں کرتے۔''

''ابا! تم ضد کرتے ہو تو سچ بتاؤں۔ معاملہ کوئی نہیں ہے بلکہ یوں کہیئے کہ بالکل ہی نہیں ہے۔ یہاں تھوڑی بہت بات چیت ضرور ہے' کیونکہ میں تو صرف دو ہی مرتبہ اُسے ملا ہوں اور ابا اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ ہم فقیر ہیں اور وہ اتنے امیر کہ ہماری ضرب تقسیم وہاں پہنچ کر نفی ہو جاتی ہے۔'' وہ مایوسی سے بولا۔

''کبھی بھی اپنی ذات کی نفی نہ ہونے دینا۔ یہ دولت کی چمک' گاڑیاں' عالی شان بنگلے' محل' یہ کرسیاں' یہ شان' سب کچھ فرضی ہے۔ دولت کبھی کسی ایک کی لونڈی نہیں رہی۔ دولت کے پاؤں ہوتے ہیں' یہ کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر چل پڑتی ہے۔ کسی شاہ کو گدا اور فقیر کو شاہ بنا دیتی ہے۔'' خیر دین بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کاسہ پکڑ کر پھر بولنے لگا۔

''یہ کشکول ہے' ایک فقیر کا کشکول! یہ کبھی نہیں بھرتا' کیونکہ فقیر کی نیت نہیں بھرتی۔ یہ میرے ہاتھوں میں حالات اور زمانے کی بیوفائی نے دیا ہے۔ کبھی وقت کا بھروسہ نہ کرنا۔ کبھی یہ مت سوچنا کہ آج کا کام کل کر لوں گا۔ زندگی کی دوڑ میں اتنا پیچھے رہ جاؤ گے کہ جتنا فاصلہ ایک گاڑی سوار اور پیدل آدمی کا ہوتا ہے۔ زندگی کی حقیقتیں بہت تلخ ہوتی ہیں بلکہ اس عظیم ملک میں تو زندگی ہی تلخ ہے۔''

''ابا! آپ تو پڑھی لکھی باتیں کر رہے ہو؟'' رضا حیرت سے بولا۔

''ایک بات اور لکھ لے دل کی کتاب کھول کر اس کے ریڈ پیج پر۔ جس راہ پر تم چل رہے ہو میں سب جانتا ہوں۔ اور سمجھتا ہوں۔ اگر تو میرا بیٹا ہے تو اس مشن میں کبھی بھی ناکام نہ ہونا۔ مشن اس لیے کہا ہے کہ محبت اور عشق غریب آدمی کے لیے مشن امپوسیبل ہوتا ہے۔''

''تم کیا ہو ابا! کبھی ایک ان پڑھ فقیر لگتے ہو اور کبھی کسی کالج کے پرنسپل لگتے ہو۔''

''تم نہیں سمجھو گے۔ اس کام میں آگے بڑھو۔ آہستہ آہستہ تم پر تمام باتیں افشاء ہوجائیں گی' اور ہاں اس سلسلہ میں میری ضرورت پڑے تو ایک بے لوث دوست کو ضرور یاد کرنا سمجھے.....''

''آپ کیسے باپ ہو۔ ایک بیٹے کو مشن امپوسیبل پر بھیج رہے ہو!'' رضا بولا۔

''تمہاری رگوں میں میرا خون ہے اور میرے خون میں پیچھے ہٹنا شامل نہیں ہے۔ تم دیکھو کیا گیم ہوتی ہے۔ اب میرا مان اور میری لاج تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' خیردین نے بیٹے کو سمجھایا۔ وہ کچھ سمجھ نہ پایا اور سر ہلاتا ہوا اپنی چار پائی پر لیٹ گیا۔ اور خیردین من ہی من میں سوچنے لگا۔

''تجلی کی بیٹی کو اس گھر کی بہو بنا کر تجلی کا غرور ضرور توڑوں گا۔''

☆..................☆

ماسی جانو رضا آباد تھانے سے آ کر بہت پریشان تھی۔ ایس پی نے اُسے صنم بائی کہا تھا۔ کیوں کہا تھا۔ کیا اس نے پہچان لیا تھا۔ یا یونہی کہہ دیا تھا۔ وہ اپنی پچھلی زندگی بھول چکی تھی اور اب کچھ بھی یاد نہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ پرانا نام صنم بائی اُسے ماضی کے دھندلکوں میں لیے جا رہا تھا۔ وہ یادوں میں کھونا چاہتی تھی مگر ماضی تکلیف دہ تھا۔ دروازے پر بیل کی آواز سن کر وہ چونک پڑی۔ دروازہ کھولا تو سامنے وہی ایس پی کھڑا تھا۔ ''تُم! تُم یہاں کیا لینے آئے ہو؟''

ماسی حیرت زدہ تھی۔ وہ ڈھٹائی سے ہنستا ہوا بولا:

''اندر آنے کے لیے نہیں کہو گی صنم؟''

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا نام ماسی جانو ہے۔'' ماسی نے ایسے راز دارانہ لہجے میں کہا جیسے اُسے ڈر ہو کہ کہیں اہل محلہ میں سے کوئی ایس پی کی آواز نہ سُن لے۔

''چلو آج کی جانو سے مل لیتے ہیں۔'' وہ خود ہی اندر آ گیا اور گھر کو چاروں طرف سے دیکھتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا۔

''بہتر ہوگا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ اگر آ کاش کو پتہ چل گیا کہ تم بنا مقصد ہی' بنا اجازت اُس کے گھر میں گھسے ہو تو بہت بُرا ہوگا ایس پی صاحب۔'' ماسی غرائی۔

''رسی جل گئی مگر بل نہیں گئے۔ سیانے سچ ہی کہتے ہیں کہ طوائف اُسی کا طواف

کرتی ہے جس کی جیب بھاری ہو۔ یہ کسی اچھے خاصے تگڑے بندے کو پانسا ہے۔ میرا مطلب ہے تمہاری زبان میں اُسے شکار کہتے ہیں۔ دیکھو صنم میں اس شہر میں ایس پی ہوں۔ مجھے تمہاری پرانی زندگی سے کیا لینا دینا۔ میں صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ اگر وہ حرامزادہ آکاش آئے تو اُسے میرے آفس ضرور بھیجنا۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھتا ہوا باہر کی جانب جانے لگا اور دروازے سے مڑ کر واپس دیکھتا ہوا بولا۔ ''ایک بار پھر ملاقات ہوگی صنم! یعنی جانو جی!'' یہ کہہ کر وہ جانے لگا تو ماسی نے آواز دی۔ ''رُکو ایس پی اختر حسین ....!''

''اگر تم آج ایس پی ہو اور میں جانو ہوں تو گھر جا کر اپنے ماضی میں ضرور جھانکنا کہ تم بھی اُسی کوٹھے کی پیداوار ہو جس پر میں مُجرا کیا کرتی تھی۔ آج کا ایس پی کل کا تماش بین تو تھا ہی۔ مگر ایک طوائف کا بیٹا بھی تھا۔'' ایس پی کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔

''ایک تماش بین کی عیاشی کا پھل ہو تم..........!'' ایس پی کے پسینے چھوٹ گئے۔

''مجھے ڈرانے دھمکانے کی بجائے جاؤ اور جا کر اپنے اس تماش بین باپ سے پوچھو جو نگینہ بائی کے کوٹھے پر چکر لگایا کرتا تھا اور اس پر دولت لٹایا کرتا تھا۔ یہ اسی پیار اور دولت کی ہوس کا نتیجہ ہے کہ تم جیسا حرامزادہ آج پولیس آفیسر ہے۔''

''صنم بائی! اپنی زبان کو لگام دو۔'' اختر حسین چیخ پڑا۔

''معاف کرنا اختر حسین! یہ طوائف کی زبان ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم میرا ماضی کھنگالو۔ تمہیں صرف اس لیے تمہاری پہچان کرائی ہے کہ آئندہ کبھی یہاں آنے کی جرأت مت کرنا اور اگر کبھی راہ گلی میں چلتے ہوئے آمنا سامنا ہو جائے تو مجھے صنم بائی کہنے کی بجائے ماں سمجھ کر سلام کرنا اور اپنا راستہ ناپنا۔ سمجھے! اگر مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تو یہ ماسی جانو کی زبان صنم بائی کی زبان بن جائے گی اور جب ایک طوائف کی زبان کھلتی ہے تو حکمرانوں کے تاج و تخت کے پائے ہلنے لگتے ہیں اور تم تو ایک معمولی ایس پی ہو۔ تم جیسے عہدوں کے لوگ ہمارے کوٹھوں پر تماش بینوں کو شراب پلانے کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ جس طرح کوٹھی کے باہر کتا رکھا جاتا ہے! اب دفع

ہوجاؤ یہاں سے! آکاش آ گیا تو اور بھی بُرا ہوگا.....'' ماسی نے اُسے باہر نکال کر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ اختر حسین غصے میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس کا چہرہ غصے کی تمازت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ صنم کو کچا کھا جائے۔

''تم سے تو ضرور ملوں گا صنم بائی! اور سلام بھی کروں گا۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

ماسی جانو نے دروازہ بند کرنے کے بعد چھت کو گھورنا شروع کر دیا۔ کچھ لمحات یونہی گزر گئے۔ وہ اندر اپنے کمرے کی طرف بڑھی اور لوہے کی سیف الماری کھول کر اس میں سے ڈائری نکالی اور اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ کچھ اوراق اُلٹ پلٹ کر پڑھنے کے بعد اس پر کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ وہ لکھتی گئی یہاں تک کہ رات گہری ہونے لگی مگر اس کا ہاتھ نہ رُک سکا۔ مسلسل کئی گھنٹے لکھنے کے بعد اس نے ڈائری بند کر کے ایک ٹھنڈی آہ بھری تو گھڑی پر نظر پڑی۔ وہ چونک گئی۔ صبح صادق کا وقت تھا۔ دروازے پر گھنٹی کی آواز سن کر وہ ایک بار پھر چونکی۔ اس وقت کون آ گیا۔ کہیں ایس پی دوبارہ تو نہیں آ گیا۔ ماسی نے جلدی سے الماری کھول کر ڈائری اس میں رکھی اور الماری کو تالہ لگائے بغیر ہی جلدی سے دروازے کی طرف بڑھی کیونکہ کال بیل مسلسل بج رہی تھی۔ اگر ایس پی ہوا تو وہ اُسے گولی مار دے گی۔

''کون ہے؟'' ماسی نے دروازے کے پاس آ کر پوچھا تو باہر سے آواز آئی۔

''ماسی! میں ہوں آکاش! دروازہ کھولیے۔''

آکاش کی آواز سُن کر وہ خوشی سے دیوانی ہوگئی۔ اُس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔

''سامنے آکاش اور شمع کو دیکھ کر ماسی حیرت اور خوشی کے لیے ملے جُلے تاثرات پر قابو نہ رکھ سکی اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''آکاش پتر! تم کہاں چلے گئے تھے؟ پتر میں تمہارے بنا کتنی اکیلی ہوجاتی ہوں۔ اس کا تمہیں اندازہ نہیں ہے۔'' آکاش نے آگے بڑھ کر ماسی کو گلے لگا لیا۔ اور شمع کو اشارہ کیا کہ وہ دروازہ بند کر دے۔

''میں آ گیا ہوں نا ماسی! اب تم کوئی فکر نہ کرو۔ دیکھو میں بہت بھوکا ہوں۔ مجھے کھانا کھانا ہے۔'' آکاش نے ماسی کو چپ کرانے کی خاطر کہا۔ وہ جانتا تھا کہ ماسی سے

اس کی بھوک برداشت نہیں ہوتی اور وہی ہوا۔ ماسی فوراً آنسو پونچھتے ہوئے کچن میں گھس گئی۔ وہ شمع کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اچانک باہر کا دروازہ زور زور سے بجنے لگا۔

☆..............☆

جنرل شفیع خان اور آکاش کے فرار ہوجانے کے بعد گوپال پاگل سا ہوگیا تھا۔ وہ اپنے آدمیوں پر برس رہا تھا۔ سب سے پہلے تو انہوں نے سکندر ہوٹل چھوڑ دیا تھا' کیونکہ وہ ٹھکانہ آکاش کی نظروں میں آ چکا تھا اور ویسے بھی یہ ہوٹل جنرل صاحب کی ملکیت تھا۔ وہ آکاش کو تین دن سے ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کے آدمی شہر میں ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے اور پھر اب تو فلم بھی جنرل اور آکاش کے پاس تھی جس میں کافی کچھ تھا جو گوپال اور گیلانی کے خلاف ثبوت تھا۔ وہ جلد سے جلد فلم حاصل کر کے اُسے ضائع کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ آکاش اور جنرل گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوگئے تھے۔

گوپال اپنے نئے ٹھکانے پر تھا کہ موبائل کی گھنٹی نے اُسے گہری نیند سے جگا دیا۔ اس نے نمبر دیکھا تو اسی کے گروپ کے آدمی کا نمبر تھا وہ جھلایا ہوا بولا۔

''بکو! اس وقت کیوں کال کی؟''

''سر! معافی چاہتا ہوں' لیکن آپ کو ایک خبر ایسی دوں گا کہ آپ کی نیند اُڑ جائے گی۔'' دوسری جانب سے کہا گیا تو وہ اور بھی جھلاہٹ کا شکار ہوگیا۔

''جلدی بات کرو۔ تمہید مت باندھا کرو۔''

''سر آکاش اس وقت ماسی جانو یعنی اپنے گھر میں موجود ہے اور ساتھ میں جنرل کی بیٹی بھی ہے۔''

یہ خبر سننا تھی کہ واقعی اس کی نیند اڑ گئی وہ فوراً بول پڑا۔

''تم سب لوگ مسلح ہو کر وہاں پہنچو' میں بھی آ رہا ہوں۔ کسی قسم کی کوئی بھی کارروائی میرے آنے پر ہوگی اور ہاں آکاش اگر گھر سے نکلنا چاہے تو گولی مار دینا۔'' یہ کہہ کر اس نے موبائل بند کر دیا اور اپنا لانگ کوٹ پہن کر جیبوں کو چیک کیا۔ ریوالور کا چیمبر کھول کر چیک کیا اور تسلی کرنے کے بعد وہاں سے چل پڑا۔ خالی سڑک پر گاڑی دوڑائے جا رہا تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں آکاش پھر سے نہ غائب ہوجائے۔ صبح صادق کا

وقت تھا۔ سڑکوں پر ویرانی اور سناٹے کا راج تھا۔ کہیں دور سے تہجد کی اذان سنائی دینے لگی۔ اس نے سپیڈ اور بڑھا دی۔ ابھی وہ آکاش کے گھر سے دور ہی تھا کہ اس کے آدمی اُسے مل گئے۔ گاڑی سڑک پر کھڑی کر کے وہ لوگ گلی میں داخل ہوئے۔ انہوں نے پوزیشنیں سنبھال لیں اور ایک آدمی نے آگے بڑھ کر پسٹل سے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ پسٹل سے دستک دی جا رہی تھی۔ یقیناً آواز کافی تیز تھی۔ اندر سے ماسی کی آواز آئی۔

''کون ہے اور اس قدر زور سے دروازہ کیوں پیٹ رہے ہو' کیا توڑنا ہے؟''

''دروازہ کھولو بڑھیا۔'' باہر سے کوئی غرایا۔

ماسی سہم کر رُک گئی۔ اس نے آکاش کی طرف دیکھا جو آواز سنتے ہی باہر آ گیا تھا۔ شمع بھی ساتھ تھی۔ اس نے ماسی کو کہا کہ وہ شمع کو لے کر اس گھر کے خفیہ کمرے میں چلی جائے۔ وہ جانے کے لیے تیار نہ تھیں لیکن آکاش کی آنکھوں میں خون اُترا دیکھ کر وہ سہمی ہوئی اندر چلی گئیں۔ آکاش چھت پر پہنچ گیا۔ اس نے منڈیر سے جھانک کر دیکھا اندھیرے میں اُسے کچھ آدمی نظر آئے جن کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا۔ ایک پھر غرایا۔

''خبیث بڑھیا! دروازہ کھولے گی یا توڑ دوں؟'' یہ کہہ کر اس نے دروازہ پھر پیٹنا شروع کر دیا۔ آس پاس کے کئی گھروں کے دروازہ کھلنا شروع ہو گئے تو گوپال نے دو فائر ہوائی کر دیئے۔ یک دم تمام دروازے بند ہو گئے۔ لوگ جانتے تھے کہ آکاش ایک بگڑا ہوا نوجوان ہے۔ ضرور کسی سے جھگڑا ہوا ہوگا۔ ویسے بھی وہاں تمام شریف اور معزز لوگ رہتے تھے۔ وہ لوگ ہر قسم کے جھگڑوں سے دور رہتے تھے۔ یوں بھی آج کل ملک کے جو حالات تھے ہر کسی کو اپنی ہی پڑی ہوئی تھی اور پھر لڑائی جھگڑوں کے بعد پولیس کارروائی یقیناً ایک عذاب تھا۔ دردناک عذاب۔ ہوائی فائرنگ سننے کے بعد آکاش نے چھت سے دو فائر یکے بعد دیگرے کیے۔ وہ لوگ اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھال کر بیٹھ گئے۔ وہ اندھیرے میں تھا مگر اس کی آنکھیں گلی میں دور تک دیکھ سکتی تھیں۔ وہ اسی گلی میں کھیل کر بڑا ہوا تھا۔ ویسے بھی نکڑ پر کھمبے پر لگا بلب جل رہا تھا۔ گوپال اور دوسرے دو ساتھی اس کے دروازے کی طرف گنیں تان کر بڑھے تو اس نے اوپر سے للکارا۔

''حرامزادے! خود ہی مرنے کے لیے آ گیا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک فائر داغ دیا۔ آکاش نشانے کا پکا تھا۔ گولی سیدھی گوپال کے ساتھی کو لگی' وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ گوپال کے ساتھیوں نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ مکان میں ہزاروں سوراخ کر دیئے جبکہ آکاش چھت پر محفوظ تھا۔ گوپال چیخ پڑا۔

''ٹھہرو! رُک جاؤ۔'' اس کے کہنے پر فائرنگ بند ہو گئی۔ وہ بول اٹھا۔

''کُتے کے پلّے! مرد بننے کا اتنا ہی شوق ہے تو اندھیرے سے باہر نکل اور سامنے آ۔''

آکاش نے چھت سے گلی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں پسٹل لیے گوپال کے سامنے کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ گوپال اس اچانک افتاد سے گھبرا کر کوئی کارروائی کرتا' آکاش نے آگے بڑھ کر پسٹل اس کی کنپٹی پر لگا دیا۔ اپنا دوسرا پسٹل اس نے جیب میں ڈال کر گوپال کا ریوالور چھین لیا اور بولا۔

''اپنے ان کتوں کو بول کہ اپنے ہتھیار پھینک دیں۔ ویسے بھی اب یہ تمام میگزین خالی کر چکے ہیں۔ کوئی ہوشیاری نہ کرے ورنہ اس بڑے سؤر کی موت پر رونے کے لیے کسی کو زندہ نہ چھوڑوں گا۔ یاد رکھنا میرا نام آکاش ہے' آکاش! اور میری نظر پاتال تک جاتی ہے۔'' یہ کہہ کر اُس نے ایک جانب فائر کر دیا جہاں ایک اور چیخ اُبھری اور پھر خاموشی چھا گئی۔

''گوپال! میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میری نگاہ پاتال کی گہرائی تک جاتی ہے۔ میں ایک دو تین گننے کا عادی نہیں ہوں۔ بولو اپنے ان بھونکنے والے کتوں سے کہ ہتھیار پھینک دیں ورنہ اگلا لمحہ تمہاری کھوپڑی میں روشن دان بنا دے گا۔''

گوپال نے کہا کہ ہتھیار پھینک دو اور گلی سے باہر چلے جاؤ۔ وہ کافی گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کی ساری اکڑ نکل گئی تھی۔ اس کے پانچ ساتھی اپنے اپنے ہاتھوں سے اسلحہ پھینک کر گلی کی نکڑ پر کھڑے ہو گئے۔ اب آکاش اور گوپال گلی میں رہ گئے۔ کسی نے پولیس کو فون کر دیا تھا اور ویسے بھی جتنی گولیاں چلی تھیں ان کی آواز سے سارا شہر گونج اٹھا تھا۔ پولیس کی گاڑیاں ہُوٹر بجاتی ہوئی آ رہی تھیں۔ پولیس والوں نے آتے ہی سب سے پہلے گوپال کے ساتھیوں کو گرفتار کیا اور پھر وہ گلی میں داخل ہو گئی۔ ساری گلی والے جاگ گئے تھے۔ گھروں کے باہر لگی لائٹیں جل رہی تھیں۔ دو لاشیں گلی میں پڑی

ہوئی تھیں۔ انسپکٹر علی شیر اپنی فورس کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے آتے ہی گوپال کو حراست میں لے لیا حالانکہ قصور آکاش کا بھی تھا' لیکن وہ لوگ اس کے خوف سے کانپتے تھے اور سچی بات تو یہ کہ منتھلی کھاتے تھے۔ وہ گوپال کو لے کر جانے لگے تو وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''یاد رکھنا آکاش! میرا نام گوپال ہے۔ گوپال ورما' جس طرح تمہارے در و دیوار گولیوں سے چھلنی کیے ہیں' اسی طرح تمہارے جسم میں اتنے ہی سوراخ کروں گا۔ تیرا خون پی جاؤں گا' تیرا خون پی جاؤں گا آکاش! تو نہیں جانتا تو نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑا ہے۔ ان کے ڈنک تمہاری رگوں میں بوند بوند زہر بھر دیں گے! بوند بوند زہر!''

وہ مسلسل چیخ رہا تھا اور پولیس اُسے گھسیٹتی ہوئی گاڑی میں بٹھا کر لے گئی اور دوسری گاڑی میں دو لاشیں رکھی گئیں۔ یہ آکاش اور پولیس کے لیے معمول کی کارروائی تھی لیکن اہل محلّہ پر دو قتلوں کی دہشت طاری ہو گئی تھی۔ خوف اور ڈر کے مارے کوئی بھی گھر سے باہر نہ نکلا' مگر سب کے کان دروازوں پر لگے ہوئے تھے۔ آکاش نے اردگرد دیکھا۔ وہ گلی میں تنہا کھڑا تھا۔ اس نے تقریر کرنے والے انداز میں کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولنا شروع ہوا:

''میرے محترم محلے دارو! یہ تمام کارروائی تمہارے سامنے ہوئی ہے' لیکن تم سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی اندھے بن کر رہو گے۔ گونگے بہروں کی طرح۔ بس تم کچھ نہیں جانتے' کچھ نہیں سمجھتے۔ جو کوئی بھی اس معاملہ میں زبان کھولے گا اس کی زبان کاٹ دی جائے گی۔ آنکھیں نکال کر چیل کوؤں کو کھلا دی جائیں گی۔ ویسے بھی اب تھوڑی دیر بعد سورج نکلنے والا ہے۔ اٹھ کر سورج نکلنے سے پہلے پہلے نماز پڑھو اور اللہ سے توبہ کرو۔ سلام علیکم!'' یہ کہہ کر وہ اپنے گھر کا دروازہ کھول کر اندر چلا آیا جو کہ ماسی اور شمع نے کھول دیا تھا اور حیرت سے آکاش کو دیکھ رہی تھیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ خون کر رہا تھا اور اب لوگوں کو پیار بھرے انداز میں دھمکا بھی رہا تھا اور نماز کی تلقین بھی کر رہا تھا۔

جنرل کو تمام تفصیلات بتانے کے بعد آکاش کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا۔ وہ شمع کو ماسی کے پاس چھوڑ کر تہہ خانہ میں جا کر لیٹ گیا۔ وہاں پر اس نے بہت اچھا انتظام کیا ہوا تھا۔ پُرسکون جگہ تھی۔ ہر قسم کے شور شرابے سے پاک۔ ضرورت زندگی کی تمام اشیاء

موجود تھیں۔ نفیس اور عمدہ بیڈ پر لیٹتے ہی اُسے نیند آ گئی۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور پھر اس اُچھل کود نے اُسے اور بھی تھکا دیا تھا۔ وہ نجانے کتنی دیر اور سویا رہتا لیکن شمع نے آ کر جگا دیا کہ تھانہ سے فون آیا ہے۔ ایس پی صاحب تمہیں بلا رہے ہیں۔ اس نے سب سے پہلے تو شمع اور ماسی کو محفوظ کرنے کے لیے جونیئر سے رابطہ کیا۔ وہ ایک گھنٹہ بعد پہنچا اور دونوں کو لے کر چلا گیا۔ یقیناً اُن دونوں کی زندگیاں خطرے میں تھیں۔ وہ لوگ بہت ہی خطرناک تھے۔ صرف گوپال ہی نہیں اور بھی لوگ ہوں گے کیونکہ ان جیسے گروپوں کے کئی کئی ٹھکانے اور کئی افراد کام کر رہے ہوتے ہیں۔ سرغنہ کوئی اور ہی ہوتا ہے۔ وہ ہر قسم کی پریشانی سے فارغ ہو کر گھر کو تالہ لگا کر جانے لگا تو دیکھا کہ تمام تر کھڑکیوں اور روشن دانوں کے شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ دیوار پر گولیوں کے جگہ جگہ نشان تھے اور کئی جگہ سے پلستر اکھڑ چکا تھا۔ جہاں ایک کتے کو گولی مار کر گرایا تھا' ابھی تک وہاں خون پڑا ہوا تھا۔ پولیس والوں نے اس خون کے اردگرد اینٹیں رکھ دی تھیں۔ گلی ابھی تک سنسان پڑی ہوئی تھی جبکہ دوپہر کے گیارہ بج چکے تھے۔ گلی کی نکڑ پر دو کانسٹیبل پہرہ دے رہے تھے جو کہ بے سود تھا۔ محض کارروائی ہی تھی۔ وہ تھانے کی طرف چل پڑا۔

علی شیر نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا' کیونکہ وہ ان کا مائی باپ تھا۔ وردی تو اس نے برائے نام ہی پہنی تھی ورنہ وہ تو آکاش جیسے غنڈوں کے کام آتا تھا اور وہ اس کے کام آتے تھے۔

''کہو کیا بات ہے؟'' اس نے جاتے ہی کرسی گھسیٹ کر سیدھی کی اور بیٹھتے ہوئے علی شیر سے پوچھا۔

''بات میری جیب سے نکل کر اوپر تک پہنچ گئی ہے آکاش بھائی! آپ کو تو علم ہے کہ علی شیر آپ کا خادم ہے۔ آپ کو ایس پی صاحب نے یاد فرمایا تھا۔'' علی شیر نے اپنے ہاتھ کو کھجاتے ہوئے کہا۔

''اس وقت ایس پی اختر حسین ہی ہے نا؟'' اس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

''جی آکاش بھائی! آپ اُن سے مل لیں۔'' علی شیر نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

''ایس پی سے بھی مِل لوں گا۔ تم کہو وہ کتا کہاں ہے؟''

''کون کتا......؟ وہ گوپال ورما۔ وہ تو ابھی تک اپنے قبضے میں ہے۔ ایس پی صاحب نے ابھی تک پرچا نہیں کاٹا اور نہ ہی کوئی کارروائی کی ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتے تھے۔''

''ٹھیک ہے' میں چلتا ہوں لیکن ذرا اس حرامی کے درشن کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ملواؤ اس سے۔'' وہ علی شیر کے ساتھ چلتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں پر گوپال اور اس کے ساتھی قید تھے۔ گوپال اُسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور سلاخوں کے قریب آ کر کہنے لگا۔

''آکاش! تم نے اپنی گردن میں ہمارا پھندہ کس لیا ہے۔ بس اب ایک جھٹکے کی ضرورت ہے۔ نہ تم ہو گے اور نہ تمہارا یہ ملک!''

''اس ملک کو اللہ اور نبیؐ کی رحمت سے ہر طرف سے خیر ہی خیر ہے۔ تم جیسے بھونکنے والے کُتے دو تین مرتبہ اِدھر سے ہڈی کھانے کے لالچ میں آئے تھے' لیکن ادھر کے شیر بھی جاگ رہے تھے۔ انہوں نے ان کتوں کے بھونکنے اور کاٹنے سے پہلے ہی اپنی دھاڑ اور گھن گرج سے ان کی ہوا نکال دی۔ وہ اپنی لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ شاید تم اپنے ملک کی تاریخ نہیں پڑھتے۔'' آکاش نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''اور ہاں! بہت جلد تم سے پھر ملاقات ہو گی۔ میں تم سے سب کچھ بکواؤں گا کہ تمہاری چال' تمہارا پلان' تمہارا مقصد اور تمہارا گروپ کیا ہے' یہ میرا وعدہ ہے اور تم بکو گے' بائے بائے!'' وہ جانے لگا تو گوپال کی آواز اس کا پیچھا کرنے لگی اور وہ ٹھہر گیا۔ ''کسی بھول میں نہ رہنا! میری ہڈیوں سے گودا نکال سکتے ہو لیکن میری زبان سے کوئی بھی لفظ نہ سن سکو گے۔''

آکاش وہاں سے چل پڑا۔ وہ ایس پی ہاؤس جا کر اختر حسین سے ملنا چاہتا تھا۔ اور پھر یہ کہ اختر حسین بھی اس سے ملنا چاہتا تھا۔ آج کے واقعے نے شہر بھر میں تھرتھلی مچا دی تھی۔ ضمیمے چھپ گئے تھے۔ لوگ دھڑا دھڑ خرید کر پڑھ رہے تھے اور آکاش کے گھر کی جانب دوڑ رہے تھے' لیکن پولیس کا پہرہ دیکھ کر وہیں رک جاتے یا واپس آ جاتے' کیونکہ کراچی شہر میں یہ وارداتیں ہوتی رہتی تھیں اور متعلقہ علاقہ سہم جاتا تھا جبکہ باقی سارا شہر کاروبار میں مگن ہو کر اپنا دن گزار دیتا تھا۔ انہیں تو یہ بھی علم نہ ہوتا تھا

کہ وہ گھر سے نکلے ہیں تو واپس بھی آئیں گے یا کسی تنظیم یا دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ جائیں گے۔

ایس پی اور آکاش آمنے سامنے والی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ایس پی اختر حسین بولا۔

''آج تم پر یعنی تمہارے گھر پر جو حملہ ہوا ہے وہ یقیناً کسی کی جان بھی لے سکتا تھا اور جو دو جانیں ضائع ہوئی ہیں' مجھے ان کی بھی فکر ہے......''

''تو عدالت میں جاؤ' میرے خلاف گواہ تلاش کرو۔ مجھ پر کیس کرو اپنی تمام تر قانونی ڈگریوں کا استعمال کرو۔ شاید تمہاری فکر دور ہو جائے۔'' آکاش اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو آکاش! میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو اور کن دھندں میں ملوث ہو اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے خلاف کوئی بھی زبان نہ کھولے گا۔ نہ کوئی گواہ ہے اور نہ کوئی ثبوت۔ میں نے ابھی تک اُن پر کسی بھی دفعہ کے تحت پرچا نہیں کاٹنے دیا اور تم جانتے ہو کہ جو ایس پی اختر حسین کہے گا وہی ہو گا۔''

''مطلب کی بات کرو۔ میرا وقت قیمتی ہے!'' آکاش بے نیازی سے بولا۔ وہ پیپر ویٹ کو گھما کر کھیل رہا تھا۔ ''یہ سوچ کر بات کرنا کہ تم نے قانون پڑھا ہے اور میں اسی قانون کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے جوان ہوا ہوں اور قانون کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔''

''اگر ان مجرموں کو میں بغیر کوئی ایف آئی آر درج کیے چھوڑ دوں تو کیسا رہے گا؟''

''اوپر والوں کو کیا جواب دو گے؟''

''اوپر والوں نے کون سا مجرم دیکھے ہیں؟ ان کی جگہ کسی کو بھی پیش کر دوں گا۔''

''کیوں چھوڑو گے؟ تمہارا کیا مفاد ہے؟''

''دس لاکھ کی آفر ہے۔ نئی گاڑی خریدوں گا۔''

''پچیس لاکھ تمہیں ملیں گے۔ گوپال مجھے دے دو۔ باقی ساتھیوں کو ان کاؤنٹر میں پار کر دو۔ بولو سودا منظور ہے؟''

''ڈن! ڈن!'' معاملات طے ہو گئے۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے موبائل سے جونیئر کو فون کیا کہ وہ گاڑی لے کر تھانہ رضا آباد آ جائے۔ ایس پی اختر حسین نے علی شیر

کو فون پر کہہ دیا کہ وہ گوپال کو آکاش کے حوالے کر دے۔ ''مگر سر؟!'' علی شیر نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

''تمہاری زبان کو شہد لگ جائے گا۔ اور سنو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور باقی تفصیلات میرے آفس میں آ کر طے کرلو!'' یہ کہہ کر اختر حسین نے فون بند کر دیا۔

'آج رات رقم تمہارے گھر پہنچ جائے گی۔ اگر دوغلی پالیسی چلنے کی کوشش کی تو ایس پی کی جو وردی پہنی ہوئی ہے' اسی میں دفن ہو جاؤ گے اور پھر قبر پر ایس پی پولیس اختر حسین شہید لکھا جائے گا۔ جو تمہارے بیوی بچوں کے لیے یقیناً دردناک لمحہ ہوگا۔''

آکاش نے آگے جھک کر ایس پی کے چہرے کا رنگ اڑا دیا تھا' کیونکہ اس کی آنکھوں میں خون اترا دیکھ کر ایس پی کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ آکاش وہاں سے چل دیا۔

گوپال کو ہتھکڑی پہنا کر اس کی آنکھوں پر کالی پٹی کس کر باندھ دی تھی۔ جونیئر بغیر نمبر پلیٹ والی گاڑی لے کر آیا تھا۔ آکاش گوپال کو دھکیلتا ہوا گاڑی میں لایا۔ جونیئر نے گاڑی سٹارٹ رکھی ہوئی تھی۔ آکاش نے جونیئر کو چلنے کے لیے کہا۔ اس نے گوپال کی کمر سے ریوالور لگا کر کہا۔

''کوئی بھی حرکت تمہاری پسلی میں سوراخ کروا دے گی۔ لہٰذا پیار سے سفر کرنا۔ راستے میں کچھ کھانا پینا ہو تو بتا دینا' کیونکہ سفر انتہائی کٹھن اور لمبا ہے۔'' گوپال کچھ نہ بولا فقط زہریلی مسکراہٹ اس کے لبوں پر رینگ گئی۔ گاڑی پوری سپیڈ سے سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ جونیئر آکاش کا اشارہ سمجھ گیا تھا کہ سفر طویل ہے۔ لہٰذا وہ بے مقصد ہی سڑکوں پر گاڑی دوڑا رہا تھا۔ کوئی دو گھنٹے یونہی گزر گئے تو گاڑی جنرل شفیع خان کے فارم کی طرف مڑ گئی۔ وہاں پہنچ کر گوپال کو گھسیٹ کر نکالا گیا۔ وہ لوگ اُسے تہہ خانہ میں لے گئے۔ آکاش کے تمام ساتھی وہاں جمع ہو گئے جبکہ شمع نظر نہ آ رہی تھی۔ گوپال کو ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے پٹی ہٹائی گئی تو چند لمحوں کے لیے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں' کیونکہ وہ انتہائی شان دار قسم کا کمرہ تھا۔ اس کے سامنے جونیئر اور آکاش جانے پہچانے چہرے تھے جبکہ باقی گروپ کو بھی وہ جانتا تھا کیونکہ یہ وہی لوگ تھے جنہیں قید کیا گیا تھا اور مظالم کر کے مانی کی ٹانگ توڑ دی گئی تھی۔

''اچھی طرح آنکھیں کھول لو مسٹر گوپال! کیونکہ اب میں جس شخصیت سے تمہیں ملواؤں گا' وہ تمہارے لیے نیا چہرہ نہیں ہے۔ تمہاری آمد کا انہیں شدت سے انتظار تھا۔''

آکاش نے اس کے سامنے کرسی رکھی اور بیٹھ گیا۔ جنرل صاحب کو اطلاع کر دی گئی تھی۔ وہ سیڑھیاں اُتر رہے تھے تو گوپال انہیں دیکھ کر چونک گیا اور لبوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا:

''سُسر جی! اوہ تو گوپال ورما سُسر جی کا مہمان ہے؟''

جنرل نے گوپال کے پاس آ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور نفرت سے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کیا۔ تھپڑ اتنا شدید تھا کہ گوپال کا ہونٹ پھٹ گیا۔

''آکاش! میں اس کُتے کو نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے میری بیٹی کو تڑپا تڑپا کر مارا ہے۔ اس نے اُسے سرعام اپنے تمام لوگوں کے سامنے برہنہ کیا۔ اس نے میرے داماد کو گولیوں سے بھون دیا تھا۔ اس نے میری بیٹی کی آہیں اور فریاد نہ سُنی۔ آکاش! میں اس کے اتنے ہی ٹوٹے کروں گا جتنے آنسو میری بیٹی کی آنکھوں سے بہے تھے۔'' جنرل صاحب رو رہے تھے' انہیں اپنی مردہ بیٹی یاد آ رہی تھی۔ وہ سسکیاں بھر بھر کر اونچی آواز میں رو رہے تھے اور بول بھی رہے تھے۔

''کیا بگاڑا تھا میری بیٹی نے تمہارا؟ کیوں تم نے میری ہنستی بستی دنیا اُجاڑ دی۔ تم نے میری زندگی اجیرن کر دی گوپال ورما! ایک' ایک بھی لمحہ میں نے سُکھ کا نہیں گزارا جس دن سے میری بیٹی اس دنیا سے رخصت ہوئی ہے' ہر روز' ہر لمحہ' ہر پل' ہر وقت وہ میرے سامنے رہتی ہے۔ مجھ سے اپنا مجرم مانگتی ہے۔ انصاف مانگتی ہے مجھ سے' انصاف!'' ایک اور تھپڑ گوپال کے چہرے پر پڑا۔ اس بار اس کا داہنا گال پھٹ گیا تھا۔

''آکاش! مجھے پسٹل دو میں اس کے سر اور آنکھوں میں گولیاں ماروں گا۔ وہ میری بیٹی نہیں میری کائنات تھی۔ اس نے چھلنی کر دیا میری کائنات کی عزت کو۔ میری پھولوں جیسی بیٹی کو مٹی میں روند ڈالا اس نے۔ اپنی ہوس اور درندگی کی بھینٹ چڑھا دیا اس نے میری بیٹی کو! میں اسے نہیں چھوڑوں گا!'' وہ آکاش کی جیب سے پسٹل لینے کے لیے لپکے مگر اس نے انہیں تھام لیا اور گلے لگاتا ہوا بولا:

''جنرل صاحب! اپنے آپ کو سنبھالیے۔ سنبھالیے جنرل صاحب! اسے ایک گولی سے نہیں ماریں گے ہم۔ میں اس سے وہ سارے راز اگلواؤں گا جن کی خاطر آپ کی بیٹی اور داماد نے جان دی ہے۔ یہ پورا گروپ ہے۔ اسے مارنے سے ہم کامیاب نہ ہوں گے بلکہ ایک بار پھر اندھیرے میں ڈوب جائیں گے۔ کنٹرول یور سیلف پلیز جنرل پلیز! ریلیکس ہو جائیے۔ اب یہ اِدھر ہی ہے۔ صرف اسے ختم کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے بلکہ ہم پورے گروپ کا خاتمہ کریں گے اور ان کا مقصد بھی دفن کریں گے۔ پلیز آپ ریلیکس ہو جائیں۔'' اس نے راجو کو اشارہ کیا۔ وہ اور جونیئر جنرل کو لے کر اوپر چلے گئے۔

جنرل کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ ان کی بیٹی ایک بار پھر ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کی بیٹی سحرش مسکرا رہی ہے اور اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے ان کے آنسو صاف کر رہی ہے۔ انہوں نے تصور ہی تصور میں اس کا ہاتھ چوم لیا۔

''گوپال ورما! اب جو کچھ بھی ہے سچ سچ بولنا شروع کر دو' کیونکہ تم آکاش کو نہیں جانتے۔ مردے کی ہڈیوں سے اگلوا لیتا ہے کہ وہ کب مرا تھا۔ کیسے اور کیوں مرا تھا۔ چلو میرا لال جلدی کرو۔'' آکاش نے گوپال کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔

'اپنی کوشش کر دیکھو! کیونکہ شیر چاہے پنجرے میں ہو' چاہے جنگل میں یا پھر تم جیسے چوہوں کی قید میں' شیر شیر ہی ہوتا ہے۔ نہ میں مردہ ہوں اور نہ ہی اپنی زبان اب کے بعد کھولوں گا۔ تم جو بھی کر سکتے ہو کر کے دیکھ لو۔ اب اس الفاظ کے ساتھ ہی ہمارا تمہارا زبانی رابطہ منقطع ہوتا ہے۔ نمستے!'' گوپال نے بھی ترکی بہ ترکی جواب سے نوازا۔ اس کا داہنا گال جنرل صاحب کے تھپڑ نے پھاڑ دیا تھا۔ اس کے منہ اور ہونٹوں سے ہلکا ہلکا خون رس رہا تھا۔ اُس کا چہرہ بھیانک ہو گیا تھا۔

''دیکھو مٹی کے شیر اور گھاس کھانے والے گدھے! تمہیں یہ نہیں معلوم کہ تم ہماری قید میں ہو۔ اُلو کے پٹھے! تمہاری رگ رگ بولے گی کہ تم کون ہو۔ تمہارا کوئی باپ بھی ہے یا حرامی ہو۔ راجو وہ انجکشن لو جو مردوں کی زبان میں زندگی ڈال دیتا ہے۔'' اس نے راجو کو اشارہ کیا۔ وہ اوپر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد شمع' ماسی جانو' جنرل اور راجو نیچے

آئے۔ شمع حیرت سے گوپال کو دیکھ رہی تھی۔ یہی حال ماسی کا بھی تھا۔ راجو نے آگے بڑھ کر وہ انجکشن آکاش کو تھما دیا۔ سرنج میں بھرنے کے بعد اس نے وہ انجکشن گوپال کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

''اس کو جب میں تمہارے جسم میں انجیکٹ کروں گا تو تمہاری ہر سانس یہی گائے گی کہ تم کون ہو۔ جنرل صاحب! آپ کھانا لگوایئے۔ میں آپ کو ایک ہائی سٹینڈرڈ تماشا دکھانا چاہتا ہوں۔'' اس نے جنرل صاحب کو کہا۔ اُسی وقت کھانے کا آرڈر دیا گیا جو کہ تیار ہی تھا' کچھ ہی دیر میں ٹیبل پر لگ چکا تھا۔ تمام لوگ ٹیبل کے گرد بیٹھ گئے۔ دو کرسیاں خالی تھیں۔

آکاش نے وہ ٹیکہ گوپال کے بازو میں انجیکٹ کر دیا۔ وہ تھوڑا سا کسمسایا مگر بندھا ہونے کی وجہ سے کوئی حرکت نہ کر سکا۔ ''ہمارے کھانا کھانے تک تمام جوابات ذہن میں حاضر ناظر کر لو کیونکہ میرا کافی ٹائم تم نے ضائع کر دیا ہے۔'' آکاش نے گوپال سے کہا اور خود تمام لوگوں کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا۔

گوپال ضد کا پکا تھا۔ ابھی تک اس نے ایک بھی لفظ نہ بولا تھا۔ مگر یکدم اس کے چہرے کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا۔ اس کی نسیں پھولنا شروع ہو گئیں۔ وہ بار بار تھوک نگل رہا تھا۔ جنرل اور دوسرے تمام لوگ بے فکر ہو کر کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ دس پندرہ منٹ اسی طرح گزر گئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر آکاش نے تمام برتن اٹھوا دیئے۔ ٹیبل پر صرف ایک جگ پانی کا بھر کر رکھ دیا۔ وہ تمام لوگوں کو اپنی اپنی جگہ پر بیٹھنے کا کہہ کر گوپال کے سامنے خنجر نکال کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

''ہاں' اب اگر کہو تو سوال دُہراؤں؟''

''پپ...... پپ...... پپ...... پا...... پانی...... پانی پلاؤ مجھے۔ میری رگیں کٹ رہی ہیں۔ میری سانسیں ٹٹ ٹٹ ٹوٹ رہی ہیں۔ پلیز! پلیز!'' اس کی حالت دیدنی تھی۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ آکاش نے آگے بڑھ کر اس کی رسیاں کھول دیں۔ تمام لوگ حیرت سے وہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ رسیاں کھلتے ہی گوپال بھاگتا ہوا پانی کی طرف بڑھا' لیکن آکاش کے ساتھی نے پانی کا جگ اٹھا لیا اور گوپال اس کی طرف لپکا۔ وہ قابل رحم حالت میں چلاّ رہا تھا' چیخ رہا تھا۔

"تمہیں بھگوان کا واسطہ! تمہارے خدا کا واسطہ! پلیز! جنرل پلیز! مجھے پانی پلا دو' میرے اندر آگ بھڑک رہی ہے۔ پلیز! آکاش پلیز! ماں جی! اے ماں! تو تو میری ماں جیسی ہے! بول بول ان سے کہ یہ مجھے پانی کی ایک بوند ہی دے دیں۔" وہ باری باری سب کے پاس جاتا اور پانی کے لیے منتیں سماجتیں کرتا' لیکن سبھی لوگ آکاش کے اشارے کے منتظر تھے۔ وہ جگ آکاش کے پاس پہنچ چکا تھا۔ گوپال گرتا پڑتا آکاش کے قدموں میں گر گیا اور گڑگڑانے لگا۔ "آکاش پلیز! تمہیں تمہارے اللہ کا واسطہ! رسولؐ کا واسطہ! میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گا' سب کچھ! مجھے ایک گھونٹ پانی دے دو۔ پلیز......!"

"تمہیں ایک گھونٹ پانی صرف اس لیے دے رہا ہوں کہ تم اپنے حواس بحال کرلو۔ میرے کسی بھی سوال کا جواب غلط ہونے کی صورت میں تمہیں ایک نہیں بلکہ تین ایسے ہی انجکشن لگا دیئے جائیں گے۔ خود تصور کرو تمہارا حال ایک ہی ٹیکے سے کیا ہو گیا اور پھر تین انجکشنوں سے تمہاری رگیں کٹ جائیں گی۔ تمہاری نسیں پھٹ کر تمہارے جسم سے باہر آجائیں گی۔ بولو کیا خیال ہے؟" آکاش نے جگ اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ وہ بے صبری سے بولا:

"میں سب کچھ بتاؤں گا۔ مجھ سے یہ دردناک عذاب برداشت نہیں ہو پا رہا۔ پلیز! پلیز! پپ پانی!" آکاش نے ایک گلاس بھر کر اُسے دیا۔ وہ غٹا غٹ پی گیا۔ اور گلاس ایک بار پھر آکاش کی طرف بڑھا دیا۔ مگر آکاش نے وہ بھرا ہوا جگ اور گلاس زمین پر پھینک دیا۔ اس میں سے تمام پانی گر کر نیچے زمین پر بہہ گیا۔ وہ کتوں کی مانند ہاتھ پاؤں کے بل چلتا ہوا پانی زمین سے اپنی زبان کے ساتھ چاٹنے لگا۔ وہ بولا:

"اور پانی دو' مجھے اور پانی دو! میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔ میرے وجود میں آگ بھر گئی ہے۔ پلیز!"

"اب بتاؤ' تم کون ہو؟" آکاش بولا۔ "فرفر بولنا شروع ہو جاؤ' کیونکہ اس کے بعد ایک اور ٹیکہ راجو نے تمہارے لیے تیار کر رکھا ہے۔" راجو نے اثبات میں سر ہلا کر گواہی دی اور آگے بڑھ کر بھری ہوئی سرنج آکاش کو دے دی جس میں پہلے محلول جیسا سرخ رنگ کا مادہ بھرا ہوا تھا۔

"میں بتاتا ہوں' بتاتا ہوں' پلیز! یہ دردناک عذاب مجھے مت دو۔ میں مرنا نہیں چاہتا پلیز! میں شروع سے آخر تک بتاتا ہوں۔ ایک گلاس پانی پلیز!" اس نے یتیموں جیسی شکل بنا رکھی تھی۔ اس کی حالت پر ترس آ رہا تھا مگر یہاں سبھی اس وقت خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے اور آکاش کی طرف متوجہ تھے' کیونکہ کوئی بھی گوپال کی حالت پر رحم نہیں کھا سکتا تھا۔ اس کا جرم بہت بڑا تھا۔ بہت بڑا جرم جو ناقابلِ معافی تھا۔ وہ پانی کا ایک گلاس اور پی کر بولنا شروع ہوا۔

"میرا نام گوپال ورما ہے۔ انڈیا کے صوبے آسام سے تعلق ہے۔ تخریب کارانہ ذہن کی بدولت ایک مجرم گروپ سے تعلق پیدا ہو گیا۔ تقریباً سو سے زائد لوگ اس گروپ میں شامل ہیں۔ ان کا مشن مختلف ملکوں میں جا کر امیر لوگوں کی خوبصورت لڑکیوں کو اپنے جال میں پھنسا کر ان سے شادی کرنا ہے اور پھر انہیں سیر کرانے کے بہانے انڈیا لے جا کر ہم طوائفوں کو بیچ دیتے ہیں۔ اُن لڑکیوں سے جسم فروشی کا دھندہ کروایا جاتا ہے۔ نہ کرنے کی صورت میں اس لڑکی کا چہرہ تیزاب سے جلا کر اُسے انڈیا کے کسی بھی شہر کی سڑکوں پر بھیک مانگنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پھر ساری جوانی اور ساری عمر لڑکی ایسے ہی گزار دیتی ہے۔

میرے سپرد اس ملک میں یہ شہر کیا گیا ہے۔ کراچی جیسے شہر میں کافی ایسے پولیس آفیسر ہیں' جو پیسے کی خاطر اپنا ایمان اور دھرم بیچ کر ہمیں لڑکیاں سپلائی کرتے ہیں یا پھر ان لوگوں سے ہمارا تعارف کرواتے ہیں' جو امیر و کبیر ہوں' جن کی بیٹیاں جوان ہوں' جیسے ہمارا پہلا تعارف جنرل سے ایس پی گیلانی کی کوٹھی پر ایس پی صاحب نے کروایا تھا۔ ایس پی گیلانی ہمارے گروپ کا مہرہ تھا۔ قانون اور عزت سے کھیلنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ہم جس ملک میں بھی جاتے ہیں وہاں کے شہر میں اپنی اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لیے ہمیں وہاں کے ایم این اے' ایم پی اے' پولیس افسران اور کئی ایسے لوگوں کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے جو ہماری راہ سے رکاوٹوں کو دور کرتے ہیں......میرے کئی ساتھی پنجاب کے شہر لاہور میں بھی کام کر رہے ہیں لیکن میں ان کا ماتحت ہوں کیونکہ لاہور کی ہیرامنڈی سے ہمیں کافی اچھا مال مل جاتا ہے اس لیے وہاں

پر ملہوترا کی ڈیوٹی ہے۔ جو کہ ایک طاقت ور ایم این اے کی سربراہی میں کام کر رہا ہے۔
یہاں کراچی میں میرے سمیت میرے آٹھ ساتھی تھے جن میں سے دو کو تم نے گولی مار
دی اور میرے سمیت باقی کو پولیس پکڑ کر لے گئی۔ اس سے پہلے کہ ایس پی گیلانی میری
رہائی کا بندوبست کرتا تم نے اختر حسین سے مجھے خرید لیا۔

اب اس کوتاہی پر یہاں کے متعلقہ ایم این اے' ایم پی اے اور دیگر تمام لوگوں کو
خفیہ ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ پلیز! اس سے زیادہ میں کچھ نہیں
جانتا' مجھے پانی پلاؤ!'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ وہ اپنے گلے کی رگیں بار بار مل رہا تھا۔
اب بھی درد میں مبتلا تھا۔

''جنرل کی بیٹی کو تم نے کیوں قتل کیا؟'' آکاش نے اپنا سوال دہرایا جبکہ گوپال
کی تمام باتیں سن کر وہاں بیٹھے ہوئے تمام لوگ سکتے کی حالت میں تھے' کیونکہ اتنا
بھیانک اور خطرناک مشن یقیناً پاکستان کی عزت اور وقار کو ٹھیس پہنچانے کے لیے
شروع کیا گیا تھا۔

''جنرل کے داماد نے ہماری فلم بنا لی تھی جس میں ہم سبھی لوگ یعنی ایس پی گیلانی'
میں اور میرا گروپ ایک لڑکی کی برہنہ تصاویر اتار رہے تھے۔ اس کے والد کو بلیک میل
کرنے کے لیے تاکہ اس ہیرے کو بھی انڈیا بھیجا جائے تاکہ ہمارے ملک میں جتنی بھی
طوائفیں ہوں اس ملک سے جائیں۔ ایس پی گیلانی کے کہنے پر میں نے سحرش اور اس
کے پتی کو موت دے دی۔ پلیز پانی دے دو'' وہ ایک بار پھر رحم طلب نظروں سے
سب کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا یہاں بھی کسی بائی سے میرا مطلب ہے کسی طوائف سے تمہارا تعلق ہے؟ اگر
ہے تو اس کا نام پتہ بتاؤ' فوراً!'' آکاش نے ایک اور سوال کیا۔

''پہلے مجھے پانی پلاؤ پھر بتاؤں گا......ورنہ نہیں بتاؤں گا۔'' وہ پھر خاموش ہو گیا
تھا۔ آکاش نے آگے بڑھ کر اُسے انجکشن دکھایا اور راجو وغیرہ نے اس کی بانہوں کو کس
کر پکڑ لیا۔ آکاش آگے بڑھ کر انجکشن لگانا چاہتا تھا کہ وہ ایک بار پھر گڑگڑانے لگا۔

''نہیں' میں بتاتا ہوں۔ بتاتا ہوں! اس عذاب کو دور ہٹاؤ' میں بتاتا ہوں۔ یہاں

کلفٹن کے علاقہ میں لاڈو طوائف سے ہمارے تعلقات ہیں' اس کی خوبصورت اور جوان
چھوکری کاجل ہماری ایجنٹ ہے۔ وہ ہمارے لیے کام کرتی ہے جبکہ اس کی ماں بھی
طوائف ہے۔''

''کیا مطلب؟ کیا وہ لاڈو طوائف کی سگی بیٹی نہیں ہے۔'' پہلی بار ماسی جانو نے
اس سے سوال کیا تو سبھی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور یوں سر ہلا دیئے جیسے ماسی
نے بہت اہم نکتہ اٹھایا ہو۔

''یہ طوائفیں جو ہوتی ہیں' جن کی کمائی کھاتی ہیں اُن کو اپنی بیٹیاں ہی بتاتی ہیں جبکہ
کاجل کی اصل اور سگی ماں تو پنجاب میں ہے۔ لاہور شہر کی ہیرا منڈی سے اس کا اتنا گہرا
تعلق ہے کہ اگر وہ کہے تو تمام بازار بند ہو جاتا ہے اور..........''

''کیا نام ہے اس طوائف کا؟'' ماسی ایک بار پھر بولی۔ اس بار یہ سوال بے چینی
کے لہجے میں کیا گیا تھا اور گوپال کی بات بھی کاٹ دی گئی تھی۔ اس بار بھی سبھی لوگ
چونک پڑے تھے۔

''اس کا نام تجلی بیگم ہے۔'' گوپال کا یہ کہنا تھا کہ ماسی یکدم بے اختیار ہو کر اُٹھ
کھڑی ہوئی۔ تمام لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ تو ماسی اپنی پوزیشن کا
احساس کرتی ہوئی بیٹھ گئی مگر آکاش کو یہ حرکت کھٹک گئی تھی۔ وہ نظرانداز کر کے گوپال کی
طرف متوجہ ہوا جو کہہ رہا تھا۔

''ملہوترہ تجلی بیگم کے آگے پیچھے دم ہلاتا رہتا ہے۔ میڈم کبھی کبھی اُسے ایسا نگینہ بھی
دے دیتی ہے جس کی بہت زیادہ بولی لگتی ہے۔ ایسے ایسے ہیرے ہوتے ہیں جن کی
ابھی نتھ بھی نہیں کھلی ہوتی۔ اس طرح ملہوترہ کو باس بہت زیادہ چاہتا ہے اور ملہوترہ
باس کا سگا بھتیجا بھی ہے۔ باس چھ ماہ میں ایک بار تجلی بیگم کے ہاں ضرور آتا ہے اور
ایک ماہ تک قیام کر کے تمام ملک کا دورہ کرتا ہے۔ اپنے تمام آدمیوں کی کارکردگی چیک
کر کے تسلی ہونے کے بعد تمام معاملات میڈم سے طے کر کے واپس جاتا ہے۔ اس
ملک کے تمام شہروں میں جتنے بھی کارندے ہیں وہ تمام میڈم سے ہدایات لیتے ہیں۔
حتیٰ کہ میں بھی ان سے رابطہ میں تھا۔ اب میری گرفتاری کا علم ہونے پر تمام کنجروں
میں تھرتھلی تو مچ گئی ہوگی لیکن تمہارے حکمرانوں کی کرسیاں بھی ڈول گئی ہوں گی۔ پلیز

پانی پلا دو!" وہ ایک بار پھر تڑپ اٹھا۔ آکاش نے خانو کو اشارہ کیا کہ وہ اسے پانی پلا دے اور خود ایسے نڈھال ہو کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لی جیسے میلوں دوڑتا آیا ہو۔

پانی کا جگ ابھی گوپال نے منہ سے لگایا ہی تھا کہ آکاش نے ریوالور نکال لیا اور گوپال کا نشانہ لے کر اس قدر زور سے بولنا شروع ہوا کہ پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔

"حرامزادے ہندوستانی کُتے! میری ماں بہنوں کی عزتوں کو پامال کرتے ہو تم لوگ! اور میں تمہیں اپنے وطن کا پانی پینے دوں؟" یہ کہہ کر اس نے جگ کو ٹھوکر ماری' جگ گوپال سے کافی دور جا گرا۔ تمام پانی زمین پر پھیل گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر کتے کی مانند پانی کو بے صبری سے چاٹنے لگا۔ آکاش پھر بولا:

"تم نے اور تمہارے گروپ نے جو جو ظلم میرے وطن کی عورتوں پر کیے ہیں اُن کا حساب سو گنا لوں گا۔ ایک ایک کو چُن چُن کر کُتے کی موت ماروں گا۔ کُتے کی موت ماروں گا!"

یہ کہہ کر اس نے پورا ریوالور گوپال پر خالی کر دیا۔ اُسے تڑپنے کا موقع نہ ملا تھا۔ آکاش کے ساتھی اس کو اتنے غصے میں پہلی بار دیکھ رہے تھے جبکہ شمع کی حالت عجیب ہو گئی تھی۔ جنرل اور ماسی نے چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ "سؤر کا بچہ میرے ملک کی عزتوں سے کھیلے گا۔" وہ بڑبڑا رہا تھا' اس نے گوپال کی لاش پر تھوک دیا۔

☆.................☆

کہیں سے طبلہ' ڈھولک' گھنگھروؤں کی چھن چھن اور کہیں سے کھانسنے کی آوازیں۔ کہیں سے گانے کی آواز' ڈانس' مُجرا' ناچ' کہیں جسم نوچے جا رہے تھے۔ کہیں زندہ گوشت بیچا جا رہا تھا۔ گجرے اور گلاب بیچنے والوں کی چاندی ہو رہی تھی۔ پان سگریٹ اور کولڈ ڈرنک کی دکانوں پر رش دیدنی تھا۔ ہاتھوں میں سودے ہو رہے تھے۔ کسی بالکنی سے آجاؤ بابو جی تازہ مال آیا ہے' کی آواز اور کہیں سے سولہ سالہ کنواری دوشیزہ کے سودے پر تکرار۔ کہیں سے خوشیاں اور کہیں سے آنسوؤں کی ٹھنڈی ہوائیں۔ غرض کہ اس وقت اس بازار کی رونقیں عروج پر تھیں۔ تماش بین اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ اپنی من پسند طوائفوں پر نوٹ لٹانے کے لیے نوابوں' نوابزادوں' خانزادوں اور

حرامزادوں نے اپنی تجوریوں کے منہ کھول رکھے تھے۔ نوٹوں کی گڈیاں اٹھائے ہوئے تماش بین طوائفوں کی نگاہوں کا مرکز تھے۔ وہ ناچتی ناچتی بار بار اس کے بازوؤں میں جھولتیں تھیں جس کے پاس نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ یہ لاہور کا بازارِ حسن تھا۔ ہیرا منڈی تھی' یہاں ہیروں کی قدر کرنے کے لیے جوہری اپنی گاڑیوں میں آتے تھے لیکن انہیں پیدل جاتے ہوئے دیکھا جاتا تھا۔ سُنیارا جو کہ کلوگرام کے حساب کے سونا اپنی دکان میں رکھتا تھا' وہ بھی یہاں آنے کے بعد بسوں اور گاڑیوں میں بواسیر کے چھلے بیچنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ رئیس زادے کنگال ہو کر نکلتے تھے۔ نوابزادے دولت ختم ہونے کے بعد نائیکہ کی جوتیاں صاف کرتے تھے اور پھر ایک دن یہی جوتیاں مار مار انہیں کوٹھے کی سیڑھیوں سے دھکا دے دیا جاتا ہے۔ بیوفائی اس بازار اور بازار کے باشندوں کی فطرت بلکہ گھٹی میں شامل کر دی جاتی ہے۔ سچی اور کھری محبت کے دعوے بے بنیاد ہو جاتے ہیں۔ جب جیب خالی ہوتی ہے تو من کا دیوتا بھی زہر لگنے لگتا ہے۔ نفرت اور بیوفائی کی اتنی بڑی دیوار کھڑی کر دی جاتی ہے کہ کنگال دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کرتا۔ اگر کر بھی لے تو طوائفوں کی کمائی پر پلنے والے غنڈے اس کی پٹائی کر کے ادھ موا کر کے بیچ چوراہے پر پھینک دیتے ہیں۔ طوائف اور بیوفائی ایک ہی ماں کی دو اولادیں ہیں۔ جس طرح مجبوری اور ضرورت انسان کو اپنا آپ بیچنے پر مجبور کر دیتی ہے' بالکل اسی طرح یہاں بھی کچھ ایسی ناچنے والیاں تھیں جنہیں کسی کا چچا' کسی کا ماموں' کسی کا تایا' ابا یا اور کوئی رشتہ دار فروخت کر گیا تھا' جن کا اب آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ بس وہ ناچتی تھیں اور اپنا پیٹ پالتی تھیں۔ اور ساتھ میں نائیکہ اور غنڈوں کا خرچ بھی اٹھاتی تھیں۔ یہ وہ بازار تھا' جہاں بیٹے کی پیدائش پر صفِ ماتم بچھ جاتی تھی اور بیٹی پیدا ہونے پر شادیانے بجائے جاتے تھے۔ کچھ کوٹھے ایسے تھے جن پر کچی کنواری کلیاں مجرا کرتی تھیں اور تماش بینوں کا رش دیدنی ہوتا تھا اور اکثر لڑائی جھگڑوں تک نوبت آ جاتی تھی۔ پولیس طوائفوں کی غلام تھی کیونکہ بڑے بڑے ضمیر فروش آفیسران اور سیاست دان یہاں اپنا منہ کالا کرنے آتے تھے۔ لہٰذا لڑائی جھگڑے میں نقصان تماش بین کا ہی ہوتا ہے' کیونکہ پولیس والے اوپر والوں کے حکم ماننے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ اس

تمام بازار پر تجلی میڈم کا ہولڈ تھا۔ بڑے بڑے سیاست دان اور اونچی کرسیوں والے ان کی جیب میں پڑے رہتے تھے بلکہ ان سے دبتے تھے۔ میڈم تجلی کے لیے کوئی بھی بڑا مسئلہ حل کروانا کوئی مسئلہ نہ تھا' کیونکہ فون کی ایک کال ہی کافی ہوتی تھی۔

اس وقت بھی مجرا عروج پر تھا۔ تجلی بیگم نے مہرین کو بڑی مہارت اور خوبی سے تراشا تھا۔ ایک ماہر ہیرا تراش کی طرح' ایسا کیوں نہ ہوتا وہ اپنی جوانی' بچپن' لڑکپن اور تمام عمر انہی بازاروں اور کوٹھوں پر گزار چکی تھی۔ وہ ایک ماہر اور قدردان جوہری کی طرح نگینہ دیکھ کر ہی بتا دیتی تھی کہ اس میں کیا گن موجود ہیں۔ اسی طرح اس نے مہرین کو بچپن سے لے کر نوجوانی کی عمر تک یہی سکھایا تھا کہ کیسے تماش بین کو اپنی مست اور نشیلی اداؤں کے جال میں پھانسا جاتا ہے۔ مہرین بھی اس کی انگلیوں پر ناچتی ہوئی امیرزادوں سے راہ و رسم بڑھاتی اور انہیں کنگال کر رہی تھی۔ ابھی سترہ برس کی عمر تھی کہ اس نے بہت سے نوجوان اپنے جال میں پھانس رکھے تھے' کیونکہ اسے دیکھ کر ہی قدرت کی فیاضی کا احساس ہوتا تھا۔ رنگ روپ' حُسن اور قد کاٹھ قدرت نے اسے سونپنے کے لیے یقیناً بے انتہا فیاضی کا مظاہرہ کیا تھا۔ آج کل ہر کوئی اسی کا دیوانہ نظر آ رہا تھا۔ اسی لیے لاجو بائی کے کوٹھے پر رش رہتا تھا اور آج بھی ایسا ہی سماں تھا۔

انجمن فلم کا گانا ''اظہار بھی مشکل ہے چپ رہ بھی نہیں سکتے۔ مجبور ہیں اف اللہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتے'' چل رہا تھا۔ گھنگھروؤں کی چھن چھن اور طبلوں کی تھاپ پر مہرین ناچ رہی تھی۔ اس دوران ہی تجلی بیگم کا موبائل بول پڑا۔ اس نے آن کر کے سائیڈ پر جا کر کان کو لگا کر ہیلو کہا' تو دوسری طرف سے ایس پی اختر حسین بول رہا تھا جو کہ کراچی سے بات کر رہا تھا۔

''ہیلو میڈم! اختر حسین کراچی سے بات کر رہا ہوں۔''

''تمہید مت باندھو۔ دھندے کا ٹائم ہے۔ میڈم کو معلوم ہے کہ کون کہاں سے بول رہا ہے؟''

تجلی بیگم غصے سے لال ہو گئی تھیں۔'' ایک ہی سانس میں بھونکو کیا کہنے جا رہے تھے؟''

''میڈم! گوپال اور اس کے تمام ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ

پولیس مقابلے میں مروا دیا گیا ہے۔'' وہ یہ بات گول کر گیا تھا کہ اس نے گوپال کو مبلغ پچیس لاکھ میں فروخت کیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اگر میڈم کو اس بات کی بھنک بھی پڑ گئی تو اس کی پچیس لاکھ ہی بوٹیاں ہو جائیں گی۔ لہٰذا وہ تمام کی لاشیں پولیس مقابلے کے کھاتے میں ڈال گیا تھا۔

''میڈم! یہاں پر ایک آکاش گروپ ہے۔ اس کی مڈبھیڑ گوپال گروپ سے ہو گئی۔ اُس نے بڑا لمبا اور اونچا ہاتھ مارا۔ لمبی رقم لگوا کر گوپال وغیرہ کو مروا دیا۔ میڈم! وہ بڑا دلیر اور بہادر ہے۔''

''اپنی زبان بند رکھو! یہ نقصان تمہارے علاقہ میں ہوا' اس کی جواب دہی بھی تم ہی کرو گے۔ فوراً لاڈو سے کہو کہ ہم سے رابطہ کرے۔ میں اس کے فون کی منتظر ہوں۔'' یہ کہہ کر میڈم نے فون بند کر دیا۔ یہ بہت بڑا نقصان تھا۔ یقیناً وہ باس کو جواب دہ ہو گی کیونکہ پاکستان کے تمام کنجروں کا رابطہ میڈم سے تھا اور میڈم ان سب گروپوں کو ڈیل کرتی تھی جو طوائفوں کا بیوپار کرتے تھے۔ وہ واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ گانا ختم ہوتے ہی اس نے نگینہ کو اپنے پاس بلایا اور اس کے کان میں کچھ کہہ کر جلدی جلدی کوٹھے کی سیڑھیاں اُترتی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف چل پڑی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور گاڑی میڈم کے بیٹھتے ہی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ راجہ سلیم کے محل کی طرف دوڑتی ہوئی گاڑی میں بے چین بیٹھی ہوئی میڈم بار بار بے قراری اور اضطراب سے پہلو بدل رہی تھی۔ وہ فون کال کی منتظر تھی' لیکن ابھی تک لاڈو بائی کا فون نہ آیا تھا۔ یہاں تک کہ گاڑی محل کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی مگر کوئی کال نہ آئی۔ وہ جلدی سے گاڑی سے اتری کہ جلد از جلد اپنے کمرے میں جائے اور لاڈو سے رابطہ کرے۔ آخر اس کی بیٹی کاجل اس کے ساتھ کام کرتی تھی۔ وہ بیٹی کی طرف سے بھی فکر مند تھی۔ یہ آکاش نجانے کون تھا جس نے پاورفل گوپال گروپ کو ختم کروا دیا تھا۔ پتہ نہیں کیا مسئلہ تھا۔ کیا معاملہ تھا۔ یہ تمام باتیں تو کاجل ہی بتا سکتی تھی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی اندر داخل ہو رہی تھی کہ راجہ صاحب باہر نکل رہے تھے۔ دونوں کی ٹکر ہو گئی تو دونوں ٹھٹک کر رک گئے۔ میڈم تجلی اندر داخل ہوئی تو راجہ صاحب بھی اندر آ گئے۔ اور طنزیہ مسکراہٹ سے بولے:

''غالباً ایک ماہ بعد یہ ہمارا ٹکراؤ ہوا ہے۔ کہاں رہتی ہو تجلی بیگم؟''

وہ مڑی اور راجہ سلیم کی طرف منہ کر کے بولی:

''کیا آپ نہیں جانتے راجہ صاحب کہ میں کون ہوں۔ اور مجھے کہاں رہنا چاہیے؟!''

''آج خلافِ توقع گھر کی چھت کے نیچے رات کیسے گزار سکو گی؟''

''یہ گھر میرے لیے شروع سے ہی ایک سرائے تھا' راجہ صاحب! سرائے عارضی ٹھہراؤ کے لیے ہوتی ہے اور عارضی ٹھہراؤ مجبوری کے تحت ہی کیا جاتا ہے۔''

''ویسے ہے تو تمہارا پرسنل معاملہ مجھے پوچھنا نہیں چاہیے مگر کیا پوچھ سکتا ہوں کہ وہ مجبوری کیا ہے جو راتوں کو باہر گزارنے والی تجلی بیگم کو اپنے اس گھر کی چھت' میرا مطلب ہے کہ راجہ سلیم کی سرائے میں لے آئی؟''

''یہ سوال ہمارے معاہدے کی خلاف ورزی ہے' راجہ صاحب!'' وہ تنک کر بولی۔

''اگر ایک رات اس سرائے کو دینے آ ہی گئی ہو تو اپنے بچوں کا بھی پوچھ لینا کیونکہ وہ بھی کئی دنوں سے تمہاری شکل دیکھنے کو ترس گئے ہیں۔''

''بچے ماں کے بغیر گھونسلوں میں ہی اچھے لگتے ہیں مسٹر ایم این اے۔ انہیں اس بات کی فکر ہونی چاہیے کہ ان کی چونچ میں ڈالا جانے والا دانہ ان کی ماں کب لے کر آئے گی۔ یہ فکر نہیں ہونی چاہیے کہ ماں کی شکل کیسی ہو گئی ہے۔ گڈ نائٹ راجہ صاحب!''

یہ کہہ کر تجلی بیگم اوپر جانے والی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی دبیز قالین کو روندتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی اور ایم این اے صاحب وہیں بت بنے کھڑے تھے کہ باہر سے چاندنی اور احمد طماس ہنستے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ وہ نجانے کس بات پر مسکرا رہے تھے اور پاپا کو دیکھتے ہی وہ سیریس ہو گئے اور باری باری سلام کیا۔ بلکہ طماس نے آگے بڑھ کر ڈرتے ہوئے پاپا سے ہاتھ بھی ملایا۔ وہ اپنے کمروں کی جانب جانے لگے تو راجہ صاحب بول پڑے۔

''کیا ہم بیٹی' بیٹا اور باپ کے درمیان صرف سلام دعا کا تعلق ہی رہ گیا ہے۔'' وہ دونوں مڑے اور حیرت سے باپ کی طرف دیکھنے لگے' کیونکہ راجہ صاحب نے انہیں کافی دیر بعد پیار سے بلایا تھا۔ چاندنی بول پڑی۔

''وہ دراصل پاپا جانی! آپ بہت زیادہ بزی رہتے ہیں۔ آپ سے ملاقات بھی کم ہو پاتی ہے۔ اسی لیے یہ فاصلے بے تکلفی مٹاتے ہوئے سلام دعا تک محدود ہو گئے ہیں۔''

''پاپا! ہمیں تو لگتا ہے کہ ہم یہاں ٹھہرنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ اس چھت کے نیچے کوئی رشتہ' کوئی احساس زندہ نہیں ہے۔ معاف کیجیے گا پاپا جانی! ہمیں تو رشتوں کی پہچان ہی نہیں کروائی گئی۔'' اس بار احمد طماس بولا تھا۔ وہ واپس جانے لگے تو راجہ صاحب پھر بول پڑے۔

''تمہاری باتیں تمہاری ماں جیسی ہیں۔ وہ بھی اس گھر کو ایک سرائے سمجھتی ہے۔ کیا اس سرائے میں کوئی رشتہ نہیں پالا جا سکتا؟ اس بات پر غور ضرور کرنا۔'' یہ کہہ کر راجہ صاحب باہر نکل گئے۔

اور وہ دونوں ماں کے کمرے کی لائٹ جلتی دیکھ کر ان کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے اور ایک دوسرے کو دستک دینے کا کہنے لگے۔

چاندنی نے پہل کی۔ دستک دینے سے اندر سے جواب آیا۔

''اندر آ جاؤ۔''

وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ سامنے بیڈ پر تجلی بیگم نیم دراز تھیں۔ بچوں کو دیکھتے ہی ان کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اُبھرے۔

''السلام علیکم مما!''

''کہو' کیسے آنا ہوا؟'' وہ تلخی چھپاتے ہوئے بولی۔

''آپ کو دیکھے ہوئے کافی دن ہو گئے تھے۔ اسی لیے چلے آئے۔ کیسی ہیں آپ مما!'' احمد طماس بولا۔

''بالکل ٹھیک ہوں۔'' لہجہ بدستور وہی تھا۔

''کیا مما آپ جیسی ماں کے پاس بھی ہوتی ہے؟'' چاندنی ان کے لہجہ کی تلخی محسوس کر کے بولی۔

''وٹ ڈو یو مین اینڈ مائینڈ یور لینگویج۔''

What Do You Mean And Mind Your Language

''میں تمہاری ماں ہوں اور تم ایک پڑھی لکھی اور باشعور بیٹی ہو اور تمہیں علم ہونا

چاہیے کہ ماں سے بات کرتے وقت نگاہیں نیچی اور زبان حلق کے اندر رکھی جاتی ہے۔ بتیس دانتوں کے تالے کے اندر۔'' وہ غصے سے بھڑک اٹھیں۔ چاندنی نے یکدم بات ہی ایسی کہہ دی تھی۔

نیچی نگاہیں اور زبان حلق کے اندر وہاں رکھی جاتی ہے جہاں گھر ہو' جہاں رشتے ہوں' ماں ہو' باپ ہو' بیٹی اور بیٹے کی جائز باتوں' جائز خواہشوں کا خیال رکھا جائے۔

یہ گھر ہے؟ یہ تو ایک ایسی جگہ ہے جہاں چلتے چلتے ہم جیسے تھکے اور پیاسے مسافر پانی پینے کے لیے رک جاتے ہیں۔ معاف کیجیے گا ممّا! آپ نے اس گھر کو گھر نہیں سمجھا کبھی بھی' اور باپ نے کبھی یہ نہیں محسوس ہونے دیا کہ وہ ہمارے باپ ہیں' دوست ہیں۔ آپ دونوں جانے کیسی کیسی الجھنوں میں اُلجھے ہوئے ہیں کہ آپ کو اس بات کا خیال بھی نہیں کہ آپ کے بچوں کو کوئی تکلیف تو نہیں' کوئی دکھ تو نہیں' کوئی خواہش' کوئی آرزو۔ کبھی بھی پوری کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کبھی بھی۔'' چاندنی روتی جا رہی تھی اور بولتی جا رہی تھی جبکہ احمد طماس نے درمیان میں اُسے روکنے کی کوشش کی لیکن آج وہ دل کا غبار نکال لینا چاہتی تھی اور تجلی بیگم اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''یہ کاریں' محل' کوٹھیاں' گاڑیاں' نوکر چاکر' اچھا لباس' اچھا کھانا' ہر ماہ اچھا جیب خرچ' تمہاری تعلیم کا خرچ' اچھے کالجز میں ایڈمشن اور نجانے کیا کیا سہولتیں ہیں تم لوگوں کو اس گھر میں۔ صرف میری بدولت' تمہارا باپ تو اپنے سیاسی گرداب میں اُلجھا ہوا ہے۔ یہ سب کچھ کون کرتا ہے تمہارے لیے؟ تمہاری یہ ماں کرتی ہے۔ تمہاری ماں تجلی بیگم کرتی ہے۔ اب بھی کہتی ہو کوئی خواہش نہیں پوری کی۔ کیا کمی ہے تمہیں' کیا دُکھ تکلیف ہے تمہیں یہاں۔ بتاؤ مجھے تمہاری ساری پرابلمز کیسے دور ہوں گی۔ جلدی بتاؤ۔''

تجلی بیگم ہتھے سے ہی اکھڑ گئی تھیں جبکہ طماس اور چاندنی روتے ہوئے باہر نکل آئے۔ طماس چاندنی کو اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔ اس نے بہن کو صوفے پر بٹھایا اور پانی کا گلاس بھر کر اُسے دیا۔ چاندنی بہت بولی تھی لہٰذا ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر گئی۔

''تمہیں ممّا کے ساتھ ایسا بی ہیو (Behave) نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ ہماری ماں ہیں۔'' طماس نے بہن کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''مجھے پتہ نہیں بھائی کیا ہو گیا تھا؟ میں اپنے جذبات پر کنٹرول نہ رکھ سکی۔ آئی ایم سوری بھائی!'' وہ شرمندگی سے بولی۔

''تمہیں ممّا سے سوری کرنا چاہیے چاندو۔ وہ کیا سوچ رہی ہوں گی۔ انہیں تمہاری باتوں سے دکھ پہنچا ہوگا۔ چلو ان سے معذرت کر لو تمہیں بھی سکون ہو جائے گا اور ممّا کو بھی پلیز چاندو آؤ چلیں!'' وہ چاندنی کو سمجھا رہا تھا۔

چاندنی نے دوپٹہ سے اپنے آنسو پونچھے اور بھائی کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی۔

وہ دونوں چلتے ہوئے تجلی بیگم کے کمرے کے دروازے تک پہنچے تو انہیں محسوس ہوا کہ وہ کسی سے باتیں کر رہی ہیں۔ وہ باہر ہی رُک گئے۔ چاندنی نے طماس سے کہا۔

''لگتا ہے ممّا کسی سے باتیں کر رہی ہیں۔ ہم یونہی دبے پاؤں اندر چلے جاتے ہیں۔ ایک طرف کھڑے ہو جائیں گے جب وہ فارغ ہو لیں گی تو میں سوری کر لوں گی' رائٹ!''

''رائٹ۔'' طماس نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

وہ دونوں بغیر دستک دیئے اندر چلے گئے۔ تجلی بیگم کی پُشت ان کی طرف تھی۔ وہ موبائیل پر کسی سے باتیں کر رہی تھیں۔ کمرے میں ان تینوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

''دیکھو لاڈو! اس کام میں جتنا بھی نقصان ہوا ہے' اس آکاش کے بچے کو پکڑ کر پورا کرو۔ کچھ دنوں کے لیے کام بند کر دو اور کاجل کو بائی ایئر میرے پاس فوراً بھیج دو۔'' کچھ لمحے وہ دوسری طرف کی باتیں سنتی رہی اور پھر بولی:

''آج اور ابھی کیوں نہیں۔ کل تک وہ حرامزادہ کاجل کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ نہیں وہ ہر بار ٹرین پر آتی ہے۔ وہ تجلی کی بیٹی ہے۔ تجلی میڈم کی۔ جانتی ہو' بس صبح کراچی سے ہر حال میں وہ لاہور پہلی فلائیٹ سے پہنچ جائے۔''

پھر کچھ دیر خاموشی رہی۔ دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد وہ دوبارہ بولی' تمام کراچی میں یہ کام بند ہونا چاہیے۔ اگر میری بیٹی کو خراش بھی آئی تو تمام دھندے میں صف ماتم بچھا دوں گی۔ بس میرے دوسرے فون کا انتظار کرو۔'' وہ اس سے پہلے کہ فون

بند کر کے پلٹتی‘ وہ دونوں دبے قدموں واپس آ گئے۔ اس طرح کہ تجلی کو پتہ نہ چل سکا کہ کوئی اس کی تمام باتیں سُن چکا ہے۔

”کیا معاملہ ہوسکتا ہے بھائی۔ یہ فون کس کو کیا جا رہا تھا۔ یہ لاڈو کون ہے بھائی اور یہ ممّا پراسرار لہجے میں بات کیوں کر رہی تھیں؟“ چاندنی نے طماس کے کمرے میں پہنچ کر اس سے پوچھنا شروع کر دیا۔ ”اور کاجل آپی..........؟“

”مجھے تو خود سمجھ نہیں آ رہی۔ اور پھر یہ کہ کاجل آپی ابھی تک امریکہ نہیں گئیں۔ وہ کل واپس آ رہی ہیں۔ وہ کراچی میں کیا کر رہی ہیں۔ چاندو! میرا خیال ہے یہ کوئی لمبی گیم ہے۔ اس کا پتہ چلانا چاہیے مگر ہم دونوں کیسے؟“ طماس بھی پریشان ہو کر بہن کے سامنے بیٹھ گیا۔

”ایک آئیڈیا ہے بھائی‘ کیوں نہ ہم تمام معاملہ احمد رضا سے ڈسکس کریں۔“

چاندنی نے طماس کو کہا تو طماس چونک گیا اور بولا:

”کیا وہ تیسرا...... باہر کا آدمی ہمارے معاملات ڈیل کرے گا؟“

”وری سیڈ! ایک طرف تو اس سے دوستی قبول کر چکے ہو۔ وہ تمہارا محسن بھی ہے۔ تمہاری جان بچائی ہے اس نے۔ اور دوست تو باہر کا آدمی نہیں ہوتا نا۔“

چاندنی بھائی کے جواب پر خفا سی ہو گئی تھی۔ پھر بھی سمجھاتے ہوئے بولی۔

”مجھے تم پر فخر ہے بہنا! تم نے میرا مان رکھ لیا۔ بس میں یہی جاننا چاہتا تھا کہ تم بھی احمد رضا کو میرا دوست سمجھتی ہو یا نہیں؟ تم نے میرے دل کی بات کہی ہے۔ کیا وہ مان جائے گا؟“ طماس خوش ہو کر بولا۔

”میرا خیال ہے وہ میری بات نہیں ٹالے گا کیونکہ تم میں دوسروں سے بات کرنے کا ٹیلنٹ ذرا کم ہی ہے اور عقل بھی کچھ..........“ چاندنی خوش ہو کر بھائی کو چھیڑنے لگی۔ وہ بھی اُسے گھورتا ہوا مسکرانے لگا۔

تمہیں کیا معلوم بھائی کہ رضا تو میری نس نس میں سما گیا ہے۔ اب تو زندگی اس کے بغیر ناممکن لگتی ہے۔ میری روح میں اُتر کر اس نے میرے دل پر قبضہ کر لیا ہے۔ اُسے نہ دیکھوں تو دل دھڑکنا بھول جاتا ہے۔ سانس آنا رُک جاتی ہے۔ نظام کائنات تھم جاتا ہے۔ وہ سوچوں میں غرق بہت دور چلی گئی تھی۔ یہ سب کچھ اس نے سوچا ہی

تھا۔ زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہا تھا۔ وہ سوچوں میں گم تھی کہ طماس نے اُسے جھنکا دیا۔ وہ چونک کر بھائی کو دیکھنے لگی۔

”میری پیاری بہنا! ایک اور مہربانی کرو۔ رات کے دو بج رہے ہیں۔ صبح کالج بھی جانا ہے اب اپنے کمرے میں جا کر بیڈ کو دکھ دو اور مجھے سونے دو۔“ وہ ہاتھ جوڑتا ہوا بولا۔

وہ بھائی کو مسکراتا ہوا چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی آئی اور تصور میں کھو گئی کہ صبح احمد رضا سے ملاقات ہو گی۔ وہ یہ کہے گی وہ کہے گی‘ کیا کہے گی۔ بس یہی سوچتے ہوئے اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ گہری نیند سو گئی۔

☆..............☆

اخبارات نے گوپال‘ آکاش گروپس کے معاملات کو بہت اچھالا تھا۔ پولیس کی نااہلی اور کہیں پر حکمرانوں کے خلاف باتیں ہو رہی تھیں۔ لاڈو بائی اور کاجل اُسی دن سے غائب تھیں۔ آکاش نے دو تین چکر ان کے گھروں کے لگائے مگر بے سود۔ نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ وہ کئی دنوں سے شمع اور جنرل صاحب کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اب بھی جنرل‘ شمع اور وہ فارم ہاؤس کی بالکنی میں بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ شمع کبھی کبھار آکاش کی طرف میٹھی نظروں سے دیکھ لیتی تھی۔ جنرل نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا:

”زندگی میں بہت نفع اور نقصان اٹھایا ہے۔ نفع اتنا کمایا ہے کہ نقصان کی کبھی پرواہ نہ کی۔ میری بیٹیوں کے صدقہ سے رب کریم نے مجھے بہت نوازا ہے۔ کاروبار میں نفع نقصان تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ لیکن میری زندگی کا نقصان جو کبھی فراموش نہ کر سکتا تھا‘ میری بیٹی اور داماد کی موت سے ہوا۔“ یہ کہہ کر جنرل آنکھوں میں آئے اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کرنے لگے تو شمع نے اٹھ کر ان کی کرسی کے پیچھے جا کر ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپانا شروع کر دیا۔ جیسے وہ جنرل کو دلاسا دے رہی ہو۔ جنرل نے بھی اپنے ہاتھ بیٹی کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور پھر گویا ہوئے۔

”اس نقصان کو نفع میں بدلنے کے لیے مجھے ایسے بااعتماد دوست کی ضرورت تھی جو اس کاروبار یعنی اس لائن میں مہارت رکھتا ہو۔ پھر تم مل گئے بیٹا۔ تم نے میری ساری

زندگی کے کاروبار کو غم اور اندھیرے میں ڈوبنے سے بچا لیا۔ تم نے مجھے وہ نفع دیا ہے جسے میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا اور کتنا بھی چاہوں تو نہیں گن سکتا۔" اس سے پہلے کہ جنرل اور کچھ کہتے آکاش بول پڑا۔

"آپ خوامخواہ اموشنل ہو رہے ہیں سر! یہ میرا فرض تھا۔ آپ نے مجھ پر اعتماد کیا' مجھ کو اپنا بیٹا سمجھا اور میں نے آپ کی ذات پر کوئی احسان نہیں کیا۔ بس اپنا فرض نبھانے کی کوشش کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ابھی تک اس میں ففٹی ففٹی کامیاب ہوا ہوں۔"

"کیا مطلب؟ ففٹی ففٹی؟ جبکہ گوپال اور اس کا تمام گروپ تو ختم ہو چکا ہے۔" شمع نے حیرت سے کہا۔ وہ واپس اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"درخت کا تنا اور شاخیں جڑوں کے بل بوتے پر پھلتی پھولتی ہیں۔ ابھی تو شاخیں ہی ختم کی ہیں۔ تنا اور جڑیں باقی ہیں۔" وہ بولا۔

"یہ تو بہت لمبا چوڑا اور وسیع کاروبار ہے۔ بہت بڑے بڑے لوگ اس پیشے کی سرپرستی کرتے ہیں۔ طوائفوں کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ اس پیشے کو وسعت دینے کے لیے ان کو طرح طرح کی فیسیلیٹیز دی جاتی ہیں۔ اس نیٹ ورک کو تم اکیلے کیسے ختم کر سکتے ہو؟" جنرل نے کہا۔

"پورا نیٹ ورک تو بہت مشکل ہے سر! میں جانتا ہوں کہ کنجروں کے ہاتھ قانون سے بھی لمبے ہوتے ہیں۔ انہیں ختم کرنا بہت کٹھن بھی ہے اور ناممکن بھی مگر ہم ایسا تو کر سکتے ہیں کہ جو حادثہ ہمارے ساتھ پیش آیا ہے وہ کسی اور کی بیٹی کے ساتھ نہ ہو۔ میرا مطلب ہے کہ حادثے کے ذمہ داروں کو اتنی کڑی سزا دوں کہ دوبارہ کوئی انڈین یا غیر ملکی اتنا بھیانک مِشن لے کر اس ملک کا رُخ نہ کرے۔ میں ان تمام لوگوں کو گن گن کر اور ڈھونڈ کر ختم کروں گا۔ بس دو ایک روز کی بات ہے۔ میرا مخبر کاجل اور لاڈو کا سراغ لگا رہا ہے۔ عنقریب آپ دیکھیں گے اور سُنیں گے کہ آکاش ان طوائفوں پر قہر اور عتاب کی آندھی بن کر چھا گیا ہے اور جب سب کچھ ختم ہو گا تبھی سکون ہو گا مجھے!"

آکاش ایک بار پھر غضبناک ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید گرم ہوتا موبائل کی گھنٹی بول اُٹھی۔ دوسری طرف مخبر تھا۔

"کہو کچھ پتہ چلا؟" آکاش نے موبائل کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"بہت بھاگ دوڑ کے بعد صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ کاجل بائی کو لاڈو بائی کے ساتھ گیلانی کی گاڑی میں دیکھا گیا ہے اور گاڑی ریلوے اسٹیشن پر کھڑی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔ تم مجھے کال کرتے رہنا۔ تمہارا معاوضہ تمہیں مل جائے گا۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور جنرل سے کہنے لگا۔

"سر! آپ اپنے جگری دوست اور کلاس فیلو کو بھول گئے تھے۔ سب سے بڑی مچھلی تو وہ ہے۔ آپ میرا انتظار کریں' میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اندر کی طرف لپکا۔ شمع بھی اس کے پیچھے اندر آ گئی تو وہ ریوالور جیب میں رکھ رہا تھا۔ شمع نے پیچھے سے جا کر اُس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اور بولی۔

"یہ بہت خطرناک کام ہے آکاش! اپنا بہت خیال رکھنا!"

"کیوں؟" وہ پیچھے مُڑا تو دونوں کے چہرے ایک دوسرے کے سامنے تھے۔

"کیونکہ تمہاری زندگی اب میری ہے۔" شمع نے نگاہیں نیچی کر کے کہا۔

"مجھ پر اعتماد ہے؟" وہ بولا۔

شمع اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

میری سوچ میری طلب کا محور ہے تُو
منزلیں قریب ہیں کہ میرا ہم سفر ہے تُو

روح جدا ہو میری جو کبھی سوچوں جُدائی
دِل و جان ہی نہیں شمع کی نظر ہے تُو

"اگر اتنا ہی اعتبار ہے تو پھر یہ بھی سُن لو کہ میں تمہاری جان کو کچھ نہ ہونے دوں گا۔ مرتے دم تک تمہارا رہوں گا۔" آکاش کے منہ سے یہ سننا تھا کہ شمع بے اختیار ہو کر اس کے گلے لگ گئی۔ آکاش نے اُسے دھیرے سے الگ کیا اور بولا۔

"کسی غریب کے شعر چوری کرنا چھوڑ دو۔ بائے!" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

"شمع بیٹا!" جنرل کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ وہ واپس پلٹی تو جنرل بالکنی میں بیٹھے آکاش کو جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اس نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے جنرل اور شمع کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا تو جنرل نے داہنے ہاتھ کا انگوٹھا کھڑا کر کے اُسے گڈ

لک کہا۔ اور شمع کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ وہ چلا گیا تو جنرل نے شمع کو اپنے پاس بلایا۔ وہ جنرل کے پاؤں میں بیٹھ گئی اور اپنا سر ان کے زانو پر رکھ دیا۔ جنرل نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا:

''بیٹا! یہ لوگ جو ملک کی غیرت کی حفاظت کرنا جانتے ہیں' وہ مرے ہوئے ہوتے ہیں کیونکہ یہ کام غیرتوں سے کیے جاتے ہیں۔ میں اپنی ایک بیٹی کھو چکا ہوں۔ اب دوسری نہیں کھونا چاہتا۔'' شمع نے سر اٹھا کر باپ کی طرف دیکھا تو تڑپ گئی۔ ان کی آنکھیں پانی سے بھری ہوئی تھیں۔

''لیکن پھر یہ سوچتا ہوں کہ سحرش کا خاوند ایک شریف النفس تھا۔ وہ بے چارہ اس کی اور اپنی جان کی حفاظت نہ کر سکا۔ آکاش کے بازوؤں میں دم ہے' طاقت ہے' وہ تمہاری اچھے طریقے سے کیئر کر سکتا ہے۔ میرا کیا ہے تمہاری خوشحال زندگی دیکھ کر خوش ہوتا رہوں گا اور باقی زندگی پوری کرلوں گا۔''

''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں ڈیڈی؟ آپ کی آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر مایوسی کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔'' شمع نے باپ کو تسلی دی۔

''تم اتنی سی تھیں۔'' انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے بتانا شروع کیا۔'' اپنی توتلی زبان سے کسی بھی خواہش کا اظہار کرتیں تو مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ میں وہ خواہش فوراً پوری کر دیتا تھا۔ اب جبکہ تم نے اچھے طریقے سے بولنا سیکھ لیا ہے' تو نجانے کیوں انجانا سا خوف مجھے تمہاری خواہش کو پورا کرنے سے روک رہا ہے!''

''آپ جانتے ہیں ڈیڈی کہ میں آکاش سے پیار کرتی ہوں اور اگر آپ کو اس پر اعتماد ہے تو آپ کو یہ حقیقت بھی معلوم ہے کہ ہر جاندار کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ اگر ایک روز مرنا ہی ہے تو کیوں نہ آکاش کے نام پر زندگی کر دوں۔ میں اس کی بانہوں میں خود کو باحفاظت محسوس کروں گی۔ پلیز ڈیڈی! یہ میری آخری خواہش سمجھ کر اسے پورا کرنے میں نہ ہچکچائیں۔'' وہ رونے لگی تو جنرل نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''پاگل ہوگئی ہے' آخری خواہش کیوں! تیری زبان سے نکلنے والا ہر لفظ تیرے باپ کے لیے تیری خوشی کی حیثیت رکھتا ہے۔ آکاش تیرا مقدر ہے تو میں کیوں اور کیسے

روک سکتا ہوں۔ بس یہ تسلی مجھے دے دو کہ تم اس کے ساتھ پُرسکون زندگی گزار سکتی ہو۔''

''مجھے اس پر اور اپنے آپ پر بھروسہ ہے' ڈیڈی!'' وہ تن کر بولی تو جنرل صاحب مسکرا پڑے۔ ان کے چہرے پر طمانیت بکھر گئی۔

☆..................☆

ایس پی گیلانی نے اپنی بیگم کو جلدی جلدی تیاری کرنے کا حکم دیا۔ وہ اس رات ملک سے نکلنا چاہتے تھے۔ مسز گیلانی نے ضروری سامان بریف کیس اور اٹیچی کیسوں میں رکھا اور بولی: ''جلدی کیجیے گیلانی صاحب! اگر وہ حرامزادہ یہاں آن پہنچا تو قیامت آ جائے گی۔'' وہ جلدی سے باہر نکلے۔ گاڑی کی ڈکی میں سامان رکھا اور چوکیدار کو کچھ ہدایات دینے کے بعد گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور کو ایئرپورٹ چلنے کا کہا۔

گاڑی کراچی شہر کی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

آکاش اپنے مخبر سے مل کر گیلانی کی کوٹھی پہنچا۔ اس نے گاڑی کوٹھی سے کافی فاصلے پر کھڑی کی اور جیب میں پسٹل ٹٹولتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھا۔ اس نے کال بیل بجائی تو گیٹ میں بنے روشن دان سے چوکیدار کا چہرہ باہر نکلا۔

''جی صاحب کہیئے!''

''ایس پی صاحب سے کہو کہ ملہوترہ صاحب لاہور سے ملنے آئے ہیں۔'' آکاش نے گوپال سے سُنا ہوا نام بتایا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس وقت گیلانی کسی اور آدمی سے نہیں ملنا چاہے گا مگر چوکیدار نے جو بتایا وہ اس کے لیے حیران کن تھا۔ اتنی جلدی گیلانی کیسے باہر جا سکتا ہے۔ وہ دوڑتا ہوا اپنی گاڑی کے پاس پہنچا۔ چند لمحوں بعد گاڑی ایئرپورٹ کی طرف اُڑی جا رہی تھی۔ وہ جلد از جلد ایئرپورٹ پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے چوکیدار سے یہ پوچھ لیا تھا کہ وہ کون سے ملک جا رہے ہیں۔

قائداعظم انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر رونقیں معمول کے مطابق تھیں۔ جہاز لینڈ بھی کر رہے تھے اور ٹیک آف بھی ہو رہے تھے۔ آکاش نے اپنی گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر کے دوڑ لگا دی۔ سیکنڈ فلور پر جانے کے لیے اس نے الیکٹرک سیڑھیوں کا استعمال کیا۔ وہ مسافروں کو اِدھر اُدھر دھکیلتا ہوا سیکنڈ فلور پر پہنچا تو اس نے برآمدے میں ہر جگہ

دیکھا، گیلانی کہیں بھی نظر نہ آیا تو اس نے اندر دیکھا۔ وہ دور تک جھانک رہا تھا مگر براؤن رنگ کے شیشے ہونے کی وجہ سے اندر کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔

اب اندر جانے کے لیے اُسے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔ برآمدے میں کافی مسافر تھے۔ ہر کوئی اپنی اپنی جلدی میں تھا۔ وہ اِدھر اُدھر نظر دوڑا رہا تھا کہ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، وہ جلدی سے مڑا تو سامنے عاطف کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ پائیلٹ کی یونیفارم میں تھا۔ وہ بے تکلفی سے گلے لگ گیا۔ آکاش نے بھی اُسے بانہوں میں بھر لیا۔

''کیا کر رہے ہو؟ میری پسلیاں توڑو گے۔ چھوڑو بھی یار!'' عاطف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا اُلوؤں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے؟'' وہ شوخی سے بولا۔

''وہ کیا ہے میرا ایک دوست جو کہ جگری یار ہے اس وقت انڈیا جا رہا ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ میں اُسے سی آف کرنے کے لیے آیا ہوں تو لیٹ ہونے کی وجہ سے وہ اندر جا چکا ہے۔ اور میں اندر نہیں جا سکتا۔ دیکھو عاطف تم میرے کلاس فیلو ہو۔ اس وقت ایئرپورٹ پر بھی ہو اور سونے پر سہاگہ یہ کہ پائیلٹ کی یونیفارم میں ہو۔ کیا اس سلسلہ میں میری کچھ مدد کر سکتے ہو۔ پلیز!''

عاطف اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور بولا۔

''اِتنی مدت کے بعد ملے ہو اور اتنے چھوٹے سے کام کے لیے پلیز کہہ رہے ہو۔ مجھے جہاں تک یاد ہے تم کالج میں بدمعاش تھے اور کسی کو پلیز نہیں کہتے تھے۔ خیر چھوڑو یہ کام کر دیتے ہیں۔ آؤ میرے ساتھ!'' یہ کہہ کر عاطف اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اندر لے گیا۔ گیٹ پر کھڑے سکیورٹی گارڈ نے گیٹ کھولا وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ ایک کٹھن ترین مرحلہ احسن طریقے سے حل ہو گیا تھا۔

''اِدھر آؤ کنٹین میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ اور تمہارے دوست کو بھی اعلان کے ذریعے وہیں بلا لیتے ہیں۔ کیا نام ہے تمہارے دوست کا؟'' وہ دونوں چلتے بھی جا رہے تھے اور باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔

''نہیں عاطف! دراصل میں جلدی میں ہوں۔ اگر اس خبیث سے نہ ملا تو وہ بہت خفا ہوگا۔ میں تمہیں پھر مل لوں گا، چائے بھی پی لوں گا اور کالج کی باتیں بھی کریں گے۔'' وہ گیلانی کو ڈھونڈنے کے لیے اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہا تھا۔ امیگریشن کاؤنٹرز پر کافی رش تھا۔ وہ انڈین کاؤنٹر پر آ گئے۔ وہ بے چینی سے گیلانی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ مگر وہ نظر نہ آ رہا تھا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے فرینڈ کا نام کیا ہے۔ میں ابھی اعلان کرواتا ہوں ہم اُسے میرے آفس میں بُلا لیتے ہیں۔'' عاطف نے اس کی بے چینی بھانپتے ہوئے کہا۔

اِسے نام نہیں بتانا چاہیے۔ آکاش نے سوچا تو قدرت نے اس کی مدد کی، عاطف کا موبائل بول اٹھا۔ اس نے کان سے لگا کر دوسری طرف کی کچھ باتیں سنیں اور بولا۔

او کے میں ابھی آتا ہوں، آپ میرا انتظار کریں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور بولا۔

''اچھا بھئی آکاش! تم اپنے دوست کو ڈھونڈو، میں ذرا اپنے آفس جا رہا ہوں۔ میرے ڈیڈی ملنے آئے ہیں، تم یہ میرا کارڈ رکھ لو۔ تمہیں باہر آنے میں آسانی رہے گی۔ اور ہاں میرے آفس ضرور آنا۔'' یہ کہہ کر عاطف نے اُسے جیب سے ایک کارڈ نکال کر اس پر کچھ لکھ کر دے دیا۔ کارڈ لے کر آکاش نے جیب میں ڈالا۔ وہ واپس مڑا تو گیلانی اُسے ویٹنگ لاؤنج کی کرسیوں پر بیٹھا ہوا نظر آ گیا۔ وہ جلدی سے اس کی طرف جانے لگا تو عاطف نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''تمہاری قسمت اچھی ہے مسٹر آکاش!.......... کہ انڈین ایئر لائنز کا طیارہ ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔ تم اپنے دوست سے اچھی طرح ملاقات کر لو۔'' یہ کہہ کر عاطف تو چلا گیا مگر آکاش کے چہرے پر پسینے چھوڑ گیا۔ اس نے شکر کیا کہ کوئی اور بات نہیں ہوئی۔

اس نے دیکھا کہ گیلانی واش روم کی طرف جا رہا تھا۔ یہ تو کام اور بھی آسان ہو گیا تھا۔ وہ بھی گیلانی کے پیچھے واش روم میں داخل ہو گیا۔ اس نے گیلانی کو ایک خانے میں جاتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی اُسے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی دروازے کی کنڈی لگا لی۔ اور اس سے پہلے کہ گیلانی کچھ بولتا، آکاش نے سائیلنسر

لگا ریوالور نکال کر اُس کے منہ میں ڈال دیا۔ حیرت اور پریشانی سے گیلانی کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

"بہت شوق ہے تمہیں دشمنوں کے ساتھ مل کر اپنے وطن کی بہنوں اور بیٹیوں کی عزت فروخت کرنے کا!" وہ دھیمے لہجے میں بول رہا تھا تاکہ کوئی آس پاس کے ٹائیلٹ سے سن نہ سکے۔

"میں حیران ہوں تم ایس پی کیسے بن گئے؟ ڈائریکٹ کنجر ہی کیوں نہ بن گئے؟ بہت بڑا ظلم کیا ہے تم نے جنرل شفیع خان کے ساتھ۔ دوست کو دھوکا دیا ہے' بے وفائی کی ہے تم نے۔ دوست کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ ملک سے غداری کی ہے اور ملک سے غداری کرنے والوں کو آکاش کی عدالت سزائے موت سناتی ہے۔ سزائے موت!" یہ کہہ کر اس نے ٹریگر دبا دیا۔ سائیلنسر لگے ریوالور سے ٹھس ٹھس کی آوازیں اُبھریں اور گیلانی کی کھوپڑی کو روشن دان بنا کر دیوار میں جا لگیں۔ آکاش نے اُسے وہیں پھینک دیا اور پانی چھوڑ دیا وہ باہر نکلا تو اِردگرد کوئی نہ تھا۔ وہ پُرسکون انداز میں ہاتھ جھاڑتا ہوا باہر نکل آیا۔ وہ ویٹنگ چیئرز کی طرف بڑھا اور ایک خالی کرسی دیکھ کر وہاں بیٹھ گیا۔ اُس کے ساتھ والی کرسی پر ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا' وہ اس سے باتیں کرنے لگا۔

"کیا آپ بھی انڈیا جا رہے ہیں؟" آکاش نے پوچھا تو وہ خوش دلی سے بولا۔

"جی ہاں' مگر فلائٹ لیٹ ہے۔"

"ہاں یار' کوئی پرابلم ہوگئی ہوگی۔" آکاش نے اس سے کہا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" اس نے پوچھا تو آکاش کے بتانے پر اس نے بھی اپنا نام وِکی بتایا۔

"اچھا چلیں' ٹائم پاس کرنے کے لیے میں آپ کو ایک جوک سناتا ہوں۔" وِکی نے کہا۔

وہ کوئی بات کرنے لگ گیا تو آکاش نے دور سے عاطف کو آتے ہوئے دیکھا وہ مسکراتا ہوا اُسی کی طرف آ رہا تھا۔ آکاش نے وِکی کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور وِکی کے کندھے پر ہاتھ مار کر زور زور سے ہنسنے لگا۔ وِکی حیرت سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اس

نے زبردستی وِکی کو اٹھایا اور گلے لگا لیا۔ بہت اچھا جوک تھا۔ کیا مزہ آیا' وہ حیران تھا مگر آکاش عاطف پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ اپنے جگری دوست سے مل رہا ہے۔ اتنی دیر میں عاطف ان کے پاس آ گیا۔ اس نے وِکی سے اپنا تعارف کروایا اور آکاش سے بولا۔

"چل بیٹے! اگر فارغ ہوگئے ہو تو تمہیں چائے پلواتا ہوں؟"

"اچھا بھئی وِکی! زندگی میں پھر ملاقات ہوگی۔ بائے!" وہ کہہ کر وِکی کو آنکھ مارتا ہوا عاطف کے ساتھ ہولیا۔ دونوں پُرسکون انداز میں چلتے ہوئے باہر نکل آئے۔ آکاش نے سکون کا سانس لیا۔ اس نے ایک ناممکن کام باآسانی کر لیا تھا۔ ابھی وہ باہر ہی نکلے تھے کہ اندر ہال میں بھگدڑ مچ گئی۔ کوئی خون خون کہہ کر چلا رہا تھا۔ پولیس والے اندر کی طرف بھاگے تو گیلانی کی بیگم چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

"میرے خاوند کو قتل کر دیا ہے۔ کسی نے میرا سہاگ اُجاڑ دیا ہے!" وہ گیلانی کی لاش کو دیکھ کر دھڑا دھڑ رو رہی تھی۔ وہ روتے روتے بے ہوش ہوگئی۔ عاطف کو موبائل پر اطلاع دی گئی تو اس نے آکاش سے کہا۔

"لگتا ہے تمہارے نصیب میں میری چائے نہیں ہے۔ اندر واش روم میں کسی نے کسی کا قتل کر دیا ہے۔ آئی ایم سوری آکاش مجھے جانا ہے۔ پھر ملاقات ہوگی تو ضرور چائے پئیں گے۔" اس نے آکاش سے ہاتھ ملایا اور پاس سے گزرتے ہوئے پولیس والے سے پوچھنے میں مصروف ہوگیا۔

آکاش باآسانی اپنا کام مکمل کر کے واپس جا رہا تھا اور کسی کو اس پر شک بھی نہ ہوا تھا۔ اس کام میں قدرت نے اس کی بڑی مدد کی تھی۔ وہ گاڑی دوڑاتا ہوا جنرل کے فارم کی طرف جا رہا تھا۔

☆.................☆

خیر دین کافی دنوں سے پریشان تھا۔ وہ اپنے بھائی کے محل سے ہو کر آیا تھا۔ آج کا راجہ سلیم اس کا بھائی تھا' جو کل کا ملک شیر علی تھا۔ ملک شیر علی ملک رب نواز کا بھائی جو آج کا فقیر خیر دین تھا وہ ماضی کے دُھندلکوں میں گُم ہونا چاہتا تھا مگر ایک تلخ یاد ایک ایسی حقیقت جو ناقابل فراموش تھی' خیر دین اسے فراموش کرنے کی کوشش میں زندگی کے

پچیس سال گزار چکا تھا۔ ان پچیس سالوں میں اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا تھا۔ بیٹا' بیوی' ماں' باپ' بہن بھائی' روپیہ پیسہ' دولت' جاگیر' سب کچھ کھو دیا تھا۔ صرف ایک طوائف کی خاطر۔ اس طوائف کی خاطر جس نے اس کے ساتھ مرنے جینے کی قسمیں کھائی تھیں مگر ایک موڑ ایسا آ گیا کہ اس طوائف نے اُسے دربدر بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ وہ ایک جاگیردار تھا جن گلیوں میں راج کرتا تھا' جن زمینوں پر اُس کا راج تھا' جس شہر پر اس کی دہشت کی دھاک تھی اسی شہر والوں نے اُسے کتے کی طرح دھتکار کر باہر نکال دیا۔ کام ہی ایسا کیا تھا اس نے۔ اُسے یاد آ رہا تھا کہ کیسے اس کے علاقہ کے لوگ پتھر اور ڈنڈے لے کر اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ''مارو۔ مارو! اسے جان سے مار دو!'' وہ بچے کو گود میں اٹھائے بھاگا جا رہا تھا۔ بچے کے رونے کی آواز اور لوگوں کا شور اُسے تیز بھاگنے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ بھاگتا بھاگتا پکی سڑک پر آ گیا تھا۔ اس نے پاس سے گزرنے والے ٹرک کو ہاتھ کے اشارے سے روکنا چاہا لیکن وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ بدستور اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اتنی دیر میں ایک کار اس کے اشارہ کرنے پر رُک گئی۔ اس نے دیکھا کہ گاڑی میں ایک خوبصورت جوڑا سوار تھا۔ لڑکی باہر نکلی تو اس نے پہچان لیا۔ وہ تجلی کی دوست صنم طوائف تھی اور ساتھ میں اس کا عاشق حشمت علی خان تھا۔ انہوں نے بھی ملک رب نواز کو پہچان کر جلدی سے گاڑی میں سوار کرلیا اور اس سے پہلے کہ لوگ اس پر پتھر پھینکتے گاڑی اُڑن چھو ہو چکی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر خیر دین ماضی سے نکل آیا۔ اس نے دیکھا کہ احمد رضا مسکراتا ہوا اندر داخل ہو کر دروازے کو کنڈی لگا رہا ہے۔

''کیا بات ہے' خوش نظر آ رہے ہو؟'' خیر دین نے پوچھا تو رضا اس کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''ابا! یہ پیار' یہ محبت میں تو سمجھتا تھا کہ سبھی کتابی باتیں ہیں۔ بس قصے کہانیوں میں ایسا ہوتا ہے مگر سچ ہی کہا ہے کسی نے کہ جس تن لاگے سو تن جانے۔''

آج کچھ رومانٹک ہو رہے ہو!''

''بس ابا! مجھے محبت ہوگئی ہے۔ آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ میرے باپ ہی نہیں بلکہ اچھے دوست بھی ہیں۔''

''اس میں کیا شک ہے۔ کھل کر بات کرو۔ دوستی میں پہیلیاں نہیں ہوتیں۔ تمام باتیں صاف صاف ہوتی ہیں۔'' خیر دین نے کہا۔

''ابا! لڑکی بہت امیر ہے۔ اتنی امیر کہ ہم لوگ اتنی دولت کا تصور ہی کر سکتے ہیں پرابلم یہ ہے کہ لڑکی جتنی امیر ہے میں اتنا ہی غریب ہوں۔ یہ محبت ہمیشہ ان دو طبقوں کے درمیان کیوں ہوتی ہے جن میں اُونچ نیچ ہو۔ میں نے سنا ہے ابا ایسی محبت پروان نہیں چڑھتی کیونکہ لڑکی کا باپ یا ماں وِلن بن جاتے ہیں اور لوَرز میں سے کسی ایک کو قربانی کا بکرا بننا پڑتا ہے اور کبھی کبھی تو دونوں ہی اللہ حافظ ہو جاتے ہیں۔'' رضا مزید بولنا چاہتا تھا کہ خیر دین چارپائی سے اُٹھتا ہوا بولا ''میں چائے بنانا چاہتا تھا۔ تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ تم آ گئے ہو۔ کیا چائے پیو گے؟''

''ضرور پیوں گا ابا! مگر میری بات تو ادھوری رہ گئی۔ ڈر ہے کہیں میرا پیار بھی ادھورا نہ رہ جائے۔'' رضا نے مایوسانہ لہجے میں کہا تو خیر دین چولہے پر دیگچی رکھتا ہوا پلٹا اور بولا۔

''محبت اُن دو طبقوں کے درمیان بھی ہو جو ایک جیسے سٹیٹس رکھتے ہوں تب بھی لوگ اس کے دشمن ہوتے ہیں۔ یہ روپیہ پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے۔ تو یہ فکر مت کر کہ تو غریب ہے۔ تیرے باپ نے ان پچیس سالوں میں بہت کمایا ہے۔ اتنا کمایا ہے کہ تیری سوچ بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ لڑکی کے ماں باپ کی دولت کا پریشر مت لینا۔ ان سے زیادہ دولت تیرے باپ کے پاس ہے۔ ایک فون کروں گا تو لڑکی کی ماں اور اس کا باپ لڑکی کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں خود دینے آئیں گے۔ بول شرط لگاتا ہے یا نہیں۔'' خیر دین کافی خوشگوار موڈ میں تھا۔ رضا بھی مسکراتے ہوئے بولا:

''ابا! آپ اتنے بڑے بوڑھے ہو گئے ہو مگر مذاق کی عادت نہ گئی۔''

''اچھا! تم میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو۔ اچھا یہ بتاؤ۔ وہی لڑکی ہے نا' جس کے ساتھ تم گاڑی میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن گئے تھے؟''

''ہاں وہی لڑکی ہے۔ اس کا باپ یہاں کا......''

''ایم این اے ہے۔ اُس کی ماں کا نام تجلی بیگم ہے۔ اُس کا بھائی احمد طماس' اس کی بڑی بہن کاجل ہے۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا تم!'' خیر دین نے رضا کی بات کاٹ کر پوچھا۔ رضا حیرت کے جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''یہ سب آپکو کیسے پتہ ہے؟ کیا آپ ان کی فیملی کو جانتے ہیں؟ بتایئے نا بابا! بتایئے نا!'' اس نے خیر دین کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑنا شروع کر دیا۔

''بتاتا ہوں' چائے تو پیو۔''

''میں راجہ صاحب کے محل جاتا رہتا ہوں۔'' خیر دین نے جھوٹ بولنا شروع کیا۔

''آپ راجہ سلیم کے محل جاتے رہتے ہیں؟ مگر کس لیئے' کیوں اور کیسے؟ اُن کے سکیورٹی گارڈز تو وہاں کسی کو جانے نہیں دیتے۔''

''میں وہاں میڈم سے زکوٰۃ لینے' صدقہ خیرات لینے جاتا ہوں۔ راجہ صاحب بہت مہربان ہیں۔ کبھی کبھی اپنے کپڑے بھی مجھے دے دیتے ہیں۔ ایک دن تجلی بیگم نے مجھے اپنے کپڑے دے دیئے۔ میں نے کہا بیگم صاحبہ میری تو کوئی بیٹی نہیں ہے۔ بس بیٹا ہی ہے۔ اُس کے لیے کچھ دینا ہے تو دے دیں۔ انہوں نے یہ شرٹ جو تم نے پہن رکھی ہے دے دی۔'' یہ کہہ کر خیر دین نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

رضا تڑپ کر بولا: ''ابا! تیری گود میں آنکھ کھولی ہے میں نے۔ میں نہیں جانتا کہ ماں کیسی ہوتی ہے اور کتنا پیار کرتی ہے۔ بس تمہیں ہی اپنی ماں سمجھا ہے ابا! میرے ساتھ پیار سے باتیں کرتا کرتا یہ بھی بھول گیا کہ میں تیری رگ رگ سے واقف ہوں۔ تیرا بیٹا ہوں تُو اچھا باپ ہے مگر اچھا ایکٹر نہیں' ابا جھوٹ بولنے کے لیے اچھی ایکٹنگ کی تربیت ضروری ہے۔''

''وہ بیٹا میں دراصل...... سچ کہہ رہا ہوں۔'' خیر دین نے آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی چھپاتے ہوئے کہا۔

''نہیں ابا! تم اب بھی جھوٹ بول رہے ہو۔ بتاؤ نا۔ تم کیسے جانتے ہو راجہ صاحب کو؟ تمہیں بتانا پڑے گا۔ میں تمہارا دوست ہوں نا۔ اور دوستوں سے کوئی بات چھپانا بھی دوستی کی توہین ہے۔ بول ابا! بول نا! تیری آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کے موتی بتا رہے ہیں کہ کوئی بہت بڑی کہانی ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو!''

خیر دین نے رضا کو دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''ٹھیک ہے بتاؤں گا۔ ضرور بتاؤں گا مگر تجھے ایک کام کرنا ہو گا۔ بہت کٹھن کام!''

''یہ شرط ہے؟'' رضا نے پوچھا۔

''نہیں' یہ ضروری ہے۔ جو کہانی تم سننا چاہتے ہو' اس کے لیے یہ کام بہت ضروری ہے۔ بولو کرو گے؟''

''ابا! مجھے ٹالنا چاہتے ہو! بیکار کی باتوں میں اُلجھا رہے ہو۔''

''نہیں مجھ پر اعتماد کرو۔ یہ سچ ہے کہ جو داستان میرے دل میں چھپی ہوئی ہے اس کے لیے تمہیں یہ کام کرنا ہو گا۔''

''بتاؤ ابا! میں اپنی محبت پانے کے لیے ضرور کروں گا چاہے کتنا بھی کٹھن کام ہو۔''

''وہ لڑکی جس کا نام چاندنی ہے' کیا وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے؟ سوچ کر جواب دینا۔ تمہارا غلط جواب میری زندگی میں مزید الجھنیں پیدا کر سکتا ہے۔''

''ابھی کھل کر تو اظہار نہیں کیا مگر مجھے اندازہ ہے کہ وہ بھی مجھ سے..........!''

''محبت اندازوں کی بنیاد پر نہیں کی جاتی۔ محبت کی عمارت تعمیر کرنے کے لیے بنیاد کا مضبوط ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر اس کی بنیاد میں ایک اینٹ بھی اندازے سے رکھ دی جائے تو پھر تمام عمارت ٹیڑھی بن جاتی ہے۔ پھر اس کی دیواریں لرزنے لگتی ہیں۔ زمانے کے حوادث سے اس کی چھتیں ڈھے جاتی ہیں۔ اور محبت کی یہ عمارت جو اندازوں پر قائم ہوتی ہے' صرف ایک اینٹ غلط لگ جانے سے ملبے کا ڈھیر بن جاتی ہے اور پیار کرنے والوں کی شکلیں لوگوں کو پہچاننا مشکل ہو جاتی ہیں۔ یقین اور وثوق سے بات کرو رضا!''

''میں کچھ کہہ نہیں سکتا ابا!''

''یہی کام تمہیں کرنا ہے رضا! میں نہیں چاہتا کہ جو تمہارے باپ کے ساتھ ہوا' وہ تمہارے ساتھ بھی ہو۔''

''کیا مطلب ابا!؟''

''مطلب کو چھوڑو۔ لڑکی کے دل میں جگہ بناؤ۔ اس طرح جگہ کو ریزرو کر لو کہ اس کا دھیان کسی اور کی طرف نہ جائے اور نہ ہی کوئی اس جگہ کو لے پائے۔ تمہیں یہ کرنا ہے کہ

لڑکی کو اچھی طرح اپنی محبت کا یقین دلاؤ۔ اور اسے یہ بتاؤ کہ تم فقیر کے بیٹے ہو پھر بھی اگر وہ تم سے محبت کرے، تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے اپنے ماں باپ اور بھائی کو چھوڑنے کے ساتھ ساتھ محلوں کے سُکھ آرام، آسائشیں اور سب کچھ چھوڑ کر اس جھونپڑی میں رہ سکتی ہو تو اُسے کسی دن میری موجودگی میں اس گھر میں لا کر ایک کپ چائے پلواؤ۔ بس جس دن تم اُسے اس گھر میں لے آئے میں تمہیں تمام داستان بھی سناؤں گا اور یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری شادی اُسی لڑکی سے ہوگی۔'' خیر دین یہ کہہ کر اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''کیا یہ چیلنج ہے؟'' رضا نے پوچھا تو خیر دین لیٹتے ہوئے بولا۔

''نہیں، نہ یہ شرط ہے نہ یہ چیلنج ہے، کیونکہ محبت اور پیار شرطوں پر نہیں کیا جاتا۔ یہ تو دو دلوں کے سودے ہوتے ہیں۔ تڑپ اور خلوص محبت کی شرطیں ہیں۔ پہلے اپنے اندر یہ پیدا کر لو۔ پھر کوئی بنیاد رکھنا اور اس کے بعد کوئی عمارت تعمیر کرنا۔ اب سو جاؤ صبح سے تمہارا کام دوگنا ہو جائے گا۔ تعلیم بھی اور محبت بھی۔'' یہ کہہ کر خیر دین نے آنکھیں بند کر لیں۔

اگر وہ راضی نہ ہوئی ابا! تو میں مر جاؤں گا۔ اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی ناممکن ہے۔ ابا! ابا! میری بات سُن رہے ہو نا!'' مگر خیر دین کے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے۔

''بہت بڑا ایکٹر ہے تُو! میں تو سمجھا کہ بس یونہی ہے۔ پر میرا باپ ہے نا!'' یہ کہہ کر رضا نے بلب آف کیا اور سونے کے لیے اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔

اگلی صبح کالج کے گیٹ پر اس کی ملاقات احمد طماس سے ہوئی۔

''کہو کیسے ہو، طماس!'' رضا نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ مگر طماس نے کوئی جواب نہ دیا تو رضا دوبارہ حیرانی سے بولا۔

''میں نے پوچھا ہے کیسے ہو؟'' وہ کالج میں داخل ہو گئے تھے۔ لڑکے اور لڑکیاں کالج آ رہے تھے۔ کوئی گاڑی میں تو کوئی موٹر سائیکل پر۔ وہ چلتے ہوئے اپنے کلاس روم کے باہر پہنچ گئے تو طماس بولا: ''رضا! یار ایک پرابلم ہے۔ اُس کا کوئی حل نظر نہیں آ رہا۔''

''بولو! ہم اُس کا کوئی حل بھی نکال لیں گے۔''

''میں نہیں کہوں گا۔ تم چاندنی سے مل لینا۔'' طماس نے کہا تو رضا نے حیرت سے پھر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا کوئی اہم مسئلہ ہے، جو چاندنی سے مل کر حل کرنا ہوگا؟'' وہ چاندنی سے ملنے کے خیال پر دلی طور پر خوش ہوا تھا، مگر طماس پر اس کا اظہار نہ کر سکتا تھا۔

''دراصل کل رات سے مما اور پاپا نے ہمیں ٹینشن میں ڈالا ہوا ہے۔ ان کا رویہ اور برتاؤ ایک دوسرے کے ساتھ تو عجیب ہے ہی، وہ اس چکی میں ہم دونوں کو بھی پیس رہے ہیں۔'' طماس افسردہ دکھائی دے رہا تھا۔

''ایسا کرتے ہیں۔ ابھی کلاس اٹینڈ کرتے ہیں، پیریڈ مس ہو جائے گا۔ بعد میں فارغ وقت میں بات کریں گے۔ او کے! ناؤ ریلیکس! مجھے تم کافی ڈسٹرب لگ رہے ہو۔ چلو اندر چلتے ہیں۔'' رضا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کلاس روم میں چلا گیا۔ طماس بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ پروفیسر عطاء اللہ کشش ثقل کے بارے میں لیکچر دے رہے تھے۔ دونوں بلکہ تمام کلاس نے ان کا لیکچر غور سے سنا۔ پیریڈ ختم ہوتے ہی کلاس تتر بتر ہو گئی۔ وہ بھی لان میں آ بیٹھے۔ احمد طماس کا موبائل بول اٹھا۔ اس نے دیکھا کہ چاندنی کا نمبر ہے۔ آن کر کے کان کو لگایا۔

''کہو چاندنی! کہاں ہو تم؟''

دوسری طرف سے کہا گیا کہ ''میں اس وقت ایئرپورٹ سے بول رہی ہوں۔ ہماری ٹیچر کو انگلینڈ جانا تھا۔ کالج پہنچ کر پتہ چلا، ہم چار پانچ لڑکیاں انہیں سی آف کرنے آئی ہوئی ہیں۔ رضا کہاں ہے؟''

''وہ میرے پاس بیٹھا ہے۔'' طماس نے رضا کی طرف دیکھ کر کہا تو رضا حیران ہوا۔ ظاہر ہے طماس کا بتانے کا انداز ایسا تھا کہ دوسری طرف سے چاندنی نے اس کا پوچھا ہوگا۔

''ٹھیک ہے تم رضا کو اپنی گاڑی میں لے کر جناح گارڈن آ جاؤ۔ میں بھی وہیں پہنچ رہی ہوں۔ او کے بائے!'' یہ کہہ کر طماس نے رابطہ ختم کر دیا اور طماس رضا کا ہاتھ پکڑ کر

اٹھاتے ہوئے بولا: ''چلو بھئی رضا! چاندنی جناح گارڈن میں ہمارا انتظار کر رہی ہے۔''

''مگر کیوں؟ اور یار ابھی تو ایک ہی پیریڈ پڑھا ہے!''

''کوئی بات نہیں۔ اب کون سا امتحان سر پر ہیں۔ یہ سال کا آغاز ہے ابھی تو کلاسز میں حاضری بھی پوری نہیں ہے۔ جلدی کرو وہ تم سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔'' طماس نے اُسے کھینچ کر اٹھایا۔ رضا تو خود چاندنی کا دیدار کرنا چاہتا تھا' وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔

طماس نے کالج کے گیراج سے گاڑی نکالی اور وہ دونوں جناح گارڈن کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہاں ایک مخصوص جگہ پر چاندنی ان کی منتظر تھی۔ احمد رضا کی آنکھوں پر چشمہ نہ ہوتا تو اس کی آنکھیں چندھیا جاتیں کیونکہ واقعی لگتا تھا چاند اپنی تمام تر چاندنی زمین پر بکھیر کر غائب ہوگیا ہے۔

گہرے مونگیا رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے' وہ کالا دوپٹہ گلے میں لٹکائے پتھر کے بنچ پر بیٹھی ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جب رضا اور طماس اُس کے پاس آئے تو اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ وہ بے اختیار ہوکر اٹھ کھڑی ہوئی۔ نجانے کیا بات تھی رضا کی آنکھوں میں' رضا کی شخصیت میں' رضا کی قربت میں' وہ اپنا سب کچھ بھول جاتی تھی۔ رضا نے بھی اسے اٹھتا دیکھ کر اپنا چشمہ اتار لیا تھا اور اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے اس کے پاس گھاس پر بیٹھ گئے اور چاندنی کو بھی بنچ چھوڑنا پڑا۔ وہ تینوں نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ چاندنی سوچ رہی تھی کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ اس کی تو زبان گنگ ہوگئی تھی۔ حالانکہ بہت اہم اور سیریس مسئلہ تھا جو وہ رضا سے ڈسکس کرنا چاہتے تھے۔ اب بات نہیں ہو رہی تھی۔

بات بنتی نہیں پیار میں انتظار کے بغیر
تبھی تو ادھورا ہے آدمی پیار کے بغیر

بڑا ہی مان تھا ہمیں قوتِ اعصاب پر
دِل کٹ گیا مگر کسی اوزار کے بغیر

یہ حالت چاندنی کی ہو رہی تھی۔ پہلے تو رضا کا انتظار کر رہی تھی۔ خود کو تنہا اور ادھورا محسوس کر رہی تھی۔ بہت کچھ سوچا تھا کہنے کو۔ دل مضبوط کر کے یہ کہے گی وہ کہے گی مگر اس کی آنکھوں میں نجانے کیا ہے۔ دل پر قابو نہیں رہتا۔ اس نے دل کڑا کر کے کہنا شروع کیا۔

''دیکھیے رضا! آپ کو زحمت دی۔ اس کے لیے معذرت چاہتی ہوں۔'' وہ بولتی کیا تھی پھول اور کلیاں جھڑ رہے تھے۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا:

''ایکچو لی ہماری پرابلم یہ ہے کہ کل ہم کسی دوست کی شادی سے واپس آئے تو پاپا جانی سے ملاقات ہوگئی۔ گھر میں مما کو دیکھ کر ہم انہیں ملنے ان کے کمرے میں چلے گئے۔'' پھر چاندنی نے وہ تمام بات بیان کر دی۔ رضا بہت غور سے سُن رہا تھا۔ تمام بات سن کر بولا۔

''یہ ہے تو تمہارا ذاتی معاملہ' مجھے اس میں انٹر نہیں ہونا چاہیے۔''

''ہم بھی آپ کو اپنا سمجھتے ہیں۔ تبھی تو پرسنل پرابلم کسی اور کو بتانے کی بجائے آپ کو ترجیح دی ہے۔ پلیز ہماری ہیلپ کریں۔ ہم دونوں بہن بھائی خود کو تنہا اور کمزور محسوس کرتے ہیں۔ آپ کا ساتھ میرے لیے میرا مطلب ہے ہم دونوں کے لیے بہت ضروری ہے' پلیز!'' چاندنی نے منت کی۔

''میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ آپ تھوڑا سا انڈی کیٹ کریں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں اور زندگی میں کبھی تنہا نہ ہونے دوں گا یہ میرا وعدہ ہے...... طماس تم سے!'' آخری الفاظ اس نے طماس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہے جبکہ فقرے کا آغاز اس نے چاندنی کو دیکھ کر کیا تھا۔ یہ بات چاندنی نے بھی محسوس کر لی تھی۔

''ہمیں یہی پتہ چلانا ہے کہ لاڈو کون ہے جس سے مما بات کر رہی تھیں اور کاجل آپی بقول پاپا جانی کے امریکہ میں رہتی ہیں۔ مگر ہر بار ٹرین سے آتی اور جاتی ہیں اور ابھی تو ہم آپ کے ساتھ ہی تھوڑے دن پہلے انہیں ریلوے اسٹیشن پر سی آف کرنے گئے تھے۔ وہ اب پھر جلد ہی یعنی آج یا کل یہاں پہنچ رہی ہیں۔ مما کون سا کاروبار کرتی ہیں۔ یہ سب باتیں آپ ہی معلوم کر سکتے ہیں کیونکہ مما نے آپ کو دیکھا نہیں ہے۔ ان

کا آپ سے تعارف بھی نہیں ہوا ہے۔ آپ ہماری اس الجھن کو حل کریں گے نا؟''
چاندنی کا لہجہ درخواست کرنے والا تھا۔

رضا کو اس پر بہت پیار آیا۔

''چاندنی جی! آپ طماس کی سسٹر ہیں۔ میرے لیے قابلِ ریسپکٹ ہیں۔ طماس کا مسئلہ میرا مسئلہ ہے کیونکہ وہ میرا دوست ہے اور اس پریشانی میں میں اپنے دوست کو تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ آپ کچھ باتوں کے جواب دینا پسند کریں گی؟'' رضا نے چاندنی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی دنیا ہی بدل دی تھی۔ کتنا پیارا لہجہ تھا' اُس کے بات کرنے کا۔

''جی پوچھیے۔'' وہ دور کہیں دیکھتی ہوئی بولی تو احمد رضا تھوڑا سا شوخ ہو کر بولا:

''میں اِدھر ہوں' آپ کہاں ڈھونڈ رہی ہیں؟''

چاندنی اس اچانک بات پر سٹپٹا گئی اور جلدی سے بولی۔

''نہیں نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ پوچھیے' جس بات کا مجھے پتہ ہوگا ضرور بتاؤں گی اور بھائی بھی تو پاس ہے وہ بھی آپ کے سوالوں کے جواب دے گا۔ یقیناً یہ ہمارا مسئلہ ہے۔''

''سب سے پہلے یہ بتایئے کہ آپ کے والدین کی آپس میں کتنی انڈرسٹینڈنگ ہے؟''

''وہ کئی کئی دن ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھ پاتے کیونکہ پاپا جانی اپنی سیاسی بساط بچھانے میں اور مما نجانے کس بزنس میں مصروف رہتی ہیں۔ دونوں راتوں کو کم ہی گھر لوٹتے ہیں۔'' چاندنی نے جواب دیا۔

''کیا تمہاری مما کاجل سے زیادہ اور تم سے میرا مطلب ہے آپ دونوں سے کم پیار کرتی ہیں؟''

''ہاں رضا! یہ بات میں نے کئی مرتبہ محسوس کی ہے۔ جب آپی کاجل یہاں آئی ہوتی ہیں' مما انہیں ہم سے زیادہ ترجیح دیتی ہیں۔'' اس بار طماس نے جواب دیا۔ ''کیا اس سے پہلے تم نے کبھی مما کو فون پر یا کسی ایسے شخص سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے جو تمہیں پہلی ہی نظر میں ناپسندیدہ لگا ہو؟''

''کیا مطلب؟ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' چاندنی نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''خفا ہونے کی بجائے سوچ کر جواب دیں۔'' رضا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں' میں آپ سے تو خفا نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ آپ جو بھی بات کریں گے ہمارے فائدے کے لیے کریں گے۔ مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا ہے۔'' وہ سوچتے ہوئی بولی۔

''ایک مرتبہ میں کالج سے جلدی واپس آئی تو ڈرائنگ روم سے پاپا کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی سے باتیں کر رہے تھے۔ میں کالج یونیفارم میں وہاں چلی گئی۔ اندر صوفوں پر مما' ڈیڈی اور دو عورتوں کے علاوہ دو مرد اور بھی تھے جنہیں میں پہلی مرتبہ دیکھ رہی تھی۔ ڈیڈی غصہ میں لگ رہے تھے جبکہ مما لبوں پر مسکراہٹ سجائے سامنے بیٹھے آدمی سے باتیں کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی تمام لوگ خاموش ہو گئے۔ میں نے اخلاقی قدروں کے مطابق سلام کیا تو مما نے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی سے میرا تعارف کروایا۔

''ملہوترہ! یہ میری چھوٹی بیٹی چاندنی ہے اور بیٹی' یہ ہمارے دوست اور مہمان ملہوترہ ہیں' انڈیا سے آئے ہیں۔ وہاں ان کا بہت بڑا بزنس ہے۔ یہ ان کی مسز شانتی ہیں' یہ گوپال ورما ہیں۔ اور یہ ساتھ ان کی سسٹر سونیا ہیں۔'' مما کے تعارف کروانے پر میں نے بھی سر کو ہلکا سا جھکا کر سلام کیا جبکہ انہوں نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا تھا۔ مجھے وہ تمام لوگ ناپسندیدہ لگے تھے' کیونکہ ملہوترہ میری طرف دیکھ کر ہونٹوں پر زبان بھی پھیر رہا تھا۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں گوپال ورما کو اشارے بھی کر رہا تھا۔''

چاندنی کے خاموش ہونے پر رضا نے پھر پوچھنا شروع کیا۔ چاندنی اور طماس اس کے سوالوں کے جواب دے رہے تھے۔ کافی وقت اسی طرح گزر گیا تو طماس کے موبائیل نے انہیں احساس دلایا کہ وہ کہاں بیٹھے ہیں۔ دوسری طرف سے کچھ سنتے ہی اس نے معذرت کی اور کہا کہ میں ابھی پہنچتا ہوں۔ اس نے موبائیل بند کر کے شرٹ کی جیب میں ڈالا اور اٹھتا ہوا بولا:

''آئی ایم سوری گائس! میرے دوست کی منگنی تھی اور بارہ بجے کا ٹائم تھا۔ اب تو کافی دیر ہوگئی ہے' میں چلتا ہوں۔ چاندنی! تم رضا کو ڈراپ کر دینا۔ او کے بائے!'' وہ جلدی جلدی وہاں سے چلا گیا۔

اُس کے جانے کے بعد چاندنی خاموش ہوگئی تو رضا بولا۔

''میں آپ کی پرابلم حل کرنے کی ضرور کوشش کروں گا۔ آپ پریشان مت ہوں۔ ری لیکس ہو جائیں اور فی الحال میری ایک پرابلم ہے وہ آپ ہی حل کر سکتی ہیں۔''

''کیا؟ کہیے نا!'' وہ جلدی سے بولی۔

''مجھے چائے کی طلب ہو رہی ہے۔ آپ کیسی مہمان نواز ہیں' چائے کا پوچھا ہی نہیں۔''

''اوہ آئی ایم سوری! دراصل اپنی باتوں میں اس قدر اُلجھی ہوں کہ یاد ہی نہیں رہا۔ چلئے کسی اچھے سے پوائنٹ پر چل کر چائے پیتے ہیں۔'' وہ شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

وہ دونوں اُٹھ کر گھاس کو روندتے ہوئے چلنے لگے۔ تو رضا بولا۔

''ویسے آپ کاٹتی بہت زور سے ہیں۔''

''کیا مطلب؟ آپ کو کب کاٹا ہے؟'' وہ لبوں پر شریر مسکراہٹ لا کر بولی۔

''آپ کے لبوں پر شرارتی ہنسی بتا رہی ہے کہ آپ بہت ذہین ہیں' بات فوراً یاد آ جاتی ہے آپ کو۔'' رضا نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا تو چاندنی دوسری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

دونوں چلتے ہوئے چاندنی کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اسٹیرنگ پر ظاہر ہے چاندنی تھی۔ وہ گاڑی چلاتی ہوئی کافی شاپ کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ رضا کی قُربت نے اُسے عجیب ہی احساس دلایا تھا۔ وہ گاڑی میں نہیں بلکہ خود کو ہوا میں اڑتی ہوئی محسوس کر رہی تھی اور رضا بھی خود کو خوش قسمت سمجھ رہا تھا' کیونکہ مطلوب طالب کے ساتھ ہی تھا۔ اب مزید فاصلے کم ہوں گے۔ دونوں ری لیکس ہو کر چائے پی رہے تھے' رضا بولا۔

''یہ آپ کے ساتھ پہلی چائے ہے۔ اس کا سواد ہی نرالا ہو گیا ہے۔''

''کچھ ایسا ہی معاملہ اِدھر بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہاں کی چائے اچھی ہوتی

ہے!'' چاندنی بھی بولی۔ وہ خود کو اب پُرسکون محسوس کر رہی تھی۔

''اب اس کا بل میں دوں گا کیونکہ یہ میری طرف سے ہے۔ پہلی چائے میری طرف سے۔'' رضا نے کہا تو چاندنی نے ہاتھ میں پکڑا ہوا کالج بیگ کھول کر سو کا نوٹ نکالا اور ویٹر کو بلایا۔

''اس پہلی چائے کا بل میں دوں گی۔ جب میں آپ کے گھر آؤں گی تو پھر آپ سے چائے پیوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

''کیا ہم اس تکلف کو ختم نہیں کر سکتے؟'' رضا نے کہا تو چاندنی نے حیرت سے پوچھا۔

''کس تکلف کو؟''

''یہی کہ ہم کب تک ایک دوسرے کو آپ آپ کہتے رہیں گے؟'' رضا نے کہا تو چاندنی نے شرما کر منہ دوسری طرف کر لیا۔

''ٹھیک ہے۔ ایز یُو لائیک رضا!'' ("As you like Raza!")

''گڈ! اب مزہ آئے گا۔'' رضا نے کہا تو چاندنی بولی۔

''کس بات کا؟''

''میرا خیال ہے چلیں۔ آپ کو بھی میرا مطلب ہے چاندنی کہ تمہیں بھی دیر ہو رہی ہوگی۔''

''کیا اُکتا گئے ہو مجھ سے؟''

''ایسا زندگی میں کبھی نہ سوچنا۔ کوئی اپنوں سے بھی اُکتاتا ہے۔''

''او کے! دیکھ لیں گے! زندگی تو بہت لمبی ہوتی ہے۔ بعض اوقات تو دو قدم بھی چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ دیکھیں گے تم کہاں تک چلتے ہو۔'' چاندنی آہستہ آہستہ دل کی باتیں زبان پر لا رہی تھی۔

یہ کائنات جہاں تک ہے' جہاں تک تم میرے ساتھ چلنا چاہو' تمہارے قدم سے قدم ملا کر چلوں گا۔''

باتیں زبان پر آ ہی گئی تھیں۔ ''کیا اس دوران کوئی مجبوری تو راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گی؟''

"رکاوٹیں دور کر کے ہی منزل پر پہنچا جاتا ہے۔" چاندنی نے کہا تو رضا مسکرا پڑا۔
وہ دونوں وہاں سے اُٹھے تو کالج کے سامنے رضا نے گاڑی رکوالی۔ چاندنی نے بریک لگائی تو رضا باہر نکلنے لگا۔ چاندنی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔
"زندگی بھر ساتھ چلنے کا ارادہ تھا اور ابھی تو راستہ ہی ہے۔ کیا راہ میں ہی چھوڑنے کا ارادہ ہے؟ ابھی تو منزل بہت دور ہے......"

تیرا ساتھ ہو جو کبھی چاندنی رات میں
پھر کیوں نہ بکھریں جلوے اس کائنات میں

تیرا ساتھ ہو نہ گھبراؤں گردشِ دوراں سے
کہ پوشیدہ ہو جیت میری ہر مات میں

"منزل کتنی بھی دور ہو' راستہ کتنا بھی کٹھن ہو' رضا تمہارے ساتھ ہوگا۔ کبھی بھی آواز دے لینا' اپنے دل کے پاس ہی پاؤ گی۔ خداحافظ!" یہ کہہ کر رضا گاڑی سے نکلا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ چاندنی گاڑی آگے بڑھاتی ہوئی چلی گئی۔ کالج ٹائم تو ختم ہو چکا تھا۔ اُسے تو اب بس کا انتظار تھا۔ جس میں بیٹھ کر وہ جلدی جلدی گھر جانا چاہتا تھا اور بابا سے چاندنی کی مشکل کو ڈسکس کرنا چاہتا تھا۔

☆.......... ......☆

"ایک معمولی سا کام نہیں کر سکے حرامزادو! مفت میں روٹیاں توڑ رہے ہو۔ ہزاروں روپیہ خرچ ہوتا ہے تمہارے رہن سہن پر' تمہارا کپڑا' تمہارا کھانا' تمہاری شراب شباب اور نجانے کیا کچھ ہر ماہ مل ملا کر لاکھوں روپے بن جاتے ہیں۔ کس لیے' کس لیے تمہیں رکھا ہے؟ میں یہ الیکشن ہر حال میں جیتنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے چاہے مجھے اپنے بیٹے کو کھونا پڑے۔ مجھے ہر حال میں...... " یہ راجہ سلیم تھا' جو اپنے کتوں پر برس رہا تھا۔
"تم جو خود کو ٹائیگر کہتے ہو۔ جرم کی دنیا میں بڑا نام ہے تمہارا۔ بڑے بڑے غنڈے تمہارے نام سے کانپتے ہیں۔ ایک ایسا کام جو نہایت آسان تھا وہ نہیں کر سکے۔ دیکھو ٹائیگر! میں کوئی بھی رسک نہیں لینا چاہتا۔ الیکشن سر پر آ رہے ہیں۔ آج پارٹی کے

جنرل سیکرٹری سے میری میٹنگ ہے۔ میں اپنے لیے ٹکٹ کنفرم کروا چکا ہوں۔ بس اب یہ سیاسی چال تمہارے ہاتھ میں ہے۔" اس نے غصے سے تمام غنڈوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
اس وقت وہ اپنے خفیہ اڈے پر تھا۔ اپنے پالے ہوئے کتوں کے ساتھ۔ اس کا مطلب ہے کہ اپنے بیٹے پر قاتلانہ حملہ اسی نے کروایا تھا۔
"سر! ہم آپ کے غلام ہیں۔ آپ کا کھاتے ہیں اور آپ کے کھائے ہوئے نمک سے کبھی بھی بے وفائی نہیں کریں گے۔ وہ اس کا دوست اُسے بچا کر لے گیا ورنہ چھوٹے راجہ صاحب اس وقت اگلے جہان ہوتے۔" ٹائیگر نے کہا تو راجہ سلیم نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اُسے کھا جائے گا۔ "کتے کے بچے! اس کو بھی ایک گولی کی خوراک دے دینی تھی۔ یہ ہے کون؟ اس کا پتہ کراؤ۔ وہ کہاں رہتا ہے' کس کا بیٹا ہے؟ یہ کام بہت ضروری ہے۔ یہ دیکھو اس کے آگے پیچھے کوئی رونے والا بھی ہے یا نہیں۔ دیکھو ٹائیگر اپوزیشن نے میری پوزیشن خراب کر دی ہے۔ میرے حلقہ میں لوگ مجھے دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ ملک نواز احمد میرا سب سے بڑا حریف ہے۔ اگر وہ الیکشن جیت گیا تو لوگ تھو تھو کریں گے مجھ پر۔ جتنا روپیہ جتنا پیسہ چاہیے سب لٹا دو' سب کچھ لٹا دو۔ بس مجھے یہ کرسی چاہیے۔ کرسی!......" وہ دیوانوں کی طرح چلا رہا تھا۔ تمام لوگ خاموش کھڑے تھے۔
"سر! ہمیں تین نئے پسٹل چاہئیں کیونکہ اس گروپ میں نئے لڑکوں کو شامل کیا گیا ہے۔ اب میں سامنے نہیں جاؤں گا۔ یہ کام ان سے کرواؤں گا اور اس بار ناکامی نہیں ہوگی۔ یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔" ٹائیگر نے آگے بڑھ کر کہا تو راجہ صاحب اپنی کرسی سے تیزی سے اُٹھ کر ٹائیگر کے پاس آئے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "تمہیں ریوالور چاہئیں' میں تمہیں ریپٹر دوں گا۔ تمہیں لاکھ چاہیے میں دو لاکھ دوں گا۔ بس مجھے میرا کام چاہیے اور ناکامی تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی موت بن سکتی ہے۔ اِٹز لاسٹ وارننگ فار یو۔ انڈرسٹینڈ......!" یہ کہہ کر وہ باہر چلے گئے تو باقی لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔
"ٹائیگر! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ شخص اپنے ہی بیٹے کا دشمن کیوں ہے؟" ایک

ساتھی نے آگے بڑھ کر پوچھا' تو ٹائیگر نے شراب گلاس میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

''بے وقوف آدمی! یہ اس ملک کی سیاست ہے۔ یہ شخص اپنے بیٹے کو قتل کروا کے لوگوں کی نگاہوں میں مظلوم بننا چاہتا ہے۔ یہ لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنے بیٹے کی لاش کو کیش کروائے اور تمام الزام اپوزیشن یا حریف امیدوار پر ڈال دے۔ لوگ ملک نواز سے نفرت کریں گے کہ دیکھو کرسی کے لیے اس شخص نے مخالف کے جوان بیٹے کو قتل کر دیا۔ یہ کیسے ہماری آواز' ہماری مجبوری اسمبلی میں پہنچائے گا۔ ہمارے حقوق کی نگہبانی کیسے کرے گا۔ بس سبھی اہل حلقہ راجہ سلیم کو ووٹ دیں گے اور اس طرح کرسی راجہ صاحب ہی کی ملکیت رہے گی۔ سمجھے بے وقوف یا نہیں؟''

تمام ساتھیوں نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلا دیئے ''دیکھو جگو! اب یہ کام پلاننگ سے ہونا چاہیے ورنہ ناکامی کی صورت میں یہ شخص جو اپنے حقیقی بیٹے کا دشمن ہے' ہمیں کب معاف کرے گا؟ اس بار ناکامی کا مطلب ہم سب کی موت ہے۔ سب سے پہلے اس ان داتا کا پتہ چلاؤ کہ وہ کون ہے جس نے اس کی جان بچائی تھی۔ میرا مطلب ہے چھوٹے راجہ کی۔ آج سے اپنا کام شروع کر دو اور ایک مخصوص دن طے کر لو' اس دن چھوٹے راجہ کی چھٹی لکھ دو' سمجھے!'' ٹائیگر نے پلاننگ کرنی شروع کر دی۔

☆..............☆

''سر! گیلانی مارا جا چکا ہے۔ وہ آپ کا دوست تو تھا ہی مگر اس ملک کا غدار بھی تھا۔ میں نے جو اُسے سزا دی ہے' اس کی بیوی کو جو سزا دی ہے وہ تاحیات یاد رکھے گی اور کبھی اس ملک سے غداری کا تصور بھی نہ کرے گی۔'' آکاش اس وقت جنرل کے فارم پر تھا۔ جنرل اس کے سامنے تھا جبکہ شمع موجود نہ تھی۔

''آکاش بیٹا! یہ تمہارا بہت بڑا احسان ہے ہم باپ بیٹی پر! تم نے میری بیٹی کے قاتلوں سے جو انتقام لیا ہے یقیناً وہ مجھ ناتواں پر بہت بڑا بوجھ تھا۔ میری بیٹی کی بے چین روح کو قرار مل گیا ہوگا۔ اب ایک اور بوجھ میرے کندھوں سے اتار دو' میں تمہارا ممنون ہوں گا۔'' جنرل نے آکاش کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ حکم کریں جنرل صاحب!'' آکاش نے فرمانبرداری سے کہا۔

''بیٹا! میں شمع کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''کوئی لڑکا دیکھا ہے آپ نے؟ میرا مطلب ہے شادی کرنا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے' آپ کوئی لڑکا دیکھ لیں۔ شمع کی شادی بھی ہو جائے گی......''

''کوئی اور لڑکا دیکھ کر میں ایک بار پھر زندگی میں دکھی اور غمگین نہیں ہونا چاہتا۔'' جنرل کے چہرے پر دُکھ کی جھلک عود آئی تھی۔

''میں سمجھا نہیں سر!'' آکاش نے حیرت سے کہا۔

''آکاش بیٹا! میں چاہتا ہوں کہ شمع کی شادی اُس سے کروں جو اس کی عزت و جان کی حفاظت کر سکے' جو ذہنی و جسمانی طور پر مضبوط ہو' جس کے بازوؤں میں اتنی طاقت ہو کہ کوئی میری بیٹی کی طرف میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکے۔'' جنرل نے دکھی لہجہ میں کہا تو آکاش ہنس پڑا اور بولا۔

''آپ نے تو میرا مسئلہ حل کر دیا۔ آپ دکھی نہ ہوں۔ میرا ایک دوست ہے جو پہلوان ہے۔ جسمانی طور پر مضبوط بھی ہے۔ وہ شمع کو با حفاظت رکھے گا......''

آکاش نے کہا تو جنرل نے مسکراتے ہوئے آکاش سے پوچھا۔

''کیا یہ بات اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہو؟!''

وہ یک دم بوکھلا گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا' تو جنرل صاحب پھر مسکرا کر بولے:

''دیکھو آکاش بیٹا! میں چاہتا ہوں کہ جو گند صاف کرنے کا بیڑہ تم نے اٹھایا ہوا ہے' اس مقصد میں کامیاب ہو جاؤ۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ کنجر لوگ بہت عیار اور ہوشیار ہوتے ہیں ان کے وزیروں اور اعلیٰ افسران سے تعلقات ہوتے ہیں۔ یہ یقیناً تمہیں ختم کروانے کی کوشش کریں گے............''

آکاش کا موبائیل بول اٹھا۔

''ہاں کہو!'' وہ دوسری طرف سے کچھ سننے لگا اور او کے کہہ کر فون بند کر دیا۔

''آئی ایم سوری سر! آپ کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی کہ......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''کس کا فون تھا؟'' جنرل نے پوچھا۔

''یہ میرا مخبر ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ لاڈو بائی اور کاجل اس وقت پنجاب میں ہیں اور تجلّی کی پناہ میں پہنچ گئی ہیں۔ سر میں اس تجلّی بیگم سے ضرور ملنا چاہتا ہوں۔ میں اس درخت کی جڑ دیکھنا چاہتا ہوں جو گندا پانی پی پی کر شاخیں بھی گندی پیدا کرنے لگی ہے۔ اور آگے لوگوں کو سکھ کی چھاؤں دینے کی بجائے دکھوں اور غموں کی دھوپ دینا شروع کر دی۔ اپنی نوکیلی اور خاردار شاخوں سے بہنوں' بیٹیوں اور بہوؤں کے دوپٹے اڑانا شروع کر دیئے۔ اس تجلّی میڈم نے بہت سی عزتوں کو نیلام کیا ہے سر! بہت سے باعزت سروں کو ننگا کیا ہے۔ میں اس کی جان لے کر ہی کوئی آپ سے وعدہ کروں گا۔ اگر اس کام میں بچ گیا تو ضرور آپ کی قدم بوسی کے لیے آؤں گا۔ اگر زندگی نے وفا نہ کی تو کسی اچھے لڑکے سے شمع کی شادی کر دیجیے گا سر!''

وہ جانے لگا تو جنرل نے اُسے روک لیا۔ ''پنجاب جانے سے پہلے مجھ سے مل کر جانا۔''

''جی سر!'' یہ کہہ کر وہ باہر نکلا تو شمع باہر کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے جھلملا رہی تھیں۔

''آئی ایم سوری شمع! میں اس کام کو ادھورا نہیں چھوڑ سکتا اور تمہیں کوئی دکھ تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری لاش پر تم تو ماتم کرو ہی اور جنرل صاحب تم پر اور تمہاری قسمت پر روتے ہوئے باقی ماندہ زندگی گزاریں......''

''دیکھو آکاش! یہ شمع تمہاری لو سے ہی جلتی ہے اور تمہارے پیار میں پگھل رہی ہے۔ تم بن زندگی کا تصور ناممکن ہے۔ کیسے بھی حالات ہوں میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی اور نہ اکیلی زندگی گزار سکتی ہوں۔ تمہارے نام سے اپنا نام جوڑ لیا ہے میں نے' اب موت ہی اس ڈوری کو توڑ سکتی ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہی جاؤں گی بس کہہ دیا نا!''

''لیکن شمع میں کوئی شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے یا فلم دیکھنے نہیں جا رہا' جو تم ضد کر رہی ہو۔ پلیز بات کو سمجھو! یہ انتہائی کٹھن کام ہے۔''

''اس کٹھن کام میں تم اکیلے ہو' میں یہ نہیں کر سکتی۔''

''تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے تم میری......!''

''تمہاری بیوی ہی بنوں گی' اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ سمجھے!'' شمع نے اس کی بات کاٹی۔

''اچھا! اس وقت میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میں جا رہا ہوں اور مجھے ماسی جانو سے بھی ملاقات ضرور کرنی ہے۔ وہ میرے مشن کی راہ میں سیدھا راستہ دکھانے میں مدد کر سکتی ہے۔ یہ میرا پختہ یقین ہے۔'' وہ جانے لگا تو شمع نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اگر اکیلے گئے تو میری لاش سے گزر کر جاؤ گے۔ بس یہ لاسٹ وارننگ ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اندر چلی گئی اور آکاش چھت کو گھورتا ہوا فارم کے گیراج میں آ کر اپنی گاڑی میں بیٹھا اور گھر کی طرف چل دیا۔

وہ شمع کی طرف سے پریشان تھا۔ وہ اُسے ساتھ لے کر جائے تو پتہ نہیں کتنی اُلجھنیں' کتنے مسائل منہ کھولے اس کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ اگر نہ لے کر جائے تو وہ سرپھری لڑکی نجانے کیا کر لے۔ خیر دیکھا جائے گا۔ پہلے ماسی سے تو مل لیں۔ وہ انہی سوچوں میں غرق گھر پہنچ گیا تھا۔

خلافِ توقع گھر کا دروازہ کھلا دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ وہ پریشان بھی ہو گیا تھا۔ کہیں گوپال کے آدمی یا کوئی اور نئی ٹینشن نہ پیدا ہو گئی ہو۔ وہ چوری چھپے دبے پاؤں گھر میں داخل ہوا تو ایک کمرے میں ماسی اور ایس پی اختر حسین کو بیٹھے باتیں کرتا دیکھ کر وہ پردے کی اوٹ میں چھپ گیا اور ان کی باتیں سننے لگا۔

''دیکھو' اختر حسین' میں نے تمہیں اس دن بھی کہا تھا کہ میری پرسکون زندگی میں بے سکونی کی فضا مت پیدا کرنا ورنہ میری زبان جب کھلے گی تو تم جیسے کئی افسران کی دوڑیں لگ جائیں گی۔'' ماسی نے غصہ سے کہا تو اختر حسین ڈھیٹ ہنسی ہنس کر بولا۔

''دیکھو صنم بائی......''

صنم بائی کا لفظ سن کر آکاش کو جھٹکا لگا۔ ماسی جانو اور صنم بائی؟ کیا ماسی بھی اسی کوٹھے کی پیداوار ہے؟ اسی گندگی کے ڈھیر کا ایک گندا کیڑا ہے۔ اوہ مائی گاڈ!''

''صنم بائی! میرا کوئی مشغلہ نہیں ہے کہ پرانی طوائفوں سے جا کر ملوں اور ان کے حالات جانوں۔ میں ایس پی پولیس ہوں۔ کوئی مصنف نہیں اور نہ کوئی جرنلسٹ ہوں کہ تمام طوائفوں پر کتاب لکھوں۔ ساری جوانی کوٹھے پر گزار کر اب بڑھاپا حاجن بن کر

گزار رہی ہو۔ مجھے اس سے بھی کوئی سروکار نہیں ہے۔ میں صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ اگر وہ حرامی پلا تمہیں ملے تو اس سے کہہ دینا کہ اختر حسین ایک شعلے کا نام ہے جو پل میں ہر چیز جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔ پچیس لاکھ روپے لے کر میرے گھر پہنچ جائے ورنہ کل کو تمہاری لاش پر روتا پھرے گا۔ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے ہی آکاش بھی دبے پاؤں چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ اختر حسین گلی میں پیدل ہی جا رہا تھا۔ مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ سردی کی وجہ سے لوگ اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ آکاش بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ سڑک پر آ کر اس نے دیکھا کہ اختر حسین اپنی پرائیویٹ کار میں بیٹھ رہا تھا۔ اس نے پیچھے سے آواز لگائی ''سر! سر! رُکیے سر پلیز!'' وہ بھاگ کر اس کی گاڑی تک پہنچ گیا اور فرنٹ کا دروازہ کھول کر اختر حسین کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اس نے حیرانی سے آکاش کی طرف دیکھا اور مسکرا پڑا۔ ''بڑی لمبی عمر ہے تمہاری آکاش! میں ابھی ابھی تمہارے گھر سے آ رہا ہوں۔ ماں جی نے بتایا کہ تم کہیں گئے ہوئے ہو۔ خیر اب تم سے ملاقات ہو گئی ہے۔ وہ میرے بل کا کیا ہوا' کیا پاس ہو جائے گا؟'' اس نے ہاتھ پر کھجلی کرتے ہوئے کہا۔

آکاش کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس نے اختر حسین کی طرف دیکھ کر کہا کہ ''ہاں! آج تمہارا بل پاس ہو گیا ہے اور رقم ساحل سمندر پر میرے آدمی لے کر گئے ہیں وہیں چلنا ہو گا۔ چلیں۔''

''ہاں ہاں! کیوں نہیں؟ کیوں نہیں!'' اس نے گاڑی پہلے گیئر میں ڈالی اور سڑک پر دوڑا دی۔ ''آکاش صاحب! میں نے بہت رسک لے کر یہ کام کیا ہے۔ ابھی تک انکوائری چل رہی ہے مجھے ڈر ہے کہیں میرا نام نہ آ جائے۔ یہ بات آپ علی شیر کو اچھی طرح سے سمجھا دیں۔ اگر میرا نام آیا تو وہ بھی نہیں بچے گا۔'' اختر حسین نے گاڑی کی سپیڈ بڑھا دی اور سمندر کی طرف جانے والی سڑک پر موڑتے ہوئے کہا۔

''تم نے یہ کام رسک لے کر نہیں پچیس لاکھ لے کر کیا ہے۔ تم پولیس والے تو ایسے ہو کہ اگر کوئی تمہیں پچیس روپے بھی دے دے تو تم بڑے سے بڑا کیس منٹوں میں نپٹا دیتے ہو۔ یہاں تو معاملہ پچیس لاکھ کا تھا۔ آخر تمہاری زندگی بھی سنور جائے گی......'' آکاش نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس محکمے میں اگر یہ سب نہ ہو تو یہ محکمہ حاجیوں کا گھر کہلانے لگے' مگر مجبوری یہ ہے کہ ہمیں بھی ملازمت حاصل کرنے کے لیے لاکھوں دینے پڑتے ہیں۔ تب جا کر اچھی پوسٹ ملتی ہے اور پھر دیا ہوا روپیہ بھی تو پورا کرنا ہوتا ہے نا۔ یہ سب کچھ تم جیسے اچھے آدمی کی بدولت ہوتا ہے۔'' وہ ساحل پر پہنچ گئے تھے۔ اِکا دُکا لوگ سڑک پر گاڑیاں کھڑی کر کے سمندر کی ٹھٹھری ہواؤں کا نظارہ کر رہے تھے۔ لہریں ساحل کی ریت سے ٹکرا کر واپس جا رہی تھیں۔ سردی کی وجہ سے رش بہت کم تھا بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ آکاش نے گاڑی ایک ویران جگہ پر رکوائی اور اختر حسین سے بولا' ''باہر نکل آؤ! میرے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے سمندر کی طرف چلے آؤ۔''

یہ کہہ کر وہ باہر نکل آیا اور سڑک سے اُتر کر ریت میں چلنا شروع کر دیا۔ گیلی ریت پر اس کی ان گنت نشانوں پر نظر پڑی جو لوگوں کے پاؤں کے نشان تھے۔ اس نے مڑ کر دیکھا اختر حسین بھاگتا آ رہا تھا۔ آکاش کے ساتھ مل گیا اور اپنی سانس درست کرتے ہوئے بولا۔

''اتنی سردی میں یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم رقم میرے گھر پہنچا سکتے تھے۔ دیکھو آکاش' میرے ساتھ کوئی چالاکی کرنے کی کوشش نہ کرنا۔'' وہ تھوڑا سا خوفزدہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے خدشے کا اظہار کر دیا تو آکاش مسکرانے لگا۔

''اختر حسین! دولت کمانے کے لیے لوگ سمندر کی تہہ میں چلے جاتے ہیں۔ تم تو ابھی اوپر ہی ہو اور ابھی ریت پر چل رہے ہو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں تمہاری رقم یہاں اس لیے دے رہا ہوں کہ میں بھی لوگوں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ بس تمہیں میرے دو تین سوالوں کے جواب دینے ہوں گے۔ فی سوال ایک لاکھ روپے دوں گا۔ بولو منظور ہے؟''

''م' مگر کیسے سوال؟'' اختر حسین نے گھبرا کر پوچھا۔

وہ اب پانی میں پہنچ چکے تھے۔ اختر حسین نے آگے جانے سے انکار کر دیا تو آکاش نے کہا:

''ٹھیک ہے یہیں کھڑے ہو کر بات کر لیتے ہیں۔ بولو سودا منظور ہے یا نہیں؟''

''کیسے سوال؟''

"تم صرف جواب دو گے۔سوال میں کروں گا۔فی سوال ایک لاکھ روپے۔ہاں یا نہ۔"

"پیسوں کی کیا گارنٹی ہے۔ابھی تک تو تم نے پہلے پیسے بھی نہیں دیئے۔" اختر حسین ڈرا ہوا لگ رہا تھا۔

"بدمعاش اور پولیس ایک دوسرے کو کامیاب کرنے کے لیے چور سپاہی کا کھیل کھیلتے ہیں۔اختر حسین اگر ایک دوسرے پر اعتماد نہ کریں تو دونوں محکمے کبھی چل نہیں سکتے۔"

"ٹھیک ہے'بولو۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی راضی ہوگیا۔

"ماسی جانو کون ہے؟" آکاش نے پہلا بم گرایا تو اختر حسین کے جسم میں ٹھنڈی لہر نے کپکپی دوڑا دی۔

"کون ماسی جانو؟ میں کسی ایسی عورت کو نہیں جانتا جس کا نام ماسی واسی ہو۔کام کی بات کرو۔" وہ ڈر گیا تھا اور اس وقت کو کوس رہا تھا جب آکاش کی بات مان کر ساحل سمندر پر چلا آیا۔

"ایک لاکھ روپے فی سوال دے رہا ہوں۔میرا حق بنتا ہے کہ کوئی بھی سوال کروں۔تم صرف جواب دو گے بس!" آکاش فی الحال دھیمے لہجے میں بات کر رہا تھا۔

"وہ ایک طوائف تھی۔"

"تمہیں کیسے پتہ؟اور تم کیسے اتنے یقین سے کہہ سکتے ہو؟"

"میں انہی طوائفوں کے بازار میں پل کر جوان ہوا ہوں اور یہ بات ہنڈرڈ پرسنٹ کنفرم ہے کہ آج کی تمہاری ماسی جانو کل کی طوائف صنم ہے۔"

"تم نے اس عورت کا راز افشاء کر دیا ہے'جو گزشتہ پندرہ بیس سالوں سے شرافت کی زندگی گزار رہی ہے۔کیا اس بات پر ہمیں شکرگزار نہیں ہونا چاہیے کہ ایک طوائف کوٹھا چھوڑ کر شرافت کی زندگی گزارے اور آئندہ آنے والی نسلیں صاف ستھرے ماحول میں زندگی گزار کر معاشرے کے باوقار شہری بن سکیں۔بس یہی خرابی ہے ہمارے سسٹم میں اختر حسین کہ ہم کسی کو کھاتا نہیں دیکھ سکتے اور کسی بھوکے کو کھانا نہیں دے سکتے۔"

اس نے جیب سے ریوالور نکالا اور اس پر سائلنسر لگانے لگا۔اختر حسین کی آنکھیں

پھٹ گئیں۔وہ خوف سے کانپنے لگا۔آکاش نے ریوالور اس کے دل پر رکھ دیا اور ٹریگر پر انگلی رکھ دی۔

"کیا مطلب؟ یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"میں آج کل اُس بازار سے اٹھنے والا تعفن اور بدبُو صاف کر رہا ہوں۔تم بھی اسی بازار کی پیداوار ہو اور پولیس کے محکمہ میں تم جیسے غداروں اور رشوت خوروں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔لہٰذا آکاش کی عدالت تمہیں دفعہ لگائے بغیر سزائے موت سناتی ہے۔" گولی اختر حسین کے دل میں گھُس گئی۔اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور حیرت زدہ بھی تھیں۔آکاش اُسے پھینک کر وہاں سے چل پڑا۔

ماسی نے آکاش کو پردے کی اوٹ سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔اس نے گلی میں آ کر دیکھا' دروازے کے سامنے آکاش کی گاڑی کھڑی تھی۔اس نے جلدی سے سیف الماری سے اپنی ڈائری نکالی اور اس پر تیزی سے لکھنا شروع کر دیا۔وہ کافی دیر تک لکھتی رہی۔یہاں تک کہ ڈائری کے اوراق ختم ہوگئے۔باہر دروازے پر کسی نے بیل بجائی تو ماسی نے گھڑی کی طرف دیکھا۔رات کے 9 بج رہے تھے اور آدھی رات کا عالم لگ رہا تھا۔اس نے دروازہ کھولا تو سامنے آکاش کھڑا تھا۔ماسی نے حسب عادت مسکراتے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔آکاش خفا خفا اندر چلا آیا تو ماسی نے دروازہ بند کر کے اُس سے پوچھا۔

"کھانا لگاؤں بیٹا؟"

"ماسی! میں کون ہوں؟" اس نے اچھوتا سوال کیا تو ماسی کو حیرت کا جھٹکا لگا۔اس نے اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"تم آکاش ہو'میرے بیٹے! یہ آج کیسے سوال پوچھ رہے ہو؟" ماسی کی آواز میں ڈر تھا۔

"آپ کون ہیں؟" ماسی پر بجلی سی گر گئی۔

"میں تمہاری ماسی ہوں اور ماسی ماں جیسی ہوتی ہے۔"

"کیا طوائف بھی ماں ہوتی ہے؟" آکاش کے اس سوال نے ماسی کو چکرا دیا۔

کیا مطلب؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ کھل کر بات کرو!"

''آپ جانتی ہیں' میں کیا کہنا چاہتا ہوں اور میری بات کا مقصد کیا ہے؟'' اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ اس نے ریوالور جیب سے نکال کر ٹیبل پر پڑی ہوئی ڈائری پر رکھ دیا۔

''ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔ چاہے طوائف زادی ہو یا شریف زادی۔'' ماسی نے جواب دیا۔

''اتنی بڑی حقیقت اِتنے بڑے جھوٹ میں چھپا کر رکھی آپ نے بیس سال تک۔ بیس سال تک ہمیں یہ ہی پتہ نہ تھا کہ ہماری ماں کون ہے۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ماں کیسی ہوتی ہے۔ بس یہی پتہ تھا کہ ماں تم جیسی ہوتی ہے لیکن میری پہچان' میرا نام کسی طوائف سے جڑا ہوا ہے۔''

''آپ نے بہت بڑا ظلم کیا ہے مجھ پر......''

''دیکھو آکاش! میں اپنی صفائی میں کچھ زیادہ نہیں کہنا چاہتی مگر اتنا ضرور کہوں گی۔ جس دن تم میری گود میں آئے تھے' تمہارے باپ نے جس کا نام ملک رب نواز تھا......'' آکاش حیرت سے ماسی کی طرف دیکھنے لگا۔ اور بڑبڑایا۔ ''ملک رب نواز! میرا باپ......؟؟!''

''ہاں تمہارا باپ' ملک رب نواز جس نے تمہیں میری گود میں ڈالا تھا تو یہ وعدہ لیا تھا کہ میں تمہاری حفاظت کروں۔ تمہاری اچھی پرورش کروں اور تمہیں ایک سلجھا ہوا باوقار شہری بناؤں۔ میں مانتی ہوں کہ میں یہ سب کچھ کرنے میں ناکام رہی ہوں' کیونکہ میں تمہیں بہت پیار کرتی ہوں اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ میں نے تمہاری پرورش اور اچھی دیکھ بھال کی خاطر اپنی کوکھ سے اولاد پیدا نہیں کی۔ صرف اس لیے کہ کل کو میرا گزرا ہوا کل اگر میری اولاد کے سامنے آ گیا تو وہ مجھے طوائف سمجھ کر ٹھکرا نہ دے۔'' یہ کہتے ہی ماسی رونے لگی۔

''میں نے اسی بناء پر اپنی کوکھ سونی رکھی کہ کہیں میری اولاد مجھے طوائف سمجھ کر قبول کرنے سے انکار نہ کر دے۔ میں تم لوگوں کی پرورش میں لگ گئی۔ تمہیں پیار اور لاڈ سے پالا۔

نواب حشمت جو کہ میرے شوہر تھے' انہوں نے مجھے اتنا پیار دیا کہ میں اپنی بیتی ہوئی تلخ زندگی بھول گئی۔ مگر آج اختر حسین نے میرا ماضی جگا کر مجھے یاد دلایا کہ طوائف چاہے کتنی ہی شریف ہو جائے' یہ معاشرہ اُسے قبول نہیں کرتا اور آج تم نے بھی یہ کہہ دیا کہ میں طوائف ہوں' تمہاری ماں نہیں۔ اسی دن کے لیے میں اپنی کوکھ سے ماں نہ بنی تھی۔'' یہ کہہ کر ماسی نے ریوالور اٹھایا اور اس سے پہلے کہ آکاش کچھ سمجھتا یا اُسے روکتا اس نے اپنی کنپٹی پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ گولی نے ماسی کو تڑپنے کا موقع نہ دیا۔ وہ دھڑام سے کٹے ہوئے شہتیر کی طرح آکاش کی بانہوں میں گر گئی۔ آکاش کی چیخ نے سارا محلّہ اکٹھا کر لیا۔ گروپ کے تمام لڑکے بھی جمع ہو گئے جب انہوں نے خون میں لت پت ماسی کی لاش دیکھی تو وہ بھی اونچی اونچی آواز میں رونے لگے۔ لالہ' راجو' مانی دیکھو' دیکھو! یہ ایک بار پھر مجھے یتیم کر گئی ہے!'' آکاش رو رہا تھا اور ماسی کو تھامے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس کی گود میں پُرسکون نیند سو گئی تھی۔

''ایک بار' صرف ایک بار آنکھیں کھول! مجھے آواز دے ماسی! مجھے آواز دے۔ میں اب کبھی لیٹ نہیں آؤں گا۔ جلدی جلدی گھر آیا کروں گا۔ اب تجھے میری خاطر راتوں کو نہیں جاگنا پڑے گا۔ اے اے ماں' اٹھ نا! ایک بار صرف ایک بار اٹھ' دیکھ دیکھ تیرے بیٹے آئے ہیں۔ آنکھیں کھول۔ آنکھیں کھول نا۔ کیوں چلی گئی ہے۔ مجھے چھوڑ کر؟ کون ہے میرا؟ کون ہے؟ کس کو ماں کہوں؟ یہ تو بتاتی جا! اے ماسی! آنکھیں کھول۔'' اُس کے دوست خود بھی زار و قطار رو رہے تھے۔

انہیں دلاسہ دینے والا کوئی نہ تھا۔ محلّہ دار پہلے ہی ان کے خلاف تھے۔ مگر پھر بھی امام مسجد آگے بڑھے اور آکاش کو دلاسا دیا۔ پھر دیکھا دیکھی دوسرے لوگ آگے بڑھ کر انہیں سہارا دینے لگے۔

☆..................☆

ملہوترہ' میڈم تجلی' لاڈو بائی اور کاجل اس وقت ہوٹل کے روم میں پریشانی کی حالت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ملہوترہ کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا اور کبھی ایزی چیئر پر بیٹھ کر

سگریٹ سلگا لیتا۔ سبھی لوگ اس طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔ دفعتاً میڈم تجلی کے موبائیل کی گھنٹی بول پڑی۔ اس نے تیزی سے فون کان سے لگایا اور لیس کہہ کر بولنا شروع کر دیا۔

"تمہید مت باندھنا اور ایک ہی سانس میں تمام باتیں اور صورت حال کہہ ڈالو۔ تمہارا حصہ تمہیں مل جائے گا۔" وہ کافی دیر دوسری طرف کی باتیں سنتی رہی اور کچھ سوال بھی کرتی رہی۔ تقریباً دس منٹ بعد اس نے موبائیل بند کر کے کہا۔

"اب آئے گا اونٹ پہاڑ کے نیچے!"

"کیا ہوا میڈم! ہمیں بھی بتاؤ۔" لاڈو بولی۔

"اس حرامزادے آکاش نے گوپال کے تمام گروپ کو ختم کر دیا ہے۔ ایس پی اختر حسین کی لاش بھی ساحل سمندر سے ملی ہے اور وہ جس عورت کے پاس رہتا تھا' اس نے خودکشی کر لی ہے۔ کراچی میں لاشوں کا مینا بازار لگانے کے بعد وہ حرامی پلا اب لاہور آ رہا ہے۔ میڈم تجلی سے الجھنے' گیدڑ کی موت اُسے شہر کی طرف لا رہی ہے۔"

"ملہوترہ! اپنے آدمی' ایئر پورٹ' ریلوے اسٹیشن اور بس سٹاپوں پر لگا دو۔ اس حرامزادے کو لاہور کی آب و ہوا راس نہیں آنی چاہیے' ورنہ وہ ہم سب کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔"

"مگر میڈم! ہمارے آدمی اُسے پہچانیں گے کیسے؟" ملہوترہ نے پہلی بار زبان کھولی تو میڈم مسکرا کر بولی۔

"میرا نام تجلی ہے' تجلی بیگم! وہ اگر شاطر ہے تو میں بھی اُس کی ماں ہوں۔ چالاکی اور ہوشیاری میں میرا کوئی جوڑ نہیں۔" تجلی بیگم محاورتاً خود کو آکاش کی ماں کہہ رہی تھی۔

ابھی یہ باتیں جاری تھیں کہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز پر سبھی چونک پڑے۔

"کون ہے؟" کاجل نے پوچھا تو باہر سے آواز آئی۔

"میڈم! کراچی سے آپ کے لیے فیکس آیا ہے۔"

تجلی بیگم نے لاڈو کو اشارہ کیا تو اس نے دروازہ کھول کر ویٹر سے ایک سفید لفافہ لے لیا۔ میڈم نے لفافہ کھولا تو اس میں سے ایک ہینڈسم اور نوجوان لڑکے کی تصویر برآمد ہوئی۔

"تو تم ہو بیٹا جس نے میڈم تجلی کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں؟"

اُس نے تصویر ملہوترہ کو دیتے ہوئے کہا۔ "اس کی ارجنٹ پرنٹنگ کرواؤ اور اپنے تمام ساتھیوں کو ایک ایک تصویر دے کر اس آدمی کو فوراً قتل کرنے کی ہدایت کرو۔ اس کا زندہ رہنا ہم سب کی صحت کے لیے ٹھیک نہ ہوگا۔"

کاجل اور لاڈو نے بھی تصویر کو ایک نظر دیکھا۔ اس میں آکاش ایک ہوٹل سے نکل رہا تھا۔ کافی کلوز سے لیا گیا پوز تھا۔

"اس کُتے کی زبان کاٹوں گا۔ اس کے بعد اس کے ٹکڑے کرنے سے پہلے اس کے گلے میں پٹہ ڈال کر شہر بھر کی گلیوں میں گھماؤں گا اور جو بھی اس کی حالت پر ترس کھائے گا اس کا بھی کریا کرم مجھے ہی کرنا پڑے گا۔" ملہوترہ نے تصویر پکڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور باہر نکل گیا۔

"ممی! اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ایک دو ٹکے کا غنڈہ ہمارا دھندہ بند کرواتا ہے' ہمیں شہر بدر کرتا ہے اور ہم یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ مما! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں یہاں قید نہیں رہ سکتی۔ پلیز کچھ کرو مما! جلدی سے۔" کاجل غصہ سے چلا رہی تھی۔

"دیکھو بیٹی! ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے ہیں۔ ابھی اس شہر کے تمام غنڈے کتوں کی طرح اس کے پیچھے لگ جائیں گے اور تم دیکھنا اس کی لاش یہاں تمہارے قدموں میں پڑی ہوگی۔ بس تب تک تمہیں اور لاڈو کو اس کمرے سے نہیں نکلنا چاہیے کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ چاندنی' طماس یا راجہ سلیم تمہیں دیکھے۔ تم سمجھ رہی ہو نا بات کو؟"

میڈم تجلی نے بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"لاڈو! میری بیٹی کا خیال رکھنا!" یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گئی۔

☆..........☆

آکاش کراچی سے روانہ ہو چکا تھا۔ اب تو ماسی کے مر جانے کے بعد اس کے جسم میں اور بھی پھرتی آ گئی تھی۔ وہ اس گروہ کے سرغنہ کو ختم کر کے قصہ پاک کرنا چاہتا تھا۔ وہ اکیلا ہی آیا تھا۔ جنرل اور شمع نے ماسی کی وفات پر گہرے دکھ کا اظہار کیا تھا۔ شمع نے

بہت اصرار کیا تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ ہی جائے گی۔ مگر آکاش نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ ضرور لوٹ کر آئے گا۔ اور وہ ایک نئی دنیا بسائیں گے۔ جنرل نے لاہور کے بینکوں کی فہرست اور اپنے اکاؤنٹ نمبر اور چیک بکس وغیرہ پر اپنے دستخط کر کے آکاش کو دیئے تھے۔ جتنا بھی روپیہ اس کام پر خرچ ہو' تم بے دریغ خرچ کرنا۔ روپے کی کمی تمہیں محسوس نہ ہو گی۔ تمام دوست بھی حیران اور پریشان تھے کہ آکاش انہیں چھوڑ کر جا رہا تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ وہ اکیلا ہی یہاں کے حالات دیکھ کر کوئی فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو خود بے آسرا تھا۔ دوسروں کو ان کے والدین سے دور رکھ کر اس کام میں ضائع کر کے ان کی بد دعائیں نہیں لینا چاہتا تھا۔ ماسی کی وفات نے اسے ہلکان کر دیا تھا۔ زندگی کا بہت بڑا سہارا چھن گیا تھا۔ بہت جلدی کی ماسی نے۔ مجھے بتا تو دیتی کہ میں کون ہوں' کیا ہوں' کہاں سے آیا اور ماسی کے پاس کیسے پہنچ گیا۔ اس نے میز پر بکھرا سامان اور اپنی ضرورت کی چیزیں سمیٹ کر بیگ میں ڈالی تھیں۔ وہ ریوالور بھی تھا جس سے اُس کی ماں جیسی ماسی مر گئی تھی۔ وہ کراچی سے لاہور آ رہا تھا۔ ایک نیک کام کے لیئے' اس شہر سے گند صاف کرنے کے لیئے' کیا وہ ایسا کر سکے گا۔ اکیلا تو نہیں کر سکتا۔ ایک ساتھی کی ضرورت محسوس ہو گی۔ لہٰذا اس نے جونیئر کو کہہ دیا تھا کہ وہ اس کے فون کا انتظار کرے۔ جونیئر چونکہ لاہور کا رہنے والا تھا' اسی لیے اس کا انتخاب کیا گیا تھا۔ ٹرین دنیا پور کے اسٹیشن پر رُکی تو اس نے ایک کپ چائے کی طلب محسوس کی۔

وہ پلیٹ فارم پر چائے پینے کے لیے اُترا۔ چائے پی ہی رہا تھا کہ ٹرین نے چلنے کا وِسل بجا دیا۔ اس نے کپ کاؤنٹر پر رکھا اور چلتی ہوئی ٹرین میں بھاگ کر سوار ہو گیا۔ ٹرین جب لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچی تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ اندھیرا پھیلنے کے لیے مچل رہا تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر بہت زیادہ رش تھا۔ موسم بھی ابر آلود ہو رہا تھا۔ کہیں کہیں بادل چمک گرج رہے تھے۔ لگتا تھا کہ ابھی بارش شروع ہو جائے گی۔ آکاش پہلے بھی کئی مرتبہ لاہور آ چکا تھا۔ آوارہ گردی کے دور میں اس نے پورے پاکستان کی سیر کر لی تھی۔ لاہور شہر اس کے لیے نیا نہ تھا مگر کچھ علاقے ابھی تک وہ جانتا بھی نہ تھا۔ کہیں بھی کوئی پرابلم ہو سکتی تھی۔ وہ ذہنی طور پر ہوشیار ہو چکا تھا اور ہر طرح کے خطرے سے نپٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ وہ پلیٹ فارم نمبر چار پر اُترا تھا۔

سیڑھیاں چڑھ کر دوسری طرف جانا تھا۔ لہٰذا وہ سڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر چلا گیا اور باہر جانے والے گیٹ پر رش ہونے کی وجہ سے وہ کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ رش تو کم نہ ہو رہا تھا۔ اس نے بھی رش میں گھسنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ رش میں گھس کر باہر نکلا تو سامنے بڑے سے برآمدے میں ایک دیوار پر محسنِ پاکستان بابائے قوم کی بڑی سی تصویر پر نگاہ پڑی تو اس نے بے اختیار ہو کر انہیں سلام کیا اور مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ہاتھوں میں بیگ پکڑے وہ ایسے چل رہا تھا جیسے یہ شہر اس کے لیے بالکل نیا ہو۔ وہ ایک ٹیکسی والے سے بات چیت کر رہا تھا۔ کسی ہوٹل میں جانے کے لیے کہ اس اثناء میں کسی فقیر نے اپنا کاسہ اس کے آگے کر دیا۔

''اللہ کے نام پر بیٹا' خدا تمہیں ہر بلا سے محفوظ رکھے!''

اس نے غور سے فقیر کی طرف دیکھا اور ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ نجانے کیوں یہ فقیر اپنا اپنا سا لگا تھا اُسے۔ اس نے سو کا نوٹ نکال کر فقیر کے کاسہ میں ڈالنا چاہا تو اچانک ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور آکاش کے کان کے قریب سے گزرتی ہوئی کار کی باڈی میں گھس گئی۔ ڈرائیور گولی کی آواز سن کر گاڑی سے نکل کر بھاگ گیا۔ دوسری گولی اور پھر تیسری گولی بھی گاڑی میں لگی تو اس نے نیچے بیٹھ کر فقیر کو بھی نیچے کھینچ لیا۔ وہ دروازہ کھول کر گاڑی میں گھسنا چاہتا تھا کہ ایک گولی فقیر کی ٹانگ کو چیرتی ہوئی نکل گئی وہ تڑپ کر وہیں بیٹھ گیا۔ آکاش نے فوراً صورت حال کو بھانپتے ہوئے فقیر کو گھسیٹتے ہوئے گاڑی میں ڈالا اور گاڑی سڑک پر دوڑا دی جبکہ ٹیکسی ڈرائیور کا دور دور تک کوئی پتہ نہ تھا۔ اس نے اپنے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے فقیر کی طرف دیکھا تو وہ آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ وہ گیئر بدلتے ہوئے بولا:

''بابا! کیسا محسوس کر رہے ہو؟ کیا درد زیادہ ہو رہا ہے؟ کسی قریبی ہسپتال میں چلتے ہیں۔'' فقیر ایک دم تڑپ کر بولا:

''یہ ظلم مت کرنا۔ پولیس تمہیں بھوکے کتوں کی طرح ڈھونڈے گی اور میری وجہ سے تم کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ سیدھے گھر چلو۔'' فقیر نے کہا تو آکاش حیرت سے بولا:

''گھر؟ کون سے گھر؟ میں تو یہاں اجنبی ہوں۔''

"اپنے گھر نہیں، میرے گھر کی طرف گاڑی موڑ دو۔ میرے زخم کی پرواہ مت کرو۔ گولی گوشت کو چھو کر گزر گئی ہے۔ سامنے سے بائیں ہاتھ اور پھر دائیں ہاتھ موڑ لینا۔"

گاڑی چلتے چلتے کچے پکے راستوں سے ہوتی ہوئی گندی بستی کی طرف مڑ گئی۔ اندھیرا کافی پھیل چکا تھا اور ہلکی ہلکی پھوار بھی ہو رہی تھی۔ فقیر نے ایک گلی کے نکڑ پر گاڑی رکوائی اور اپنا کاسہ اور آکاش کا بیگ اٹھا لیا اور باہر نکل کر اس نے آکاش سے کہا کہ اس گاڑی کو باہر سڑک پر کھڑی کر کے آ جائے۔ وہ نکڑ والا مکان میرا ہے۔ آج رات تم اِدھر ہی رہنا۔ آکاش نے فقیر کی دور اندیشی کو سراہتے ہوئے سر ہلا دیا۔ وہ فقیر کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ فقیر لنگڑا کر چل رہا تھا۔ جب وہ ایک مکان میں داخل ہونے لگا تو اس نے پیچھے مڑ کر آکاش کو ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ یہ مکان ہے اور وہ اندر داخل ہو گیا۔ آکاش نے گاڑی واپس موڑی اور تیز دوڑاتا ہوا اس بستی سے کافی دور نکل آیا۔ اس نے ٹیکسی ایک جگہ روک دی اور پاس سے گزرتی ہوئی ٹیکسی کو ہاتھ کا اشارہ دے کر روکا۔

اس نے بستی کا پتہ بتایا تو ٹیکسی والا اُسے لے کر چل پڑا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ اسی جگہ پہنچ گیا جہاں اس نے فقیر کو اتارا تھا۔ اس نے ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر فارغ کیا تو زور سے بجلی چمکی اور ساتھ ہی بارش تیز ہو گئی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے ایک نوجوان نے دروازہ کھولا۔ یہ نوجوان احمد رضا تھا۔ وہ اپنے سامنے آکاش کو کھڑا دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ بابا نے اُسے آ کر بتا دیا تھا۔ اس نے ایک طرف ہٹ کر آکاش کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ بارش میں بھیگ چکا تھا۔ اندر گیس کا چولہا جل رہا تھا۔ اُسے حدت محسوس ہوئی۔ اس نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ دو چار پائیوں کے علاوہ کچھ ٹوٹا پھوٹا سامان تھا، مگر ایک بات قابل دید تھی وہ یہ کہ اس فقیر کی کٹیا میں برتن بہت صاف ستھرے تھے۔ اس نے بابا کی ٹانگ کی طرف دیکھا تو پٹی بندھی ہوئی تھی۔ خون رُک چکا تھا۔

"آپ نے میری خاطر اپنی جان کیوں خطرے میں ڈالی بابا جی؟" آکاش نے خیر دین کے پاؤں کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ ساتھ ہی نیچے بیٹھ کر اس کا زخم دیکھنے لگا۔

"اگر گولی آپ کو کہیں اور لگ جاتی تو.........." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"جو گولی مجھے لگتی سمجھ لو کہ اس پر میرا نام لکھا ہوتا۔ کبھی کسی کی موت کسی دوسرے کو نہیں آتی، جو وقت مقرر ہو، ہر آدمی اپنے مقررہ وقت پر اس خالق مہربان کے پاس لوٹ جاتا ہے۔ یہ دنیا تو ایک سٹیج ہے، ہم سب کٹھ پتلیاں ہیں۔ ہماری ڈور اُس مہربان پروردگار کے ہاتھ میں ہے، جس پتلی کا کریکٹر ختم ہو جاتا ہے، وہ اُسے اپنے پاس بلانے کے لیے اُس کی زندگی کی ڈور توڑ دیتا ہے۔ بس اتنی سی کہانی ہے۔"

خیر دین نے کہا تو آکاش اور رضا اس کی طرف دیکھنے لگے۔ رضا بول پڑا۔

"بڑے بھائی آپ چائے پئیں گے؟"

"اتنے خلوص سے کہہ رہے ہو تو ضرور پیوں گا۔ ویسے میرا نام آکاش ہے۔ آکاش ملک!" اس نے اپنا بتایا تو خیر دین نے چونک کر کہا۔

"بیٹا! تم اس شہر کے تو نہیں لگتے؟"

"جی بابا جی! آپ نے درست پہچانا۔ میں کراچی کا رہنے والا ہوں۔ ایک بات میں بھی پوچھوں؟"

"ضرور پوچھو اور ری لیکس ہو کر بیٹھو۔ اس گھر میں تم مہمان ہو۔ آج پچیس برس بعد اس گھر میں کسی تیسرے فرد نے قدم رکھا ہے، پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"آپ انگریزی کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ آپ پڑھے لکھے لگتے ہیں، فقیر نہیں لگتے۔" آکاش نے پوچھا تو خیر دین مسکرانے لگا اور بولا۔

"یہ میرا بیٹا ہے احمد رضا! یہ ایم اے کا سٹوڈنٹ ہے۔ یہ میرے ساتھ انگلش بولتا رہتا ہے۔ بس اسی سے دو چار لفظ سیکھ لیے ہیں۔ ہم باپ بیٹا ہی بولتے رہتے ہیں۔ اب یہ چائے بن گئی ہے۔ تو کیا کہتے ہیں اسے ٹی سموکنگ یعنی کہ چائے پی جائے۔"

آکاش قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ احمد رضا اور خیر دین بھی مسکرا پڑے۔ گرما گرم چائے پیالیوں میں تیار تھی۔ وہ چائے پینے لگے۔ احمد رضا، آکاش کی طرف اور آکاش احمد رضا کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ اور خیر دین چپکے سے اُن دونوں کی طرف دیکھ لیتا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس کا پہلا بیٹا ہوتا تو وہ آکاش کے برابر ہوتا۔ آج اُسے تجلی بیگم کے لیے مضبوط بازوؤں کی ضرورت تھی۔ ایسے بازو جو تجلی بیگم کا مقابلہ کر سکیں۔ وہ اس میدان میں تنہا

تھا۔ احمد رضا تو سیدھا سادہ نوجوان تھا۔ وہ ایسے لڑائی بھڑائی کے فن سے عاری تھا۔ جبکہ آکاش لگتا تھا کہ ماہر لڑاکا بھی ہے اور دشمن دار بھی۔ کیونکہ اسٹیشن پر اترتے ہی اس پر قاتلانہ حملہ یہی بتاتا تھا کہ وہ کوئی شریف آدمی نہیں ہے۔

''احمد رضا بیٹا! تم نیچے لیٹ جاؤ۔ آج رات آکاش پتر کو اس چار پائی پر لیٹنے دو۔ باہر سردی بھی کافی ہے اور بارش بھی ہو رہی ہے۔ صبح تم نے کالج بھی جانا ہے۔ آکاش پتر! آپ لیٹ جاؤ اور بالکل پُرسکون ہو کر سو جاؤ۔ تمہارا کوئی بھی دشمن اس گھر کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔''

''بڑے بھائی! آپ کوئی ٹینشن یا پریشانی تو نہیں محسوس کر رہے۔ بالکل ری لیکس ہو جائیں کیونکہ اس گھر میں عرصہ بعد کوئی تیسرا فرد آیا ہے۔ اس گھر کی دیواریں بھی آپ کو دیکھ کر خوش ہو رہی ہیں۔'' پہلے خیر دین نے اور پھر احمد رضا نے اسے الفاظ میں عزت بخشی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس فقیر کے جھونپڑے میں دولت تو نہیں مگر ہمیشہ رہنے والی دولت ضرور تھی جو کہ عزت نفس تھی۔ وہ آکاش کے آنے سے کتنے خوش تھے۔ وہ بیان نہیں کر سکتے تھے۔ آکاش پرسکون ہو گیا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ رضا نے زمین پر بستر بچھایا اور وہ ایزی ہو کر وہیں لیٹ گیا تھا۔ اس نے چار پائی چھوڑی اور نیچے رضا کے بستر پر اس کے ساتھ لیٹ گیا۔ رضا اٹھ کر بیٹھ گیا اور خیر دین نے بھی حیرت سے آکاش کی یہ حرکت دیکھی، تو آکاش بول پڑا۔

''آپ پریشان نہ ہوں، میں کوئی راجہ یا سیٹھ نہیں ہوں۔ بس سمجھیں تو آپ ہی کا خون ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ میں بھی آپ جیسا ہی ہوں۔ آپ پلیز! مجھے مت روکیں اور تم بھی احمد رضا! ایک طرف تو بھائی کہتے ہو اور دوسری طرف مجھے اپنے ساتھ لیٹنے بھی نہیں دیتے۔ آ جاؤ یار، سردی لگ رہی ہے۔'' اس نے احمد رضا کو کھینچ کر رضائی میں لپیٹ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

رات بارش نے اچھی طرح جل تھل کر دیا تھا۔ جگہ جگہ گندا پانی کھڑا ہو گیا تھا۔ بستی کی نالیاں اُبل رہی تھیں۔ بادل ابھی تک چھائے ہوئے تھے اور لگتا تھا کہ آسمان ایک بار پھر بادلوں کو برسنے کے لیے کہے گا۔ اگلی صبح خیر دین سب سے پہلے اٹھا۔ اس نے رضا کو بھی جگایا جبکہ آکاش بے سدھ سو رہا تھا۔ وہ کافی دنوں کی تھکان کے بعد پرسکون

نیند سویا تھا۔ خیر دین نے احمد رضا کو کچھ روپے دیئے اور ناشتہ لانے کو کہا۔ گھر میں مہمان آیا ہوا تھا۔ وہ ان کی طرح چائے اور رس تو نہ کھا سکتا تھا۔ رضا کچھ دیر بعد ہی ناشتہ لے کر آ گیا۔ حلوہ پوری نے کمرے میں عجیب سی خوشبو پھیلا دی تھی۔ آکاش بھی جاگ گیا تھا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ خیر دین تکلف میں پڑ گیا ہے، لیکن وہ کچھ نہ بولا۔ اس نے ناشتہ کیا اور کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ خیر دین بول پڑا:

''اس گھر میں تکلف بالکل نہیں چلتا۔ یہ پرخلوص لوگوں کا گھر ہے۔ جب تک جی چاہے یہاں رہو، اپنا کام تسلی سے کرو۔ کسی قسم کی فکر نہ کرنا۔ اگر باہر جانا چاہو تو ایک چابی ساتھ لے جانا۔ تاکہ اگر جلدی واپس آ جاؤ تو ہمارا انتظار نہ کرنا پڑے۔''

''بابا! آپ آج دھندے سے چھٹی کر لیں۔ کچھ دیر آرام بھی ہو جائے گا۔'' رضا نے کہا تو خیر دین بولا۔ ''بیٹا اگر دھندے پر نہ گیا تو ساتھی فقیر کل کے واقعے کی تحقیق کے لیے اور میری خبر گیری کے لیے یہاں تک آ جائیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ آکاش کا کسی کو پتہ چلے کہ وہ یہاں ہے۔''

''بات معقول ہے۔ آپ جائیں۔ میں کچھ دن یہیں رُک جاتا ہوں۔ حالانکہ میرے پاس کافی جگہیں ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ محفوظ جگہ ہے۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو!'' آکاش نے کہا تو رضا بولا۔

''بڑے بھائی تو بن گئے ہو مگر تکلف نہیں گیا تم سے۔ بابا نے کہا ہے نا کہ جب تک جی چاہے یہاں رہو، یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔''

آکاش نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ''شکریہ چھوٹے بھائی!'' کہا تو رضا مسکرا پڑا۔

''یہ لو ایک چابی۔'' خیر دین نے تالے کی ایک چابی آکاش کو دے دی اور باہر نکل گیا۔

رضا نے بھی اپنی کتابیں اٹھائیں اور جانے لگا تو بولا:

''اوکے بڑے بھائی! پھر سیکنڈ ٹائم ملتے ہیں۔ اپنا خیال رکھیے گا۔'' اس نے آکاش سے ہاتھ ملایا اور باہر نکل گیا۔ آکاش نے اندر سے کنڈی لگا لی اور چار پائی پر بیٹھ کر ان لوگوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ کتنا خلوص تھا ان فقیر باپ بیٹے میں۔

دراصل پنجاب کا پانی انتہائی پرخلوص ہے۔اس میں سے اجنبی لوگوں کو بھی اپنائیت کی خوشبو آتی ہے اور پینے والا پنجابیوں کا گرویدہ ہوجاتا ہے۔

تجلی بیگم کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ گروہ یقیناً انتہائی طاقت ور ہے جس نے آتے ہی آکاش کا خیرمقدم گولیوں سے کیا تھا۔اس میڈم کا تیاپانچہ کرنا پڑے گا۔اس نے بیگ میں سے اپنے کپڑے نکالے اور بدل کر باہر چلا گیا۔اس نے باہر سے تالا لگا کر چابی کوٹ کی جیب میں ڈالی۔ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اُسے سردی کا احساس دلا کر گزر گیا۔اس نے رین کوٹ کے کالر اوپر کانوں تک چڑھائے اور مفلر سے اپنا چہرہ لپیٹ لیا۔اب کوئی اُسے نہ پہچان سکتا تھا۔وہ گلیوں میں گندے پانی سے بچتا ہوا باہر سڑک پر آگیا۔اس نے باہر آکر ایک بک سٹال سے اخبار خریدا۔اس میں ایس پی اختر حسین اور ماسی جانو کی موت کی خبریں چھپی ہوئی تھیں۔اخبار چونکہ پنجاب سے شائع ہوا تھا اسی لیے سندھ کی خبر مختصر تھی کیونکہ مقامی خبریں بہت زیادہ تھیں۔اس نے اخبار تہہ کر کے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا۔

وہ اب کیسے ان لوگوں کو ڈھونڈے۔اگر وہ ہیرامنڈی میں جا کر اُن لوگوں کا پتہ چلائے تو خود ہی اپنی موت مارا جائے گا' مگر کیا کرنا چاہیے۔وہ چلتا ہوا شہر جانے والی سڑک پر آگیا۔اس نے ایک رکشتہ کو ہاتھ کے اشارے سے روکا۔اس میں سوار ہوکر شہر جانے کا کہا۔وہ اردگرد نظریں دوڑا رہا تھا' جیسے ذہن نشین کرنا چاہتا ہو کہ واپسی پر کوئی مسئلہ نہ ہو۔

گورنمنٹ کالج کے سامنے جا کر رکشہ رُک گیا۔اس نے پوچھا تو ڈرائیور نے بتایا کہ تیل ختم ہوگیا ہے آپ کو اب تھوڑی دور پیدل جانا ہوگا۔اس نے ڈرائیور کو کرایہ دینے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو ریوالور ہاتھ کو چھو گیا۔اس نے دوسری جیب سے کرایہ نکال کر ڈرائیور کو دیا۔وہ پیدل ہی شہر کی جانب چلنے لگا۔کالج کے مین گیٹ سے گزرتے ہوئے بے ساختہ اس کی نظریں اٹھ گئیں۔اس نے دیکھا کہ احمد رضا کسی لڑکے سے باتیں کر رہا تھا۔وہ دیکھ کر خوش ہوگیا اور حیران بھی کیونکہ یہ شہر کا مشہور کالج

تھا اور مہنگا بھی لگ رہا تھا۔وہ کھڑا ہوکر اُسے دیکھنے لگا کہ اس کے پاس سے تین غنڈہ ٹائپ لوگ گزرے جو آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔آکاش کے کانوں میں یہ الفاظ پڑے۔ان تینوں میں سے ایک دوسروں کو کہہ رہا تھا۔

''راجہ صاحب کا حکم ہے کہ کوئی بھی ہو' اُڑا دو اُسے بھی!''

آکاش یہ الفاظ سن کر چونک گیا' کیونکہ کالج میں غنڈوں کا کیا کام۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا اور کچھ کرتا' ان تینوں نے ریوالور نکال کر ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔سٹوڈنٹس اِدھر اُدھر بکھر گئے۔رضا اور اس کا دوست بھی اِدھر اُدھر چھپنے کے لیے بھاگنے لگے تو ایک غنڈہ ان کے سروں پر پہنچ گیا۔اس نے رضا کی کنپٹی پر پسٹل رکھ دیا اور آگے چلنے کو کہا۔باقی دونوں نے بھی ان کے جسموں کے ساتھ پسٹل لگا دیئے اور انہیں دھکیلتے ہوئے باہر کی طرف لانے لگے۔

آکاش یہ تماشا دیکھ رہا تھا اور سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا معاملہ ہے۔لیکن فی الحال تو مسئلہ رضا اور اس کے دوست کی جان بچانے کا تھا۔اس نے چپکے سے ریوالور نکال کر ایک غنڈے کا نشانہ لیا۔گولی اس کے پاؤں میں لگی اور وہ وہیں تڑپ کر رہ گیا۔وہ زمین پر گر گیا تھا۔دوسرے دو ساتھی اُسے حیرت سے دیکھ رہے تھے کیونکہ آکاش کے ریوالور کی آواز نہیں آئی تھی۔وہ ہمیشہ سائلنسر لگا کر رکھتا تھا۔ایک نے مڑ کر دیکھا تو دوسری گولی اس کا بازو چیر کر گزر گئی اور پاس سے گزرتی ہوئی وین سے ٹکرا گئی۔انہوں نے پاگلوں کی طرح ہوائی فائرنگ شروع کر دی تو آکاش چیخ پڑا۔''رضا! میرے بھائی گھبرانا نہیں' میں ان کتوں کو کتوں سے بھی بدتر موت دوں گا۔''

رضا آکاش کی آواز سن کر چونکا۔اس نے دیکھا تو آکاش ان کے پاس کھڑا تھا۔

آکاش نے ریوالور کے اشارے سے تیسرے غنڈے کو بھاگ جانے کا اشارہ کیا اور رضا کو کہا کہ جلدی سے ٹیکسی روکو۔رضا بولا ''طماس! جاؤ اپنی گاڑی لے کر آؤ فوراً۔''

طماس تذبذب کا شکار تھا۔آکاش نے چیخ کر کہا اگر گاڑی ہے تو فوراً لے کر آؤ۔میں ان کو دیکھتا ہوں۔آکاش ان غنڈوں کی طرف بڑھ گیا۔دو بھاگنے میں کامیاب ہوگئے تھے جبکہ ایک جس کے پاؤں میں گولی لگی تھی وہ وہیں پڑا تڑپ رہا تھا۔شاید اس کی ہڈی

چورا ہو گئی تھی۔ آکاش نے اس کے سر پر پہنچ کر ریوالور تان لیا۔ وہ منتیں کرنے لگا۔ اتنی دیر میں طماس گاڑی لے کر آ گیا۔ اس نے غنڈے کو رضا کی مدد سے اس میں ڈالا اور بولا۔

"رضا! فوراً گھر کی طرف گاڑی موڑو۔"

رضا نے طماس کو ایک طرف چلنے کا کہا۔ غنڈہ شدت درد سے بے ہوش ہو چکا تھا۔ گاڑی جب گندی بستی کی طرف مڑی تو طماس چونک گیا اور بولا۔

"یہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔"

رضا بھی چونک گیا تھا۔ آج اس کا راز کھلنے والا تھا۔ وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ آکاش نے ایک جگہ گاڑی روکنے کو کہا اور باہر نکل کر اس نے غنڈے کو اپنے کندھوں پر اٹھایا اور دونوں کو کہنے لگا کہ "گاڑی لاک کر کے میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ فوراً۔" دونوں حیرانی سے اس کے حکم کی تعمیل کرنے لگے۔

اس نے مشکل سے دروازہ کھولا اور غنڈے کو زمین پر پٹخ دیا۔ پٹخنے سے وہ ہوش میں آ گیا تھا۔ رضا اور طماس بھی پہنچ گئے تھے۔ رضا نے اندر داخل ہو کر کنڈی لگا لی تھی۔ طماس حیرت سے دیکھ رہا تھا اور بولا۔

"رضا یہ ہم کہاں آ گئے ہیں؟ یہ تو کسی فقیر کا گھر لگتا ہے۔"

رضا بولا: "ہاں تم نے ٹھیک سمجھا۔ یہ میرا گھر ہے' میرا گھر!" وہ افسردہ دکھائی دے رہا تھا۔ طماس کو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔

"تم..... تم یہاں رہتے ہو؟ اس گھر میں؟!" وہ حیرت سے بولا۔

"ہاں! میں یہیں رہتا ہوں۔" رضا نے مختصر سا جواب دیا۔ "تمہیں شاید اب میری دوستی پر فخر کی بجائے افسوس ہو' کیونکہ میں ایک فقیر کا بیٹا ہوں۔" وہ درد بھرے انداز میں بولا۔

"مجھے تو اور بھی غرور ہے اپنی پسند پر۔ اپنی چوائس پر کیونکہ میں دنیا میں واحد شخص ہوں گا جو ایک فقیر سے دوستی کر چکا ہوگا اور اب تم دیکھنا رضا! یہ دوستی میں کیسے پروان

چڑھاتا ہوں۔ میں تمہارا دوست ہی نہیں ہوں بلکہ سچ پوچھو تو تمہارا عاشق ہوں اور تم میرے معشوق ہو۔" یہ کہہ کر اس نے رضا کو گلے لگا لیا۔ طماس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے۔

آکاش کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

"اب اگر لیلیٰ مجنوں اور ہیر رانجھا کی عشقیہ داستان ختم ہو گئی ہو' تو مہربانی کر کے ایک رسی مجھے دے دو جس سے اس کتے کے پتر کو باندھ سکوں۔" اس نے غنڈے کی طرف اشارہ کیا جو حیرانی سے اُن سب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رضا نے جلدی جلدی رسی ڈھونڈ کر آکاش کو دی۔ اس نے غنڈے کو باندھنا چاہا تو وہ مزاحمت کرنے لگا۔ آکاش نے ایک زوردار تھپڑ مارا جس سے اس کا گال پھٹ گیا۔ وہ دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور چلانے لگا۔

"مجھے مت مارو! مجھے مت مارو! میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ گولی اس نے چلائی تھی۔ میں تو ..... میں تو یونہی ساتھ آ گیا تھا۔ مجھے جانے دو! مجھے چھوڑ دو! مجھے مت مارو!"

"ٹھیک ہے' تمہیں چھوڑ دیں گے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے رضا پر گولی کیوں چلائی؟" آکاش نے پوچھا تو وہ پھر حیرت سے بولا "کون رضا؟ میں کسی رضا کو نہیں جانتا۔"

"یہ رضا! تمہارا باپ! یہ رضا! یہ آکاش کا بھائی رضا!" آکاش نے رضا کی طرف اشارہ کر کے اُسے بتایا تو وہ پھر چیخنے لگا۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔ ہم تو صرف چھوٹے راجہ صاحب کو قتل کرنے آئے تھے۔" اس کا اتنا کہنا تھا کہ وہ تینوں چونک پڑے۔ احمد طماس آگے بڑھا اور اس کے سامنے بیٹھ کر پوچھنے لگا۔

"مگر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟؟" آکاش حیرت سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"میں نہیں جانتا۔ میں تو بس..... پلیز! مجھے جانے دو۔ وہ میرے بچوں کو مار ڈالے گا۔ وہ بہت ظالم ہے' پلیز بھائی! مجھے جانے دو۔" وہ کچھ بتاتے بتاتے رک گیا تھا۔

آکاش نے کہا: "تم ایسے نہیں بتاؤ گے۔" اس نے ریوالور نکال کر رضا کو پکڑا دیا اور بولا۔ "رضا! اگر یہ میرے تین گننے تک نہ بتائے تو گولی اس کی کھوپڑی میں اتار دینا۔"

رضا نے زندگی میں پہلی بار ریوالور پکڑا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"ایک!" آکاش نے گننا شروع کیا۔ "دو......!" اس سے پہلے کہ وہ تین بولتا' دروازہ کھٹکھٹایا جانے لگا۔ وہ تینوں ہی چونک پڑے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے تو آکاش نے طماس کو اشارہ کیا کہ وہ دروازہ کھولے۔ آکاش نے رضا سے ریوالور لے کر دروازے کی طرف تان لیا اور اُسے اشارے سے ایک طرف کھڑے ہونے کو کہا۔

دروازہ ایک بار پھر کھٹکنے لگا۔ طماس نے آکاش کی طرف دیکھا تو اس نے اشارہ کیا کہ دروازہ کھول دو۔ طماس نے کنڈی کھولی تو سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"آپ..........؟! اور یہاں..........؟؟!"

☆..............☆

سلامِ عشق میری جاں ذرا قبول کر لو
ہم سے پیار کرنے کی ذرا سی بھول کر لو

میرا دِل بے چین ہے ہمسفر کے لیے
سلامِ عشق میری جاں ذرا قبول کر لو

اس انڈین گانے کی آواز پورے کوٹھے پر گونج رہی تھی۔ مہرین کا مجرا پورے عروج پر تھا۔ اس ہیرے کے بہت سے قدردان نوٹ نچھاور کر رہے تھے۔ وہ طرح طرح کی ادائیں دکھاتی اور ہزاروں روپے پل بھر میں اس پر نچھاور ہو جاتے۔ نائیکہ اور میڈم تجلی ایک طرف تکیہ لگائے بیٹھی تھیں اور نوٹوں کی برسات ہوتے ہوئے خوشی سے دیکھ رہی تھیں۔ تجلی بیگم کی زندگی میں نوٹوں کی کمی نہ تھی مگر وہ پیدائشی طوائف تھی۔ راجہ سلیم کی دولت' جائیداد اور جاگیر اس کی ملکیت تھی۔ راجہ سلیم کے آنکھیں بند کرتے ہی سب کچھ اسے مل جاتا تھا۔ اس نے بھی برائے نام شوہر رکھا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے اپنی زندگی گزار رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ راجہ سلیم بے اہمیت ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنی سیاسی زندگی

میں اس طرح الجھا ہوا تھا کہ اُسے بیگم صاحبہ کی مصروفیات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ ہر قیمت پر الیکشن جیتنا چاہتا تھا۔ چاہے اس راہ میں کوئی بھی آئے وہ ہر دیوار گرا کے وزارت کی کرسی پر بیٹھنے کے لیے بے چین تھا۔ مجرا عروج پر پہنچ کر ختم ہوا چاہتا تھا۔ ابھی گیت کے بول چل رہے تھے کہ ایک نوجوان تماش بین نے مہرین کو کھینچ کر اپنی گود میں گرا لیا اور وہ اس سے چھڑانے کے لیے نازک ادائیں دکھاتی رہی مگر جب معاملہ حد سے بڑھ گیا تو مہرین نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ وہ یک دم زناٹے دار تھپڑ کھا کر ہوش میں آ گیا تھا۔ اس نے مہرین کا ہاتھ نہ چھوڑا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ناچ گانا سب ختم ہو گیا تھا۔ کوٹھے پر سناٹا چھا گیا کیونکہ آج تک کسی تماش بین نے اتنی جرأت نہ کی تھی کہ تجلی کے ہوتے ہوئے کسی طوائف کے ساتھ اس کی مرضی کے بغیر بدتمیزی کی ہو مگر آج یہ سب ہوا تھا اور اب نجانے کیا ہونے والا تھا۔ تجلی بھی ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"مہرین کا ہاتھ چھوڑ دو بلّو!!" میڈم نے غرا کر کہا۔

"ہا...... ہاہا...... ہا...... ہا...... میڈم تجلی! بلّو کے چہرے پر آج پہلی بار کسی لڑکی نے تھپڑ مارا ہے اور بلّو کی طرف کوئی اکھ چک کر دیکھ لے تو رب دی سونہہ بلّو اس کی اکھ ہی کڈھ دیتا ہے۔ اس تھپڑ کا حساب یہ مہرین دے گی اور کیسے وصولی ہو گی' یہ بلّو جانتا ہے!" یہ کہہ کر اس نے مہرین کو جھٹکا دے کر اٹھایا اور کندھے پر لاد کر باہر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے جلدی سے ڈب سے پسٹل نکال کر ایک ہاتھ سے سامنے آنے والے غنڈوں کو پرے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ ایک نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو بلّو نے فائر کر دیا۔ گولی اس چھچھے کو لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

بلّو ایک لاش گرانے کے بعد سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے بازار میں آ گیا تھا۔ گولی کی آواز سن کر ارد گرد کے تمام کوٹھوں پر مجرا بند ہو چکا تھا۔ طوائفیں بالکونیوں میں کھڑی ہو کر تماشا دیکھ رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ نیچے کھڑی گاڑی میں بلّو مہرین کو بٹھا کر لے جاتا اس کے گرد دس پندرہ غنڈے اکٹھے ہو گئے جن کے ہاتھوں میں ہاکیاں' ڈنڈے' سنگل' تلواریں اور نجانے کیسے کیسے ہتھیار تھے۔ انہوں نے بلّو کو گھیر لیا۔ اس نے مہرین کو گاڑی میں ڈالنا چاہا تو مہرین اس کے ہاتھ پر اپنے دانتوں سے کاٹتی ہوئی الگ ہو گئی۔ وہ

سیڑھیاں چڑھتی ہوئی میڈم کے پاس پہنچنا چاہتی تھی کہ بلو نے پیچھے سے گولی چلا دی۔ مہرین بھاگ رہی تھی اسی لیے گولی اُسے نہ لگی۔ اس سے پہلے کہ بلو دوسرا فائر کرتا۔غنڈوں نے اُسے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ تجلی بیگم یہ سارا تماشا بالکنی میں کھڑی دیکھ رہی تھیں۔غنڈوں نے بلو کو اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔میڈم کے اشارے پر تمام چمچے رُک گئے۔انہوں نے میڈم کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔وہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے بازار میں آئی تھی اور یہ بلو کے لیے بدقسمتی کی علامت تھی۔اس نے غنڈوں کو دور ہٹنے کا اشارہ کیا اور بولی۔

''پانی کا جگ اس کتے کے منہ پر مارو' اسے ابھی ہوش میں لے کر آؤ۔''

پانی ڈالنے سے بلو ہوش میں آ گیا تھا۔ اس نے میڈم کو تھرڈ کلاس گالیاں دینا شروع کر دیں' تو میڈم مسکراتی ہوئی بولی:

''جو کام تم نے کیا ہے بلو! وہ کسی بہادر کا کام ہے۔ میڈم تجلی کے کوٹھے سے طوائف اٹھا کر لے جانا اور پھر اس بازار تک پہنچ جانا' یہ کسی ایسے آدمی کا کام ہے جو بہت بڑا دلیر ہو۔تم نے یہ کام کیا تو میں خوش ہوئی کہ آج پچیس سال بعد کوئی دلیر اس کی زندگی میں آیا ہے جو اُسے کوئی بہت بڑا چیلنج کرے گا۔ اتنا بڑا چیلنج کہ جو آج سے پچیس سال پہلے ایک دلیر نے کیا تھا۔ پتہ ہے اس نے کیا کہا تھا؟'' میڈم اس کے گرد چکر لگا رہی تھی اور اُسے بتا بھی رہی تھی۔

''اُس نے کہا تھا کہ آج میں فقیر ہوں تو کیا ہوا تجلی بیگم۔ایک دن دیکھنا تمہارے پاؤں میں بندھے ہوئے گھنگھرو اُس فقیر کے کشکول میں گریں گے اور میں نے کہا تھا کہ کبھی بھی طوائف کے گھنگھرو کسی کنگال کے آنگن میں نہیں بجے تو کسی فقیر کے کشکول میں کیسے گریں گے۔آج تک میں انتظار کر رہی ہوں کہ وہ فقیر اپنا چیلنج پورا کرنے کے لیے کب آتا ہے۔تم بھی ویسے ہی دلیر اور بہادر لگے تھے مگر تم نے گالیاں دے کر ثابت کر دیا کہ تم بھی کوئی شریف زادے نہیں ہو۔ یہیں کہیں کی پیداوار ہو۔کسی طوائف کی کوکھ سے جنم لیا ہے تم نے اور کسی امیرزادے یا بگڑے رئیس کا گندا خون ہو تم' جس سے تم......تم جیسا گھٹیا بدمعاش ہی پیدا ہو سکتا ہے......اس کی بوٹی بوٹی کر کے کتوں کو ڈال دو تا کہ آئندہ کوئی بھی اس جیسی حرکت کرنے سے پہلے سینکڑوں بار سوچے۔ اس کو اتنا

مارو اور اس وقت تک مارو جب تک یہ خود نہ مر جائے! گڈ بائے بلو بدمعاش!'' یہ کہہ کر میڈم سیڑھیاں چڑھنے لگی تو غنڈوں نے اُس کی دھلائی کرنا شروع کر دی اور تب تک مارتے رہے جب تک اُس کی سانس آتی رہی۔ انہوں نے بلو بدمعاش کی لاش گاڑی میں ڈالی اور وہاں سے لے کر چلے گئے۔ میڈم نے اعلان کیا۔

''جاؤ' اپنے اپنے دھندے شروع کرو۔ رات بیت گئی تو بلو کی روح کو ثواب ہو گا......'' یہ سُن کر طوائفیں ہنستی ہوئیں اپنے اپنے کوٹھوں پر لوٹ گئیں۔اور ایک بار پھر ڈھولک' گھنگھرو اور طبلوں کی تھاپ نے بازار کا ماحول گرم کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی میڈم کے موبائل نے شور مچا دیا۔اس نے نمبر دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا کیونکہ راجہ سلیم نے کبھی بھی اُسے ڈسٹرب نہ کیا تھا اور اس وقت جبکہ رات کے دو بج رہے تھے' راجہ کا فون' ضرور کوئی اہم بات ہو گی۔

''کہیے' راجہ صاحب! کیا بات ہے؟'' اس نے فون آن کر کے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

''تجلی! کہاں ہو اس وقت؟'' دوسری طرف سے راجہ کی آواز آئی۔

''اس وقت میں جہاں ہوں تمہیں بخوبی علم ہے اور اس لمحہ میرے پاس وقت بہت کم ہے' جو بھی بات ہے فوراً کہو!'' میڈم نے ناگواری سے جواب دیا۔

''شام کا اخبار پڑھا ہے تم نے؟'' راجہ نے کہا تو میڈم نے ناگواری سے کہا۔

''یہ کوئی اہم خبر نہیں ہے کہ تم رات دو بجے میرا سکون برباد کرو!'' وہ فون بند کرنا چاہتی تھی کہ راجہ نے جلدی جلدی کہا۔

''فون بند کرنا ضرور مگر یہ سُن لینا کہ شام کے اخبار میں بڑی بڑی ہیڈ لائن میں یہ لکھا ہے کہ راجہ سلیم کے بیٹے راجہ احمد طماس پر دوسرا قاتلانہ حملہ' اور تا حال چھوٹے راجہ صاحب لاپتہ ہیں۔ یہ میرے لیے تو اہم خبر ہے۔شاید تھوڑی سی تمہارے لیے بھی ہو۔ اس کی اہمیت کا اندازہ کر کے فوراً گھر پہنچو۔'' یہ کہہ کر راجہ نے رابطہ منقطع کر دیا۔

تجلی بیگم کو راجہ سلیم کا یہ انداز پسند نہ آیا تھا۔ پھر بھی اس نے گھر جانے کا سوچا کیونکہ راجہ سیاسی آدمی تھا۔ پریس والے اس کے اردگرد جمع ہوں گے۔ ماں کو موجود نہ پا کر وہ عجیب سے سوالات کریں گے لہٰذا جانا تو پڑے گا ہی۔

یہ سوچ کر اس نے نائیکہ کو اپنے پاس بلایا اور اسے ضروری ہدایات دینے کے بعد وہ گھر کی طرف چل پڑی اور بڑبڑاتی ہوئی گھر پہنچ گئی۔ کوٹھی پرسکون تھی۔ وہ اندر داخل ہوئی تو راجہ صاحب ٹہل رہے تھے۔ وہ اندر داخل ہوتے ہی برس پڑی۔

''ایسی کون سی قیامت آ گئی تھی جو مجھے فون کر کے ڈسٹرب کیا؟''

''آہستہ بات کرو' چاندنی گھر میں موجود ہے اور پریشانی کی وجہ سے میرا خیال ہے جاگ رہی ہوگی.....'' راجہ نے اُسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر آہستہ بات کرنے کو کہا۔

''دیکھیں راجہ صاحب! یہ تعلیم ولیم میرا مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی اس لڑکے کی حفاظت کرنا میری ذمہ داری ہے۔''

''یہ ہم دونوں کی اولاد ہے اور ہم دونوں کی ذمہ داری بھی ہے۔ میرے ساتھ ساتھ تمہیں بھی پریشان ہونا پڑے گا۔ کیسی ماں ہو تم؟ تمہیں ذرہ برابر بھی احساس نہیں ہے کہ اکلوتا بیٹا پتہ نہیں زندہ ہے یا خدانخواستہ مر گیا ہے۔ اپنی رنگ رلیوں سے فراغت مل جائے تو کبھی گھر کے بارے میں بھی سوچنا شروع کیجیے' تجلی بیگم صاحبہ!''

''اپنا لہجہ دھیما کیجیے راجہ صاحب! اس انداز میں کوئی مجھ سے بات کرے مجھے پسند نہیں۔'' تجلی بیگم بھی اُکھڑ گئیں۔

''کوئی.....کوئی.....! کیا کہا تم نے کہ کوئی بات کرے۔ اس کا مطلب ہے کہ میں کوئی ہوں۔ راجہ سلیم کوئی ہے.........!''

تجلی بیگم گفتگو کا انداز بدلو اور یہ محسوس کرو کہ شوہر اور عاشق میں فرق ہوتا ہے۔ میں تمہارا شوہر ہوں یہ گھر' یہ بچے' ان کی دیکھ بھال ہم دونوں کی ذمہ داری ہے۔ ڈیٹس آل!'' راجہ بھی گرم مزاج کا آدمی تھا۔ اسمبلی میں بولتا تو اس کا معمول تھا ہی مگر آج گھر بھی اسمبلی بنا ہوا تھا۔

''دیکھیے راجہ صاحب! میں کسی نئی بحث میں نہیں پڑنا چاہتی اور نہ ہی آپ کو یہ یاد دلانا چاہتی ہوں کہ ہمارے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا' اس میں کہیں بھی یہ نہیں لکھا گیا کہ ان بچوں کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔ میں قاعدے کی رُو سے کاجل کی دیکھ بھال کر رہی ہوں۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ان دونوں کی پرورش' دیکھ بھال آپ کا سردرد ہے۔ اینڈ

دیٹس آل!'' یہ کہہ کر تجلی بیگم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اپنے کمرے میں جانے لگی۔ ابھی تین چار سیڑھیاں ہی چڑھی ہوں گی کہ راجہ صاحب غصہ سے بولے۔

''کاجل کا بیڑہ غرق کر دیا ہے تم نے! شرم آتی ہے' شرم آتی ہے مجھے اس کا سامنا کرتے ہوئے۔ میں کسی کو فخر سے نہیں بتا سکتا کہ یہ میری بیٹی ہے۔ اچھی پرورش کی ہے تم نے تجلی بیگم! بہت اچھی! اتنی اچھی کہ ملک خاندان کی بیٹی کو گھنگھرو پہنا کر اس بازار میں کھڑا کر دیا۔ اس بازار میں جہاں خاندانوں کی عزتیں نیلام ہوتی ہیں جہاں سے گزرتے وقت بڑے بڑے شریف انسان اپنا سر جھکا کر گزرتے ہیں۔ اس بازار میں میری عزت کو سرعام فروخت کیا ہے تم نے تجلی بیگم! یاد رکھنا اس کا بدلہ تمہیں چکانا پڑے گا۔ ایک دن ضرور ایسا ہوگا۔'' راجہ سلیم اچھے خاصے بگڑے ہوئے لگ رہے تھے۔ میڈم وہیں کھڑی تھی۔ اس نے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ سجائی اور بولی۔

''لگتا ہے آج برسوں بعد تم پر تبلیغ کا دورہ پڑا ہے۔ کیا مجھے یاد دلانا ہوگا راجہ صاحب کہ آپ کے چہرے پر بھی ایک ماسک ہے' جس کے پیچھے وہ تماش بین چھپا بیٹھا ہے جس نے اپنے بھائی کی بیوی سے شادی کی ہے اور وہ شادی کسی نیک یا پاک باز عورت سے نہیں ہوئی بلکہ تجلی بیگم سے ہوئی ہے۔ اسی تجلی بیگم سے' جس کے اشارے پر آج بھی تم جیسے عاشق دل نچھاور کرنا اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ یہ وہی تجلی ہے جو کبھی کراچی کے بازارِ حسن کی رونق ہوا کرتی تھی اور تم دونوں بھائی اس کا پانی بھرتے تھے۔ ایک دوسرے سے چوری چوری!!'' تجلی بیگم ماضی یاد دلا رہی تھی جبکہ راجہ صاحب مُٹھیاں بھینچ بھینچ کر اپنا غصہ کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور چاندنی اپنے کمرے میں بیٹھی یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ اور ہر بات اس پر بجلی بن کر گر رہی تھی۔ ایک بار پھر تجلی کی آواز آنا شروع ہوگئی۔

''راجہ صاحب! آپ کو اور بہت کچھ یاد دلاؤں گی مگر اتنا ضرور یاد رکھو کہ آج جس مقام پر تم ملک شیر علی سے راجہ سلیم بن کر کھڑے ہو' وہ مقام' وہ مرتبہ' وہ درجہ' سب کچھ اس تجلی بیگم کا مرہونِ منت ہے۔ میری زبان سے نکلنے والا ایک لفظ' صرف ایک لفظ ملک شیر علی! تمہیں وزیر سے فقیر بنا سکتا ہے۔ یاد ہے مجھے کہ تم بھیک بہت اچھی طرح مانگ لیتے ہو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم اپنی زبان اور اپنا لہجہ دھیما رکھو تا کہ میری

زبان سے کوئی لفظ نہ نکلے اور تمہارا مان تران' یہ رُعب اور دبدبہ قائم رہے۔ جا کر سو جاؤ اور مجھے مزید ڈسٹرب نہ کرنا! احمد طماس نے تجلی کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ وہ محفوظ بھی ہوگا اور کسی اپنے ہی کے پاس ہوگا۔'' یہ کہہ کر تجلی اوپر چلی گئی۔ ملک شیر علی یعنی راجہ سلیم منہ لٹکا کر وہیں بیٹھ گئے جبکہ چاندنی اپنے کمرے میں یہ انکشافات سن کر گم سم بیٹھی تھی۔

☆............☆

احمد طماس اپنے سامنے کھڑے خیر دین کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا تھا کہ آپ اور یہاں۔ کیونکہ وہ خیر دین کو پہچانتا تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر کئی مرتبہ اس سے ٹکراؤ ہو چکا تھا بلکہ اس نے' چاندنی نے کئی مرتبہ اسے بھیک دی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا خیر دین بول پڑا۔

''ہاں بیٹا! میں یہاں بھیک مانگنے نہیں آیا بلکہ اپنے گھر میں آیا ہوں۔ تم اس وقت میرے گھر میں کھڑے ہو اور میں باہر کھڑا ہوں۔'' یہ سُن کر طماس نے اُسے اندر آنے کا راستہ دے دیا۔

خیر دین اندر داخل ہو کر حیران ہو گیا کیونکہ آکاش نے ایک غنڈہ ٹائپ آدمی کو ڈھیر کیا ہوا تھا اور کچھ زبردستی کر رہا تھا۔ اس نے رضا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش خاموش ایک طرف کھڑا تھا۔ خیر دین نے کنکھیوں سے احمد طماس کی طرف دیکھا وہ سمجھ گیا کہ رضا نے اُسے نہیں بتایا ہوگا کہ وہ فقیر کا بیٹا ہے۔ اس نے احمد طماس کو بازو سے پکڑ کر چارپائی پر بٹھایا اور آکاش سے پوچھا کہ یہ تمام کیا معاملہ ہے۔ ''اور رضا بیٹا! تم کیوں کھوئے کھوئے ہو۔ اِدھر آؤ میرے پاس اور دیکھو اب کیا بنتا ہے!؟!'' خیر دین دور کہیں دیکھتا ہوا بولا۔

''بابا! یہ تین غنڈے تھے' انہوں نے کالج میں احمد طماس پر فائرنگ کی ہے' میں بھی ساتھ تھا۔ وہ تو آکاش بھائی نجانے کہاں سے آگئے کہ ہم دونوں کی جان بچ گئی اور یہ غنڈہ بھائی کی گولی سے زخمی ہو کر ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے۔ آکاش بھائی اس سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔'' احمد رضا نے سہمے ہوئے لہجے میں تمام بات بابا کو بتا دی۔ بابا نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلا دیا۔

''ہاں تو گندے باپ کی گندی اولاد! یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور احمد طماس پر کیوں حملہ کیا۔ تم سچ سچ بتا دو میرا وعدہ ہے کہ تمہیں اور تمہارے بچوں کو کچھ نہیں ہوگا۔ اور میں تمہیں جانے دونگا۔ یہ آکاش کا وعدہ ہے۔'' آکاش ایک بار پھر غنڈے کی طرف متوجہ ہوا۔

''آپ مجھے چھوڑ دیں گے نا' وعدہ کریں۔'' وہ بہت ڈر گیا تھا۔ ''میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔'' اس بار خیر دین آگے بڑھا اور بولا۔

''بتا دو! تمہاری خیریت کی میں ضمانت دیتا ہوں۔''

''تم......تم......کون ہو......؟'' اس نے ڈر کر پوچھا' تو خیر دین ہنس کر بولا۔

''مجھے کھوئے ہوئے تو کئی صدیاں گزر گئی ہیں۔ لیکن اس وقت تم مجھے ان بچوں کا باپ ہی سمجھ لو۔'' آکاش اور طماس نے حیرت سے خیر دین کی طرف دیکھا۔ وہاں اس کے چہرے پر بوڑھی جھریوں کے سوا کچھ نہ پڑھ سکے۔

''ہمیں راجہ صاحب نے بھیجا تھا۔ چھوٹے راجہ کو قتل کرنے کے لیے!'' اس نے بتایا تو طماس تڑپ کر آگے بڑھا اور اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

''کون راجہ؟ جلدی بتاؤ' کون راجہ؟''

''راجہ سلیم صاحب۔ آپ کے ڈیڈی!''

یہ سننا تھا کہ ایک زوردار تھپڑ طماس نے اُس کے گال پر دے مارا۔ وہ رونے لگا اور روتے ہوئے خیر دین کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

''آپ نے میری خیریت کی ضمانت دی ہے' بابا جی! مجھے مت مارو۔ میں سب کچھ سچ بتا رہا ہوں۔'' خیر دین نے رضا کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا اور طماس کو کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور بابا کی چارپائی پر بٹھا دیا۔ آکاش بولا۔

''پلیز طماس صاحب! مجھے کچھ پوچھنے دیں۔''

''ہاں بولو! کیوں تم طماس کو مارنا چاہتے تھے؟''

''راجہ صاحب الیکشن جیتنا چاہتے ہیں' ہر قیمت پر! انہوں نے ٹائیگر کو بہت سارے روپے دیئے ہیں وہ راجہ طماس کو اس لیے قتل کروانا چاہتے ہیں کہ وہ مخالف امیدوار پر ان کے قتل کا الزام لگا کر اُسے ظالم اور خود کو مظلوم ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ حلقہ

کے تمام ووٹران کے حق میں ہو جائیں گے۔ یہ سچ ہے' یہ سچ ہے مجھے جانے دو۔ میرے بچے میرا انتظار کر رہے ہوں گے پلیز!"

"آکاش بھائی! یہ جھوٹ بول رہا ہے' میرے پاپا جانی مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ وہ تو ہمیں دیکھ کر جیتے ہیں۔ یہ ہم دونوں میں جھگڑا کروانا چاہتا ہے۔ یہ...... یہ...... بکواس کر رہا ہے۔" طماس ایک بار پھر ہتھے سے اُکھڑ گیا۔ وہ اُسے مارنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا' مگر خیر دین اور رضا نے اُسے روک رکھا تھا۔

آکاش نے رضا کو اشارہ کیا کہ اسے جانے کے لیے دروازہ کھول دو' اس نے غنڈے کو کہا کہ وہ جا سکتا ہے۔" مگر اس جگہ کے بارے میں اگر کسی کو بتایا تو میں تمہارے گھر آ کر تمہارے بچوں کو زندہ جلا دوں گا۔ سمجھے!"

وہ جلدی سے بولا۔

"نہیں نہیں صاحب! میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں اپنے بچوں سے بہت پیار کرتا ہوں۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔" یہ کہہ کر وہ باہر کی طرف لپکا تو رضا نے کنڈی لگالی۔

احمد طماس بلک بلک کر رونے لگا تھا۔ خیر دین اور رضا اُسے تسلی دے رہے تھے۔ اُس کا دل کچھ ہلکا ہوا تو اس نے آکاش سے کہا کہ وہ گھر جانا چاہتا ہے۔

آکاش نے نفی میں سر ہلا دیا۔ تو وہ حیرت سے بولا: "میں اپنے پاپا جانی سے ملنا چاہتا ہوں۔ اُن سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک کرسی کی خاطر میری قربانی' اولاد کی قربانی' اکلوتے بیٹے کو سیاست کی نذر کرنا چاہتے ہیں وہ...... پلیز! آکاش بھائی! پلیز...... میری اکلوتی بہن' میری چاندو پریشان ہوگی۔ وہ میری لاڈلی بہن ہے۔ بڑی آپی تو امریکہ میں ہوتی ہیں میں اپنا دکھ اپنی بہن سے شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز! بڑے بھائی!" وہ منتیں کر رہا تھا۔

"احمد رضا چائے بہت اچھی بناتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں ایک پیالی چائے کی ضرورت ہے۔ رضا دودھ لے کر آؤ اور طماس پلیز' کچھ دیر رُک جاؤ۔ مجھے کچھ سوچنے دو تا کہ میں تمہارے باپ کو بے نقاب کر سکوں۔" آکاش نے کہا تو رضا برتن لے کر دودھ لینے چلا گیا اور طماس خیر دین کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔

"بہت بُرا کیا ہے تم نے شیر علی! بہت بُرا!!!" خیر دین بڑبڑایا' مگر اس کی بڑبڑاہٹ کوئی نہ سمجھ سکا۔ یکدم رضا اندر داخل ہوا تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہوتے ہی سیدھا آکاش کی طرف بڑھا اور بولا۔

"آکاش بھائی! پولیس والے طماس کی گاڑی لے گئے ہیں اور کچھ پولیس والے اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ میں نے ان کی باتیں سُنی ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ ہو سکتا ہے' چھوٹے راجہ یہیں کہیں ہوں۔" آکاش نے سُنا تو قہقہہ مار کر ہنس پڑا جبکہ وہ تینوں اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔

"ارے یار! تُو تو واقعی ڈرپوک ہے یا پھر انتہائی شریف! وہ اگر باتیں کر رہے تھے تو تجھے ٹینشن لینے کی کیا ضرورت ہے؟ فکر مت کرو کوئی ادھر نہیں آئے گا اور کسی کا دھیان بھی اس طرف نہ آئے گا کیونکہ یہ فقیر کا گھر ہے' تم بے فکر ہو کر چائے بناؤ۔ اور تم بھی طماس اگر مجھے بڑا بھائی سمجھتے ہو تو اپنے جوتے اتارو اور ری لیکس ہو کر بیٹھو۔ ہم چائے کا مزہ خراب نہیں کرنا چاہتے۔ اوکے ناؤ کوئیک اینڈ ریڈی فار ٹیکنگ ٹی۔" (Ok. Now quick and ready for taking tea.)

وہ بڑا پُرسکون تھا۔ اس نے طماس کو کہا کہ اگر اس کے پاس موبائیل ہے تو اسے آف کر دے کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ فون کی گھنٹی اردگرد کو خبردار کر دے۔

طماس نے موبائیل فون نکال کر دیکھا تو بولا "یہ پہلے ہی آف ہے۔ بھاگ دوڑ میں آف ہو گیا ہوگا۔ یہ میرے خیال میں اچھا ہی ہوا ہے......" اس نے کہا تو خیر دین خوش ہو کر بولا۔

"ویری گڈ! خوش رہو اور پُرسکون زندگی گزارو۔ آج کی رات ہم اکٹھے گزاریں گے۔ اوکے!"

وہ بہت خوش تھا۔ احمد طماس جگی کا بیٹا' ملک شیر علی کا بیٹا تھا۔ اس کا سگا بھتیجا۔ اس کا اپنا خون تھا' مگر وہ اس رشتے کی پہچان ابھی نہیں کروانا چاہتا تھا۔ ابھی تو جگی کو گھٹنوں کے بل جھکانا تھا۔ ابھی تو رضا کی چاندنی سے شادی کرانا تھی اور ابھی تو شیر علی سے اس وار کا بدلہ لینا تھا جو اس نے چھپ کر اس کی پیٹھ پر کیا تھا جگی سے شادی کر کے۔ وہ چائے پینے لگے تو خیر دین نے احمد رضا کے کان میں آہستہ سے کہا۔

''ابھی آدھے کامیاب ہوئے ہو' جب چاندنی یہاں بیٹھ کر چائے پیے گی تب سربستہ راز کھل جائے گا۔'' وہ دونوں باپ بیٹا مسکرا پڑے حالانکہ اس وقت گھر میں کئی رشتے موجود تھے مگر وقت کی گرد نے ان پر اپنا ڈیرہ جما رکھا تھا' انہیں خلوص اور وفا کی جھاڑن سے جھاڑنا ضروری تھا' مگر ابھی وقت نہ تھا۔

☆..............☆

چاندنی اپنے بھائی کے لیے تو پریشان تھی ہی' مگر یہ جھٹکا بہت شدید تھا کہ وہ ایک طوائف کی بیٹی ہے' اُس کی ماں' اُس کی بہن طوائفیں ہیں۔ وہ پڑھی لکھی اور باشعور تھی۔ اس نے والدین کی گفتگو سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ طوائف زادی اور احمد طماس طوائف زادہ ہے۔ کیا منہ دکھائے گی وہ اپنی دوستوں کو' اپنے کالج فرینڈز کو اور سب سے بڑی بات یہ کہ احمد رضا۔ اوہ مائی گاڈ احمد رضا کیسے...... کیسے شامل کرے گا اُسے اپنی زندگی میں؟ اس نے تو بہت بڑے بڑے خواب دیکھے ہیں' اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے۔ مگر وہ...... مگر وہ کیسے شادی کرے گا چاندنی سے...... کیسے وہ ایک طوائف زادی کو اپنی شریک حیات بنائے گا؟ ناممکن' ناممکن ہے یہ سب! سب کچھ برباد کر دیا تم نے ہمارا ممّا! سب کچھ! ہمارے خواب! ہماری نیندیں! ہمارا سکون' چین' قرار' ہمارا فیوچر' سب کچھ انا کی بھینٹ چڑھا دیا ہے آپ نے ممّا!۔ احمد طماس! تم کہاں ہو بھائی؟ پلیز آ جاؤ' میں تنہا ہوں۔ دیکھو تمہاری چاندو تنہا ہے' پلیز......!'' رات کا پچھلا پہر گزر رہا تھا۔ اُس نے ایک بار پھر موبائل ٹرائی کرنے کا سوچا۔ اس نے اپنے موبائل سے طماس کا نمبر ڈائل کیا مگر اس بار بھی وہی جواب کہ آپ کے ڈائل کردہ مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا' پلیز کچھ دیر بعد کال کیجیے۔ وہ رونے لگی اور روتے روتے سوگئی۔ جیسے تیسے کر کے رات گزر گئی تھی۔ راجہ سلیم کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اس بار بھی اس کے بندے ناکام لوٹے تھے۔ اس نے ٹائیگر کو گولی مار دی تھی۔ وہ زخمی ہو کر ہسپتال میں پڑا تھا اور بقول راجہ کے یہ انتہائی کم سزا تھی۔ صبح صبح ہی اس کے محل میں رپورٹرز گھس آئے تھے۔ وہ راجہ سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے۔ کافی سارے صحافی اس کا انٹرویو کر رہے تھے۔

''راجہ صاحب! آپ کے بیٹے پر دوسرا قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ آپ نے پہلے حملہ کا کیا نوٹس لیا تھا؟''

''دیکھیے ہمارے ہزاروں دشمن ہوتے ہیں' ہم کس کس سے لڑائی کریں گے۔ ویسے بھی ہم حکومتی عہدے دار ہیں' کسی کو قتل شتل اور دشمنی تو ہمیں زیب نہیں دیتی کیونکہ حکومت کا کام تو عوام کی حفاظت اور دیکھ بھال ہے نا......!'' راجہ نے مطمئن سا جواب دیا۔

''راجہ صاحب! اگر خدانخواستہ آپ کے بیٹے کو کچھ ہو جاتا تو آپ ان دیکھے قاتلوں کے خلاف کیا کرتے؟'' ایک اور چبھتا ہوا سوال راجہ کی پیشانی پر تیوری ڈال گیا' مگر پھر بھی راجہ نے صورت حال کو کنٹرول کیا بلکہ اپنے غصہ کو قابو کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ الیکشن نزدیک آ رہے ہیں۔ میری جان کے ساتھ ساتھ میری پوری فیملی کو بھی سکیورٹی مسائل سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ اپوزیشن ایسی اوچھی حرکتوں سے باز ہی رہے تو بہتر ہے ورنہ ہم بھی کوئی ایسا ہی کام کریں گے کہ اپوزیشن والے حیران رہ جائیں۔ ہم قتل وغیرہ پر یقین نہیں رکھتے۔ وہ مجھے میرے بچوں پر حملہ کر کے ڈرانا دھمکانا چاہتے ہیں مگر میرا نام راجہ سلیم ہے۔ وقت کی نبض ہمارے ہاتھ میں ہے۔'' وہ ابھی یہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ کوٹھی کے مین گیٹ سے احمد طماس اور آکاش کے ساتھ احمد رضا بھی اندر داخل ہو رہے تھے۔ ایک جرنلسٹ کی نگاہ احمد طماس پر پڑی۔ وہ اس کی طرف لپکا۔ دیکھا دیکھی تمام رپورٹرز اس کی طرف ہو گئے تو آکاش نے آگے بڑھ کر انہیں روکا اور کہا۔

''آپ کے تمام سوالوں کے جواب راجہ صاحب ابھی کے ابھی دیں گے۔ بس باری باری سکون سے سوال پوچھیے......''

شور شروع ہو گیا تھا۔ احمد طماس نے باپ کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا کر بانہیں کھول کر کھڑے ہو گئے جبکہ راجہ احمد طماس نے غصے سے منہ پھیر لیا۔

''راجہ صاحب! کیا آپ حملہ آوروں کو پہچانتے ہیں؟''

طماس نے باپ کی طرف گھور کر دیکھا تو راجہ سلیم کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

''میں بہت جلد پریس کانفرنس بلاؤں گا۔ اس میں آپ کے سامنے حملہ آوروں کو

کان سے پکڑ کر پیش کروں گا کیونکہ میں صرف انہیں پہچانتا ہی نہیں بلکہ اس طرح جانتا ہوں جیسے ایک بیٹا اپنے باپ کو جانتا ہے۔" احمد طماس کا جواب کیا تھا' ایٹم بم تھا' جو راجہ سلیم کے سر پر پھٹا تھا۔

"اب آپ لوگ جائیں پلیز! مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ میں اپنے مہربان باپ سے ملنا چاہتا ہوں۔" وہ آگے بڑھا جبکہ آکاش اور احمد رضا وہیں کھڑے رہے۔ اُس نے آگے بڑھ کر گم سم کھڑے باپ کو گلے لگا لیا اور ان کے کان میں کہا۔

"دوسری بار بھی ناکامی کا مطلب ہے ابھی میری اس گھر اور اس ملک کو ضرورت ہے۔"

"کک...... کیا مطلب؟" راجہ سلیم ہکلانے لگا۔

"ارے پاپا جانی! آپ کے ماتھے پر پسینہ! یہ لیجیے رومال پسینہ صاف کیجیے! اور ہاں اس بار میری جان بچانے والے مہربان سے تو مل لیجیے۔" وہ ابھی یہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ تجلی بیگم اور چاندنی اندر سے آتی ہوئی دکھائی دیں۔ چاندنی بھائی کو صحیح سلامت دیکھ کر بھاگتی ہوئی آئی اور بھائی کے گلے لگ کر رونے لگی۔

"میں ٹھیک ہوں چاندو! تم میری فکر نہ کرنا۔ اللہ کی رحمت سے مجھے بچانے والے اس نے بہت سے لوگ پیدا کیے ہیں۔" احمد طماس نے کہا اور چاندنی کو خود سے علیحدہ کیا۔ اتنی دیر میں تجلی بیگم بھی قریب آ گئی تھیں۔ انہوں نے بھی بیٹے کو گلے لگا کر واجبی سا پیار کیا۔ اور بولیں۔

"کہاں رہ گئے تھے بیٹا؟ تمہارے پاپا تمہارے لیے کافی پریشان تھے۔"

"اور آپ مما؟؟!" طماس نے اُلٹا سوال کر دیا۔

"میں تو ماں ہوں! میری پریشانی کی انتہا اور گنتی نہیں ہو سکتی۔" انہوں نے کہا تو چاندنی نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

"ہاں تو ڈیڈی یعنی پاپا جانی! اس بار جس مہربان نے میری جان بچائی ہے' ان سے ملیے۔ آیئے آکاش بھیا!" اس نے آکاش کی طرف اشارہ کر کے بلایا' مگر آکاش کا نام تجلی بیگم پر بجلی بن کر گرا۔

یہ وہی آکاش تو ہے جس کی اُسے تلاش ہے۔ یہ وہی ہے تو یہاں سے بچ کر نہیں

جانا چاہیے۔ تجلی بیگم نے دل ہی دل میں سوچا۔ وہ آکاش کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ وہ اندازہ لگا رہی تھی کہ چال ڈھال سے کوئی شریف آدمی نہیں لگتا۔ خیر جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔ اتنی دیر میں آکاش ان کے قریب آ گیا تو اُس نے راجہ سلیم سے ہاتھ ملانے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا اور بولا۔

"ملک آکاش!"

"راجہ سلیم!" راجہ نے بھی اپنا ہاتھ گرم جوشی سے آگے بڑھایا۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ بیٹا! کہ تم نے میرے بیٹے کی جان بچائی ہے۔ میں تمہارا بے حد احسان مند ہوں۔ اگر تم کسی حملہ آور کو پکڑ کر مجھے دے دیتے تو میں اس کی ہڈیوں سے بھی اپوزیشن کے اس رُکن کا نام اگلوا لیتا' جس نے میرے بیٹے کو قتل کرنا چاہا تھا۔"

"لازمی نہیں کہ ہر غلط کام اپوزیشن ہی کرے۔ حکومت جتنے اُلٹے کام کرتی ہے' اُس سے زیادہ کوئی نہیں کرتا۔ اس روایت کو بدلنا بلکہ ختم ہونا چاہیے راجہ صاحب! مجھے فی الحال جلدی ہے۔ آپ سے بہت جلدی' بہت طویل ملاقات ہوگی' او کے بائے!"

وہ واپس جانے کے لیے مُڑا تو چاندنی بول پڑی۔

"شکریہ آکاش بھائی! میرے بھائی کی جان بچا کر آپ نے مجھ پر بہت احسان کیا ہے......"

اس نے مڑ کر دیکھا تو چاندنی آنکھوں میں آنسو لیے کھڑی تھی۔ گورا چٹا رنگ' لانبا قد اور حسین نقوش والی اس لڑکی نے اُسے بھائی کہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر چاندنی کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا اور بولا۔

"زندگی میں پہلی بار کسی مہربان رشتے سے ناطہ جُڑا ہے۔ خوش رہو میری بہنا!"

یہ کہہ کر وہ چلا آیا تو چاندنی پھر بولی۔

"پھر آؤ گے نا بھیا!"

آکاش نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ احمد رضا کو ساتھ لے کر چلا آیا جبکہ رضا اور چاندنی کی آنکھیں چار ہو گئی تھیں اور آکاش نے محسوس کر لیا تھا۔

"اچھی لڑکی ہے!" آکاش بولا۔

"اچھی آکاش بھیا! صرف اچھی نہیں بلکہ بہت اچھی۔" احمد رضا پر جوش لہجے میں

بولا تو وہ ہنس پڑا۔ وہ چلتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا تو وہ لوگ بھی اپنے اپنے کمروں میں جانے کے لیے اندر کی طرف جا رہے تھے جبکہ راجہ سلیم سب سے پیچھے تھے۔ اِن کی چال ڈھال ڈھیلی لگتی تھی۔

"یار رضا! یہ جو طماس کی امی ہے' یہ مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی۔ ایک تو ہم نے اس کے بیٹے کی جان بچائی ہے اور دوسرا اُسے گھر چھوڑنے آئے ہیں۔ انہوں نے شکریہ کہنا بھی گوارا نہیں کیا بلکہ تیوری چڑھا کر مجھے دیکھ رہی تھیں...... تم نے محسوس کیا یا مجھے ہی ایسا لگا؟" آکاش نے رضا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ رضا کوئی جواب دیتا۔ آکاش کا موبائل فون بول پڑا۔ دوسری طرف سے جونیئر تھا۔

"ہاں بھائی چھوٹے کیسے ہو؟ جنرل صاحب اور شمع کیسی ہیں؟"

"سب خیریت ہے آکاش بھائی! میں اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا ہوں۔ آپ کو وہاں نہ پا کر حیرت ہوئی۔ اس لیے فون کر دیا۔ ڈسٹرب تو نہیں کیا آپ کو؟" دوسری طرف سے جونیئر کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ارے یار جونیئر! تُو تو جانتا ہی ہے۔ ماسی کے بعد آکاش ہمیشہ ڈسٹرب ہی رہے گا۔" وہ افسردہ لہجہ میں بولا' "اچھا! تو فون بند کر' میں آ رہا ہوں!" اس نے رابطہ ختم کر کے رضا کو بتایا کہ "یہ میرا دوست ہے' اس کا نام جونیئر ہے۔ کراچی میں ہم اکٹھے ہی رہتے ہیں اور اب یہاں لاہور کی سیر کرنے آئے ہیں۔ میں پہلے آ گیا اور یہ اب بعد میں آیا ہے۔ کیا خیال ہے اب گھر چلیں؟" اس نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ بولا چلو۔ وہ ٹیکسی لے کر گھر پہنچے تو خیر دین ان کا منتظر تھا وہ ان کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر جلدی سے بولا۔

"کیا ہوا؟"

"سب کام ہماری پلاننگ کے مطابق ہو گیا ہے بابا! اب احمد طماس کو خود ہی پتہ چل جائے گا کہ اس ملک کی سیاست اپنوں کی قربانی مانگتی ہے اور سیاست دان اپنی ہاری ہوئی بازی جیتنے کے لیے وہ قربانی دینے سے دریغ نہیں کرتے۔" آکاش نے کہا اور اپنا بیگ سنبھال کر جانے لگا تو خیر دین نے حیرانی سے کہا۔

"کدھر جا رہے ہو؟ دشمن تمہاری تاک میں ہوگا۔ ابھی نہ جاؤ۔ کچھ دن تو رُک جاؤ۔"

"نہیں بابا! مجھے جانا ہے۔ میں ایک اہم مشن پورا کرنے آیا ہوں۔ کبھی ضرورت پڑی تو ضرور آؤں گا اور ہاں اگر آپ کو میری ضرورت پڑے تو اس ایڈریس پر آ جانا مجھے بہت خوشی ہوگی......" یہ کہہ کر اس نے اپنے بیگ سے پنسل اور کاغذ نکالنا شروع کر دیا۔ کاغذ تو کوئی نہ ملا مگر ماسی کی ڈائری ضرور مل گئی۔ اس نے حیرت سے ڈائری کو دیکھا اور بولا یہ بیگ میں کیسے آ گئی۔ خیر اس نے ایک کاغذ ڈائری سے نکال کر اس پر ایڈریس لکھا اور پھر بے خیالی میں باتیں کرتا ہوا ڈائری وہیں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

خیر دین کی نظر ڈائری پر پڑی تو اُس نے رضا کو کہا کہ "فوراً جاؤ' یہ ڈائری اُسے دے کر آؤ' وہ بھول گیا ہے۔" اس نے ڈائری رضا کو پکڑانا چاہی تو اس میں سے ایک تصویر نکل کر گر گئی۔ خیر دین نے تصویر اُٹھا کر دیکھا تو حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ وہ تصویر دیکھ کر بُت بن گیا تھا۔ رضا نے آگے بڑھ کر اس سے ڈائری لی اور تصویر پکڑ کر دیکھی تو اس بار حیران ہونے کی باری رضا کی تھی' کیونکہ اس تصویر میں خیر دین اور احمد طماس کی ممتا بانہوں میں بانہیں ڈال کر کھڑے مسکرا رہے تھے۔ دونوں جوانی کے عالم میں تھے۔ رضا نے حیران ہو کر بابا کو تصویر واپس کر دی اور بولا۔

"ابا آپ کی تصویر اور احمد طماس کی ممتا! یہ کیا چکر ہے بابا! آکاش کے بیگ سے......؟ یہ کیا ہے بابا۔ یہ کونسا راز ہے جو آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں۔ یہ آکاش کون ہے اس تصویر کا مقصد۔ یہ سب کیا ہے' میں پاگل ہو جاؤں گا بابا۔ پلیز مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے؟؟" اس نے ڈائری بابا سے چھین لی اور اُسے جھنجھوڑ کر بولا۔

"پلیز بابا! بتاؤ نا!" وہ رو رہا تھا جبکہ خیر دین بُت بنا کھڑا تھا۔ احمد رضا کے جھنجھوڑنے پر وہ ہوش میں آیا اور بولا' "میں تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔ بیٹھو تمہیں بتاتا ہوں۔ آج پچیس سال پرانا راز کھولنا پڑے گا مگر یہ سمجھ نہیں آئی کہ آکاش کے پاس یہ تصویر کیسے۔ یہ آکاش کون ہے' کہیں میرا کھویا ہوا بیٹا تو نہیں۔"

"آپ کا کھویا ہوا بیٹا؟ کیا میرے علاوہ آپ کا کوئی اور بیٹا بھی ہے؟" رضا حیران ہو کر بولا۔

"ہاں اس کہانی کا تانا بانا اس بیٹے کے گرد ہی گھومتا ہے۔ سنو احمد رضا سُنو۔" خیردین نے سوچتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ اس سے پہلے کہ خیردین کوئی بات کرتا' یکدم دروازہ زور زور سے بجنا شروع ہوگیا۔ دونوں باپ بیٹا حیران ہوکر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ "میرا خیال ہے' آکاش بھائی ہوں گے اپنی ڈائری لینے آئے ہوں گے۔" احمد رضا نے خیردین سے کہا اور دروازہ کھول دیا مگر اس کی سٹی گم ہوگئی' سامنے اسلحہ بردار پانچ افراد کھڑے تھے۔ ان کے خوفناک چہروں سے ہی ان کے عزائم ظاہر ہو رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے رضا کو اندر کی طرف دھکا دیا اور ساتھ ہی باقی بھی اندر آگئے۔ خیردین انہیں دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ ایک نے بھونکنا شروع کیا۔

"کہاں ہے وہ؟"

"وہ کون؟" خیردین نے حیرت سے پوچھا' حالانکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ انہی لوگوں میں سے ایک ہے' جنہوں نے آکاش پر گولی چلائی تھی۔

"زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش مت کرو' تم ایک فقیر ہو اور فقیر کی کوئی اہمیت ہماری نظر میں نہیں ہے۔ سچ سچ بتاؤ کہ وہ آکاش کہاں ہے؟" ان میں سے ایک پھر غرایا۔

"میں نہیں جانتا' کیونکہ مجھے تو یہ بھی علم نہیں کہ تم کس آکاش کا پوچھ رہے ہو؟" خیردین نے پھر جھوٹ بولا' تو ایک نے آگے بڑھ کر احمد رضا کے سر پر گن کا بٹ مارا وہ وہیں تڑپ کر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔ خیردین آگے بڑھا تو انہوں نے اُسے بھی دھکا دے کر گرا دیا اور ایک بولا۔

"شام تک اگر اس کا پتہ نہ بتایا تو تمہارے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے سمجھے!"

یہ کہہ کر وہ واپس چلے گئے تو خیردین جلدی سے رضا کی طرف لپکا۔ وہ بے ہوش ہوگیا تھا اور سر سے کافی خون بہہ چکا تھا۔ خیردین کو کچھ نہ سوجھا اس نے جلدی سے رضا کو اٹھایا اور اپنے کندھے پر لاد کر باہر نکل کر گھر کو تالا لگایا اور گلی میں دوڑ لگا دی۔ جوان بیٹے کو اٹھا کر بوڑھے باپ سے بمشکل دوڑا جا رہا تھا مگر اس وقت بیٹے کی زندگی کا سوال تھا۔ اس نے سڑک پر پہنچ کر ٹیکسی کو روکا اور فوراً ہسپتال چلنے کو کہا۔

ہسپتال پہنچ کر احمد رضا کو ایمرجنسی میں داخل کر لیا گیا تھا۔ خیردین نے بتایا تھا کہ

پتنگ بازی کرتے ہوئے چھت سے گر گیا ہے ورنہ ڈاکٹرز پولیس کیس کا کہہ کر ٹرخا دیتے۔ ڈرپ لگ گئی تھی۔ احمد رضا بیڈ پر بے ہوش پڑا تھا مگر خیردین کی ہوش اُڑی ہوئی تھی۔ آکاش اگر اس کا بیٹا ہے تو اسے ڈھونڈنا چاہیے۔ وہ ہسپتال میں ادھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا اور کبھی کبھی دروازے کے شیشے سے بیٹے کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ اس نے سوچا کہ احمد طماس کو فون کرنا چاہیے تاکہ وہ آکاش کو خبردار کر دے کہ غنڈے اس کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور اُسے ڈھونڈنے کے لیے بھوکے کتوں کی طرح دوڑ بھاگ کر رہے ہیں۔ یہ سوچ کر وہ پبلک کال آفس پہنچا جو کہ ہسپتال کے مین گیٹ پر تھا۔ اُس نے جیب سے وہ پرچی نکالی جس پر احمد طماس کا نمبر لکھا ہوا تھا۔ یہ پرچی طماس نے تب دی تھی جب رضا اور آکاش اُسے گھر چھوڑنے گئے تھے۔ اس نے نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیا۔

دوسری طرف بیل بج رہی تھی۔ کسی نے فون اٹھا کر ہیلو کہا تو خیردین کا دل حلق سے اُچھل کر باہر آ رہا تھا۔ بمشکل قابو کیا' وہ ہزاروں میں تجلی کی آواز پہچان سکتا تھا۔

"ہیلو! ہیلو! اگر بات ہی نہیں کرنی ہوتی تو کیوں فون کرتے ہو؟ میرا ٹائم بہت قیمتی ہے۔" خیردین نے ڈرتے ڈرتے کہا' "ہیلو!"

دوسری طرف تجلی بیگم کو بھی جھٹکا لگا مگر وہ سنبھل کر بولی' "کون بول رہا ہے اور کس سے بات کرنی ہے؟"

"جی مجھے احمد طماس صاحب سے بات کرنی ہے۔" خیردین نے عاجزی سے کہا۔

"احمد طماس کے موبائل پر رنگ کریں' وہ اس وقت گھر پہ نہیں ہے۔ اپنا نام بتا دیں میں آپ کا پیغام پہنچا دوں گی۔ ہوسکتا ہے آپ کی اس سے ملاقات نہ ہو۔" دوسری طرف سے خلاف توقع شیریں لہجہ میں کہا گیا۔

"تو پھر احمد طماس سے کہیئے گا کہ تمہارے انکل ملک رب نواز کا فون تھا۔" یہ کہہ کر خیردین نے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ وہ لبوں پر شرارتی مسکان لیے واپس بیٹے کی طرف آیا۔ وہ جانتا تھا کہ اتنے سالوں بعد ملک رب نواز کا نام سن کر اور پھر رشتے کا حوالہ سن کر تجلی بیگم کے ہاتھوں سے ریسیور گر گیا ہوگا۔ وہ تصور ہی تصور میں دیکھ رہا تھا کہ تجلی بیگم اپنی ساڑھی کے پلو سے اپنا پسینہ خشک کر رہی ہے۔ خیردین خیالوں سے نکل آیا۔ وہ

لبوں پر شریری مسکراہٹ سجائے بیٹے کو دیکھ رہا تھا' جواب ہوش میں آ چکا تھا اور ڈاکٹرز اُسے چیک کر رہے تھے۔ وہ اندر داخل ہوا تو ڈاکٹر نے اُسے دیکھ کر کہا کہ تم اپنے بیٹے کو لے جاسکتے ہو یہ بالکل ٹھیک ہے۔ بس خوراک کی کمی ہے۔ اسے گوشت اور انڈے کھلاؤ تا کہ اس کی توانائی بحال ہوسکے۔ وہ دونوں باپ بیٹا کاؤنٹر پر آئے بل ادا کیا اور باہر کی طرف چل پڑے۔ احمد رضا کافی کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ خیر دین نے اُسے بانہوں کا سہارا دے رکھا تھا۔

''بابا میرا خیال ہے اب اپنے گھر کی بجائے ہمیں آکاش کے گھر جانا چاہیے' کہیں وہ لوگ دوبارہ آ گئے تو خون خرابہ ہوگا۔'' احمد رضا نے اپنا خدشہ ظاہر کیا تو خیر دین بھی چونک کر اُسے دیکھنے لگا اور جلدی سے بولا: ''ہاں یہ ٹھیک ہے' وہیں چلتے ہیں۔''

اُس نے ایک ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا' ٹیکسی پاس آ کر رکی تو احمد رضا نے آگے بڑھ کر اُسے آکاش کا پتہ بتایا اور چلنے کو کہا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے چونک کر خیر دین کی طرف دیکھا اور بولا۔

''یہ بزرگ بھی تمہارے ساتھ جائے گا؟'' تو احمد رضا حیرت سے مسکراتا ہوا بولا۔

''ہاں کیونکہ یہ بزرگ میرا باپ ہے۔'' یہ کہہ کر اُس نے خیر دین کو کہا کہ وہ گاڑی میں بیٹھے۔ خیر دین نے ڈرائیور کو نہ دیکھا تھا مگر بیک مرر سے ڈرائیور اسے آنکھ بچا کر دیکھتا تھا جبکہ خیر دین باہر کا نظارہ کرنے میں مصروف تھا۔ آکاش کے گھر کے سامنے گاڑی پہنچ کر رک گئی تو ڈرائیور جلدی سے اتر کر اس طرف آیا جس طرف خیر دین بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے تیزی سے اس طرف کا دروازہ کھولا تو خیر دین حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا کیونکہ پچیس سال بعد کسی نے اس کے لیے ملک گام کی طرح دروازہ کھولا تھا۔ وہ حیران ہو کر ڈرائیور کی طرف دیکھ رہا تھا جبکہ ڈرائیور مسکرا کر اُسے اپنی بانہوں میں بھرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ خیر دین نے اُسے پہچان لیا اور آگے بڑھتا ہوا بولا۔

''ملک غلام عرف ملک گام! تم میرے یار' میرے جگر! تم یہاں؟'' یہ کہہ کر وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ احمد رضا حیرت سے یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا اور سمجھ گیا تھا کہ ڈرائیور خیر دین کا پرانا یار ہے جو اتنے برسوں بعد ملا ہے۔ وہ ایک دوسرے کا حال دریافت کر رہے تھے کہ

اندر سے آکاش نکل آیا۔ وہ کہیں تیار ہو کر جا رہا تھا کہ انہیں دیکھ کر حیران ہوگیا۔

''ارے آپ لوگ غیروں کی طرح باہر کیوں کھڑے ہیں؟ اندر آؤ بابا' رضا' جلدی کرو! باہر کیوں دیر لگا دی ہے؟ تمہارا اپنا گھر ہے......'' گام بھی اُن لوگوں کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔ اچھی خاصی کوٹھی تھی۔ بہت اعلیٰ اور نفیس فرنیچر پڑا ہوا تھا۔ وہ حیرانی سے دیکھ رہے تھے کہ اندر سے ایک ٹھگنے قد کا آدمی برآمد ہوا۔ آکاش نے تعارف کروایا کہ یہ جونیئر ہے' میرا دوست۔ اور جونیئر یہ رضا ہے میرا بھائی۔ یہ میرا بابا اور یہ بابا کے دوست ہیں۔ جلدی سے کھانے پکانے کا بندوبست کرو۔ بابا آپ لوگ آج یہیں رہیں گے میرے پاس۔ میں باہر جا رہا ہوں۔ اور جلد ہی لوٹ آؤں گا۔ آپ لوگ بے فکر ہو کر یہاں رہیں اور ہاں گام چاچا میں آپ کی ٹیکسی لے کر جا رہا ہوں' فکر تو نہیں ہوگی' آپ کو؟'' آکاش نے کہا تو گام مسکرا کر خیر دین کی طرف دیکھنے لگا اور بولا۔

''تم خیر دین کے بیٹے ہو تو میرے بھی بیٹے ہو۔ ایسی سو گاڑیاں تم پر قربان پُتر!''

وہ بے دھیانی میں کہہ گیا تھا۔ رضا نے آکاش کو آواز دی تو وہ جاتے جاتے رُک گیا۔

''آکاش بھائی اپنا خیال رکھیے گا۔ یہ میرے سر کی حالت تمہارے ان دشمنوں نے کی ہے جو میرے گھر تمہارا پتہ پوچھنے آئے تھے۔ انہوں نے بابا کو بھی مارا ہے۔'' رضا نے بتایا تو آکاش نے اُس کے سر کی طرف دیکھا جس پر پٹی تو بندھی ہوئی تھی مگر اس پر رومال باندھ کر خیر دین نے پٹی کو چھپا دیا تھا۔ تبھی تو آکاش پہلی نظر میں نہ دیکھ سکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ وہ تیزی سے گھر سے نکلا تھا' خیر دین اور رضا گام کے ساتھ خوش گپیاں کرنے لگے جبکہ آکاش گاڑی بھگا کر ہیرا منڈی کی طرف لے جا رہا تھا۔ کافی دن ہو گئے تھے' وہ لاڈو' کاجل' ملہوترہ' اور تجلی بیگم سے نپٹنا چاہتا تھا۔ وہ لوگ یقیناً باخبر تھے جو آکاش کا پتہ چلانے کے لیے انہوں نے خیر دین کے گھر دھاوا بول دیا تھا۔ آج اُس کے مخبر نے خبر دی تھی کہ کاجل اور لاڈو ایک ہوٹل کے کمرہ نمبر ایک سو نو میں رہ رہی ہیں اور میڈم تجلی نے انہیں آکاش کے خوف سے وہاں چھپا رکھا ہے۔ وہ سیدھا ہوٹل کی پارکنگ میں پہنچا۔ ٹیکسی کھڑی کرنے کے بعد وہ باوقار انداز میں چلتا ہوا اپنے کوٹ کی جیبیں تھپتھپاتا اندر داخل ہوا تو ریستوران میں رش نہ ہونے کے برابر

تھا۔ ہال میں بچھی کرسیوں پر اِکا دُکا لوگ بیٹھے ہوئے تھے' جو کافی معزز اور بزنس مین لگ رہے تھے کیونکہ یہ فائیو سٹار ہوٹل تھا یہاں للو پنجو کا تو کام نہ تھا۔ وہ اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا ہوا ریسپشن پر پہنچا تو خوبصورت لیڈی ریسپشنسٹ نے دلفریب مسکراہٹ سے اُس کا استقبال کیا۔"جی فرمایئے سر!"

"دیکھیں یہاں میری دوست مجھ سے ناراض ہو کر آ گئی ہیں اور آپ کے ہوٹل میں رہ رہی ہیں۔ ذرا پلیز لسٹ چیک کریں اور دیکھیں کہ کمرہ نمبر ایک سو نو میں کون ٹھہرا ہے؟" آکاش نے جھوٹی کہانی سنائی تو لڑکی فوراً ہوٹل کی بکنگ کا رجسٹر دیکھنے لگی اور بولی۔

"سر! یہ کمرہ تو میڈم تجلی کے نام پر بک ہے اور وہ ابھی ابھی باہر گئی ہیں۔"

"اوہ تو مجھے غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ ذرا میں یہ لسٹ دیکھ سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں سر!" یہ کہہ کر لڑکی نے رجسٹر اُس کے سامنے کر دیا۔ انگلش میں تمام نام لکھے ہوئے تھے۔ اس نے خوامخواہ ہی ایک عورت کا نام پڑھ کر کہا۔

"ڈھونڈ لیا۔ یہ دیکھیں یہ کمرہ نمبر ایک سو بیس میں۔" اس نے ایک نام پر انگلی رکھ دی۔

"اچھا تو یہ آپ کی دوست ہیں مگر یہ تو کافی اوور ایج ہیں۔" لڑکی حیرت سے بولی۔

"وہ ایکچولی میری آنٹی ہیں اور آنٹی کم اور دوست زیادہ ہیں۔ پلیز آپ انہیں انٹر کام سے مت بتایئے گا۔ میں انہیں سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔ پلیز۔ کسی ویٹر کو بھیجیے تاکہ مجھے آسانی رہے۔"

آکاش ویٹر کے ساتھ کمرہ نمبر ایک سو بیس کی طرف جا رہا تھا۔ راہداری میں وہ کمروں کے نمبرز پر نظریں ڈالتا ہوا آگے بڑھا جب وہ ایک سو نو کے آگے سے گزرا تو اس کا دل زور سے دھڑکا۔ اس کے دو شکار یہاں موجود تھے۔ اس نے راہداری میں تھوڑا سا آگے جا کر ویٹر کو سو کا نوٹ نکال کر دیا اور اُسے رخصت کر دیا۔ ویٹر کے جانے کے بعد اس نے آگے پیچھے نظر دوڑائی۔ اُسے کوئی نظر نہ آیا تو اس نے ایک سو نو کے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک پر اندر سے آواز آئی' "کون ہے؟"

"میڈم! میں ہوں ویٹر۔ آپ کے لیے میڈم کا پیغام ہے۔" اس نے جان بوجھ کر تجلی کا نام نہیں لیا تھا' کیونکہ تجلی بیگم کا بہت رعب اور دبدبہ تھا۔ اور ایک معمولی ویٹر ان کا نام لے۔ یہ بات خلاف اصول تھی۔ دروازہ کھل گیا' سامنے ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی۔ ایک مرتبہ تو آکاش کو چاندنی کی جھلک دکھائی دی' مگر پھر اس نے سر جھٹک دیا۔ اور اندر داخل ہو کر اندر سے کنڈی لگا لی تو لڑکی حیرت سے اُسے دیکھنے لگی۔ اس سے پہلے کہ آکاش سنبھلتا اور کوئی کارروائی کرتا' پیچھے سے کسی نے اُسے دھکا دیا وہ منہ کے بل سامنے گر گیا اور تیزی سے پلٹا تو سامنے ایک مرد ہاتھ میں پسٹل لیے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"ویلکم مسٹر آکاش!" اُس نے کہا تو آکاش کے ہوش اُڑ گئے۔

وہ اپنے حواس پر قابو پاتا ہوا بولا۔

"آپ کو کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو ویٹر ہوں اور کاجل میڈم کو میڈم کا پیغام دینے آیا ہوں۔ یہ آکاش کون ہے میں نہیں جانتا اور سر یہ پسٹل...... پلیز سر! اسے جیب میں ڈال لیں۔ مجھے ان سے بہت ڈر لگتا ہے۔ صاحب پلیز!" وہ بچوں کی طرح کرنے لگا جیسے اس نے کبھی پسٹل نہ دیکھا ہو' بس سنا ہو کہ اس سے گولی چلتی ہے۔

"اپنے ہاتھ اوپر اُٹھا لو مسٹر آکاش! کیونکہ میرے ساتھ ایکٹنگ کا شوق تمہیں مہنگا پڑے گا۔ میرا نام ملہوترہ ہے۔ ملہوترہ۔ انڈیا میں مجھے اکھا انڈیا کالی موت کے نام سے یاد کرتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے فائر کر دیا' گولی آکاش کی ٹانگ میں لگی۔ وہ درد سے کراہ کر بیٹھ گیا۔ وہ گھسٹتا ہوا کمرے کے کنڑ میں چلا گیا' تو لڑکی بول پڑی۔

"تمہارا تو بہت دنوں سے انتظار تھا ہمیں آکاش! تمہاری تصویریں ہمارے پاس موجود ہیں۔ ہم تمہیں پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کر سکتے۔ ملہوترہ اسے گولی مار کر ختم کر دو اور ممتا کے آنے تک اس کی لاش تحفہ میں دینے کے لیے سنبھال رکھنا۔ اس سے پہلے کہ ملہوترہ دوسری گولی چلاتا' کمرے کی ایک سائیڈ سے باتھ روم کا دروازہ کھلا اور اندر سے نکلنے والی عورت جو یقیناً نہا کر نکلی تھی' اُس کے سر پر تولیہ لپٹا ہوا تھا۔ وہ ملہوترہ اور آکاش

کے درمیان آ گئی۔ اسی اثناء میں ٹریگر دبا اور گولی عورت کے سینہ میں گھس گئی۔ لاڈو لاڈو! مگر لاڈو نے لڑکی کی آواز نہ سنی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اگلی دنیا میں پہنچ گئی تھی۔ یہ موقع آکاش کے لیے بہت تھا۔ اس سے پہلے کہ ملہوترہ سنبھلتا اور تیسرا فائر کرتا' آکاش کے ریوالور نے شعلے اگلے' پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا تھا اور ملہوترہ کے ہاتھ سے خون کے فوارے نکل کر قالین کو مزید سرخ کر رہے تھے۔ لڑکی اور ملہوترہ حیران تھے۔ ملہوترہ نے صوفے کے پیچھے چھلانگ لگائی اور پسٹل پکڑنے کی کوشش کی مگر اتنی دیر میں آکاش نے لڑکی کو یرغمال بنا لیا تھا۔ اس نے ریوالور اس کی کنپٹی پر رکھ کر ملہوترہ کو باہر نکلنے کے لیے کہا مگر ملہوترہ کی طرف سے اندھا فائر ہوا جو سامنے دیوار میں جا لگا۔

''دیکھو ملہوترہ! یہ لڑکی میری گرفت میں ہے۔ مرنے والی کو اس نے لاڈو کہہ کر پکارا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ کاجل ہے کیونکہ اس نے میڈم کو بھی اپنی ممتا کہا ہے۔ تم میری تصویریں جیبوں میں لے کر گھومتے ہو مگر میرا نام آکاش ہے۔ میں تمہارا مکمل بائیو ڈیٹا دماغ میں لے کر گھر سے نکلا ہوں۔ میں تین تک نہیں گنوں گا کیونکہ میرے پاس وقت نہیں ہے اور تمہارے پسٹل کے فائروں کی آواز سن کر ہوٹل انتظامیہ بھی آتی ہوگی۔ اگر تم ابھی باہر نہ نکلے تو میں اس لڑکی کو کھڑکی سے باہر پھینک دوں گا اور مجھے ذرہ برابر بھی دکھ نہ ہوگا۔ جلدی کرو۔''

''ملہوترہ! باہر نکل آؤ۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔ مجھے بلندی سے خوف آتا ہے۔ پلیز ملہوترہ!'' کاجل چلا اٹھی۔ تو صوفے کے پیچھے سے ملہوترہ کے ہاتھ بلند ہوئے اور پھر وہ آہستہ آہستہ اٹھتا صوفے کے پیچھے کھڑا ہو گیا تو آکاش بولا۔

''گڈ ملہوترہ! تم نے گولی کھا کر مرنے سے اپنے آپ کو بچا لیا ہے...... تو تمہیں بہت شوق ہے اس ملک کی جوان اور خوبصورت عورتوں کی عزت سے کھیلنے کا۔ انہیں اپنی جھوٹی محبت کے جال میں پھنسا کر' شادی کا ڈرامہ رچا کر' پھر ہنی مون کا بہانہ بنا کر'

انہیں انڈیا لے جا کر' ان طوائفوں کے ہاتھوں میں بیچ دیتے ہو' جو گوشت کا دھندہ کرتی ہیں۔ انسانی گوشت اور وہ بھی زندہ گوشت۔ اتنے جرم ملہوترہ! تم نے کیسے سوچ لیا کہ یہاں کوئی غیرت مند نہیں ہے؟ یہ بے غیرت عورت تو تمہارے ہی ہاتھوں انجام کو پہنچ چکی ہے۔ اب تمہاری باری ہے' اور پھر اس چکنی کاجل کی جو اس مکروہ کام میں تمہاری شریکِ جرم ہے۔ حیران ہوں میں کہ ایک عورت دوسری عورت کی عزت کا سودا کیسے کر سکتی ہے' مگر تم طوائف زادی ہو تمہارے لیے یہ کاروبار ہے اور میرے لیے یہ جرم ہے۔ لہٰذا آکاش کی عدالت تمہیں سزائے موت سناتی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ملہوترہ کے سینے میں دو گولیاں اتار دیں۔ وہ آہ کی آواز نکالتا ہوا صوفے پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ کاجل کی چیخ نکل گئی۔ اس نے کاجل کو دھکا دے کر سامنے فرش پر گرایا۔ یہاں دبیز قالین نے اسے کوئی چوٹ نہ لگنے دی۔ وہ نیچے گر گئی اور آکاش کے پاؤں پکڑ لیے۔

''مجھے معاف کر دو۔ آکاش! مجھے معاف کر دو' پلیز تمہیں تمہاری ماں کا واسطہ۔ پلیز آکاش بھائی! پلیز مجھے چھوڑ دو۔ میں آئندہ ایسا کوئی کام نہیں کروں گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔ یہ۔ یہ تو تمام ممتا نے کیا ہے' ان کا قصور ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا' پلیز آکاش بھائی پلیز!'' وہ ہذیانی انداز میں رو رہی تھی۔ آکاش نے نیچے جھک کر اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور وہ چیختی ہوئی اٹھ گئی۔

''اپنی ماں کو میں نے نہیں دیکھا۔ لہٰذا اس کا واسطہ مت دینا اور مجھے بھائی بھی مت کہنا کیونکہ ایک طوائف میری بہن نہیں ہو سکتی۔ اگر ہوتی بھی تو خدا کی قسم اسے آگ میں زندہ جلا دیتا۔ مجھے بھائی مت کہو' یہ کہہ کر اس نے ایک تھپڑ اس کے رخسار پر رسید کر دیا۔ تھپڑ اتنا شدید تھا کہ انگلیوں کے نشان اس کے گال پر پڑ گئے۔ وہ رونے لگی اور دہشت زدہ ہو کر آکاش کی طرف دیکھنے لگی۔ ''اب تمہاری سزا یہ ہے کہ خود ہی اس کھڑکی سے باہر کود جاؤ' میں عورتوں پر ظلم نہیں کرتا۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ ابھی تمہاری اس گشتی ماں سے بھی حساب کتاب کرنا ہے۔ جلدی کرو' اس سے پہلے کہ پولیس

آ جائے۔ جلدی ہری اپ! کم آن کوئیک اپ!'' اس نے روتی اور ڈری ہوئی کاجل کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور کھڑکی کے پاس لے جا کر چیختی چلاتی کاجل کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ وہ نیچے آ کر ابھی گری نہ تھی کہ ایک کار آ کر رُکی۔ اس میں سے میڈم تجلی نکل کر ابھی پاس ہی کھڑی ہوئی تھی کہ دھپ سے کاجل کار کی چھت پر گری۔ میڈم کی چیخ نکل گئی۔ کاجل نے لمبی لمبی سانسیں لیں مگر مزید مہلت نہ تھی کیونکہ ہوٹل کی آٹھویں منزل سے نیچے دیکھتے ہی روح فنا ہو جاتی تھی۔ بھلا زندگی کیسے مہلت دیتی کہ وہ جو اوپر سے گری تھی دو چار باتیں کر لیتی۔ میڈم دہشت زدہ انداز میں اپنی بیٹی کی لاش دیکھ رہی تھی۔ اُسے سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ دل پکڑ کر وہیں گر گئی۔ ارد گرد لوگ اکٹھے ہو گئے تھے اور طرح طرح کی بولیاں بول رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ پولیس وہاں آتی آکاش نے جیب سے رومال نکال کر اپنی ٹانگ پر کس کر باندھا۔ وہ حتی الوسع کوشش کر رہا تھا کہ لنگڑا کر نہ چلے۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اُتر رہا تھا جبکہ ہوٹل میں نفسانفسی کا عالم تھا۔ ہر کوئی اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا۔ ہال میں داخل ہونے کے بعد آکاش بھی رش میں شامل ہو گیا۔ لوگ تجلی کی گاڑی کے ارد گرد جمع تھے جبکہ تجلی بیگم بے ہوش تھیں۔ وہ جلدی سے اپنی ٹیکسی میں بیٹھا اور اسے بھگاتا ہوا لے گیا۔ یہی ایک بات اس کے حق میں جاتی تھی کہ اس ملک میں کتنا بھی بڑا سانحہ ہو جائے پولیس ہمیشہ دیر سے آتی ہے۔ وہ با آسانی نکل گیا تھا۔ اس نے گھر جا کر گاڑی گیراج میں کھڑی کر کے جلدی سے باہر نکلنا چاہا تو خیر دین اور رضا پر نظر پڑی جو لان میں بیٹھے کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ وہ مسکراتا ہوا اُن کے پاس آیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور جونیئر کو آواز دی۔ جونیئر کے آنے پر اس نے کہا کہ:

''ایک خنجر اور گولی نکالنے کا سامان لے کر فوراً آ جاؤ۔'' جونیئر واپس مڑ گیا۔

''گولی! کس کی گولی نکالنی ہے؟'' کیا بات ہے بیٹا! مجھے بتاؤ'' خیر دین کے چہرے پر فکر کی پرچھائیاں رقص کرنے لگیں تو آکاش مسکرا پڑا۔

''آکاش بھائی! کیا ہوا؟ آپ کہاں سے آ رہے ہیں اور یہ گولی کا کیا چکر ہے؟'' رضا نے بھی پوچھا تو اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''میں کراچی سے ایک اہم کام مکمل کرنے کے لیے آیا ہوں۔ اس کام میں میری جان بھی جا سکتی ہے۔ آج اس کام کا آخیر ہو جانا تھا مگر میڈم!'' آہ وہ کراہ کر رہ گیا۔ اندر کی طرف سے جونیئر ملک گام کے ساتھ آتا ہوا دکھائی دیا۔ آکاش نے آنکھیں بند کر لیں۔

''جلدی کرو جونیئر!'' اس نے کہا تو جونیئر کے ہاتھ مشینی انداز میں چلنے لگے۔ گام نے بھی اس کی مدد کی۔ بالآخر گولی نکال کر پٹی کر دی گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

''آپ لوگ خوانخواہ ہی فکر کر رہے تھے۔''

''تم اندر جا کر آرام کرو بیٹا!'' خیر دین فکر مند تھا۔

''کوئی بات نہیں۔ آپ لوگ اپنی باتیں کریں۔ میں یہاں آپ کے ساتھ بیٹھنا چاہتا ہوں اور ہاں بابا! وہ میں جب آپ کے گھر میں ڈائری سے کاغذ نکال کر لکھ رہا تھا' مجھے لگتا ہے وہ ڈائری وہیں رہ گئی ہے۔ اُسے سنبھال کر رکھیئے گا۔ وہ میری امانت ہے آپ کے پاس اور میرے پاس میری ماسی کی امانت ہے۔ میں حیران ہوں کہ میرے بیگ میں کیسے آ گئی......'' آکاش نے کہا تو خیر دین کا رنگ زرد ہو گیا۔ وہ تو نہ بولا مگر احمد رضا بول پڑا۔

''آکاش بھائی! آپ نے وہ ڈائری کھول کر نہیں دیکھی یا نہیں پڑھی؟''

''مجھے ضرورت ہی نہیں پڑی۔ کیوں کوئی خاص بات ہے اس میں۔'' وہ حیرت سے بولا۔

''بابا کے لیے کچھ خاص ہے۔'' رضا نے کہا تو آکاش نے آنکھیں اچھی طرح کھول لیں اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''بابا کے لیے بھلا اس ڈائری میں کیا ہو سکتا ہے؟''

''تم کراچی کہاں کے رہنے والے ہو آکاش پُتر؟'' اس بار گام نے سوال کیا تو وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ہنستا ہوا بولا۔

''مجھے لگتا ہے کہ آپ تمام لوگ صحافی ہیں اور میں نے کوئی پریس کانفرنس بلائی ہے۔ سوال پر سوال کیے جا رہے ہیں۔ خیر' میں کراچی کے صفورا گوٹھ کا رہنے والا ہوں کیونکہ جب سے آنکھ کھولی ہے' وہیں تھا اور ماسی کی شکل دیکھی۔'' وہ خاموش ہوا تو گام پھر بول پڑا۔

''اُس ماسی کا نام بتا سکتے ہو؟''

''ہاں' اس نے میری اپنی سگی اولاد کی طرح پرورش کی ہے۔ وہ کہتی تھی کہ میں اس کا سگا بیٹا نہیں ہوں۔ مگر میرے لیے وہ بہت پریشان ہوتی تھی جیسے میری سگی ماں ہو۔ بے چاری میری ایک بات سے ناراض ہو گئی۔ مجھ سے روٹھ گئی چاچا! مجھ سے روٹھ گئی! اب کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں اُسے؟'' وہ رونے لگا۔ تمام لوگ حیران ہو کر اسے دیکھ رہے تھے' یک لخت خاموشی چھا گئی۔ احمد رضا بولا۔

''آکاش بھائی! جس ماسی نے آپ کی اپنے بچے کی طرح پرورش کی' اتنی مہربان عورت کا نام نہیں بتاؤ گے؟''

''ماسی جانو تھا اس کا نام!'' یہ نام سنتے ہی گام اور خیر دین کے غباروں سے ہوا نکل گئی۔ وہ ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے مگر دوسرے لمحے آکاش اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔

''میرے لیے وہ مہربان ماسی جانو تھی مگر کئی سال گزرنے کے بعد ایک ابلیس کے بچے نے اس کا ماضی کھنگالا اور وہ اپنے ماضی میں صنم بائی کے نام سے جانی جاتی تھی۔''

یہ سننا تھا کہ خیر دین اور گام دونوں کرسیوں سے ایسے اٹھے جیسے ان میں کرنٹ دوڑ رہا ہو۔ آکاش اور احمد رضا انہیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

''آپ لوگ بیٹھ جائیں اور جو بھی بات ہے اُسے کھل کر کریں میں آپ کا اپنا ہوں' اگر آپ سمجھیں تو! آکاش نے کہا تو خیر دین کی آنکھوں نے برسات کی جھڑی لگا دی۔ احمد رضا اور آکاش اُسے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اٹھ کر آکاش کی کرسی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور روتا ہوا بولا۔

''اس دل نے برسوں تمہارا انتظار کیا ہے' ان آنکھوں نے' ان آنکھوں نے تمہیں دیکھنے کے لیے برسوں..... برسوں بلکہ صدیوں تمہاری راہ دیکھی ہے۔ سارے ملک کی خاک چھانی ہے میں نے۔'' خیر دین بول رہا تھا اور آکاش اسے دیکھ کر اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ دونوں باپ بیٹا آمنے سامنے کھڑے تھے۔ خیر دین پھر بولا۔

''آکاش پُتر! اگر تم وہ ڈائری پڑھ لیتے تو اتنی دور نہ کھڑے ہوتے بلکہ ابا کہہ کر میرے سینے سے لگ جاتے۔''

''ابا! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ پلیز ان پہیلیوں کو مت بجھوائیں' ساری بات کھل کر کہیں۔ آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں.....'' آکاش نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

خیر دین نے جیب سے ڈائری نکالی اور اس میں سے وہ تصویر نکلی اور آکاش کے سامنے کر دی۔ وہ تصویر دیکھ کر ایک مرتبہ پھر کھڑا ہو گیا۔ وہ کبھی تصویر کی طرف اور کبھی خیر دین کی طرف دیکھتا تھا!! یہ تو آپ لگتے ہیں اور یہ عورت ...... یہ عورت......!'' وہ ذہن پر زور دینے لگا۔ اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور بولا۔ ''یہ عورت تو احمد طماس کی ممّا ہے۔''

''نہیں پُتر! یہ عورت تمہاری ماں ہے۔ یہ تمہاری ماں ہے آکاش پتر! یہ فقیر جو تمہارے سامنے کھڑا ہے' تمہارا باپ ہے۔ تمہارا باپ ملک رب نواز۔ یہ عورت تمہاری ماں ہے جس کا نام تجلی بیگم ہے......'' خیر دین نے کہا تو آکاش پر بجلی گر پڑی۔ احمد رضا بھی حیران ہو کر اُن دونوں کی صورتیں دیکھنے لگا۔ گام نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے اُسے کندھے سے پکڑ کر کرسی پر بٹھایا۔ وہ رونے لگا اور روتے ہوئے بولا۔

"بابا! پھر میں کون ہوں؟"

"تم میرے چھوٹے بیٹے ہو۔"

"کیا میں بھی تجلی بیگم کا...... میرا مطلب ہے کیا میں احمد طماس کا بھائی ہوں؟"

"نہیں تم فکر مت کرو۔ وہ بات نہیں ہے جو تم سوچ رہے ہو۔ آکاش پُتر! تمام کہانی تمہیں ملک گام سنائے گا کیونکہ یہ میرا سایہ تھا۔ یہ الف سے لے کر ے تک جانتا ہے۔ رضا تم بھی اور آکاش تم بھی میرے بیٹے سکون سے سُنو۔"

"سندھ کے ایک علاقے میں، جس کا نام عصمت گوٹھ تھا، اس میں تمہاری پیدائش ہوئی تھی۔ شروع سے سناتا ہوں تاکہ کوئی بھی بات تم سے مخفی نہ رہ جائے۔ پھر بھی کوئی بات نہ سمجھ میں آئے تو پوچھ لینا......" ملک گام نے کہنا شروع کیا۔

"ملک عصمت کے تین بیٹے تھے۔ بہت لمبی چوڑی جاگیر، کئی باغات، زمینیں اور لہلہاتی فصلیں اور اناج سے بھرے کھیت ملک عصمت کی ملکیت تھے۔ یہ تمام جائیداد باپ کی وفات کے بعد ان کے حصہ میں آئی تھی کیونکہ وہ اکلوتے وارث تھے۔ انہوں نے بڑی ہمت اور سمجھ داری سے تمام نظام سنبھال لیا۔ اللہ نے انہیں تین بیٹوں سے نوازا تھا۔ بڑے کا نام ملک رب نواز، منجھلے کا نام ملک شیر علی اور چھوٹے کا نام ملک حاکم تھا۔ تینوں بیٹے گوٹھ سے دور کالج میں پڑھتے تھے۔ گاڑی اُنہیں لے کر جاتی اور کالج سے لے کر آتی تھی۔ تینوں بھائی بہت لائق اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر نمبر لینے کی کوشش میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ سلوک اور بھائی چارہ اتنا تھا کہ چھوٹے بھائی کوئی بھی کام بڑے یعنی ملک رب نواز سے پوچھے بغیر نہ کرتے تھے جبکہ بڑے ملک صاحب بھی کہا کرتے تھے کہ رب نواز میرا دایاں بازو ہے اور یہ بات کبھی کبھی شیر علی کو بُری لگتی تھی مگر باپ کے رعب اور خوف کی وجہ سے کوئی بات نہ کرتا تھا۔ ملک عصمت کی علاقہ بھر میں بہت عزت اور وقار تھا۔ گوٹھ کے تمام فیصلے ملک عصمت نے کرنے ہوتے تھے۔ کسی کی زمین جائیداد کا جھگڑا، کسی کی بہو بیٹی کی رخصتی اور غرض کہ

کوئی بھی کام ہوتا بڑے ملک صاحب اپنا سمجھ کر وہ کام نپٹا دیتے تھے۔ گوٹھ بھر میں ان کی عزت اور احترام مثالی تھا۔ تمام لوگ نگاہیں نیچی کر کے اور سر جھکا کر ان کے ہر حکم اور ہر فیصلے پر آمین کرتے تھے اور کوئی بھی فیصلہ ملک عصمت نے کر دیا تو کسی صورت بدل نہ سکتا تھا۔ سب کو وہ فیصلہ ماننا پڑتا تھا۔ اسی طرح دن اچھے طریقے سے گزرتے جا رہے تھے۔ رب نواز نے بی اے کر لیا تو گوٹھ میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔ گوٹھ کے سکول میں بھی ملک عصمت نے اچھا انتظام کروایا تھا۔ وہ سکول ٹیچرز کو اپنی گرہ سے تنخواہ دیتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ گوٹھ میں کوئی بھی گھر ایسا نہ ہو جس میں اندھیرا ہو۔ وہ ہر گھر میں تعلیم اور علم کی شمع کو روشن کرنا چاہتے تھے اور اس کاوش میں کسی حد تک کامیاب بھی رہے تھے۔ اب اس پرائمری سکول کو ہائی سکول کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ گوٹھ کی بچیاں اور بچے علیحدہ علیحدہ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو رہے تھے۔ رب نواز کے بی اے کرنے پر گوٹھ میں خوشی کا سماں تھا۔ آتش بازی اور طرح طرح کے جشن کیے گئے تھے۔ رب نواز گوٹھ کا واحد اور پہلا نوجوان تھا جس نے بی اے کیا تھا۔ بڑے ملک کا سر مزید اونچا ہو گیا تھا۔ انہوں نے رب نواز کی خواہش پر اُسے کراچی شہر میں یونیورسٹی میں داخل کروا دیا تھا۔ شیر علی اور حاکم ابھی کالج میں پڑھتے تھے۔ یونیورسٹی جانے کے لیے رب نواز کے لیے علیحدہ گاڑی خریدی گئی جس کا ڈرائیور ملک غلام محمد عرف ملک گام یعنی کہ میں تھا۔ میں روزانہ ملک رب نواز کو یونیورسٹی لے جاتا اور لے آتا تھا۔ ملک عصمت کی بیوی حاجرہ جو کہ ان پڑھ تھیں مگر سمجھدار اور سُگھڑ خاتون تھیں، انہوں نے کبھی بھی ملک عصمت کے معاملات میں ٹانگ نہ اڑائی تھی بلکہ شوہر پرستی کی انتہا یہ تھی کہ اگر ملک صاحب نے کہا کہ ایک ٹانگ پر کھڑی رہو تو یونہی رات گزار دی کیونکہ وہ بھول جاتے تھے اور کئی بکھیڑے انہیں سمیٹنے پڑتے تھے۔ حاجرہ نے شوہر پرستی کا حق ادا کر دیا تھا۔ وہ ملک عصمت کی بہت خدمت کرتی تھیں۔ ملک صاحب بھی ان سے بہت پیار کرتے

تھے۔کبھی کوئی مسئلہ ہوتا تو وہ ان پڑھ عورت اپنی عقل سے ملک صاحب کو مناسب مشورہ دے دیتی اور واقعی وہ مفید مشورہ ملک کے لیے بہتر ثابت ہوتا تھا۔انہوں نے ایک دو مرتبہ دبے دبے الفاظ میں کہا تھا کہ بی اے کے بعد رب نواز کو جاگیر کا نظام سنبھالنا چاہیے مگر ملک عصمت نے ان کی بات جھٹلا دی اور بولے کہ بچے کیا سوچیں گے کہ باپ خود تو پڑھا لکھا نہ تھا ہمیں بھی اپنے جیسا گنوار رہنے دیا۔پڑھنے دے حاجرہ' کام کاج کے لیے بہتیرے لوگ موجود ہیں جو اچھا کام کر رہے ہیں۔تو بچوں کو تعلیم حاصل کرنے دے۔وہ بے چاری عورت گونگوں بہروں کی طرح زندگی گزارنے لگی۔وہ بچوں کو دیکھ کر' بہت خوش ہوتی تھی۔تینوں بیٹے انہیں سلام کرنے کے بعد پڑھنے جاتے تھے۔

ملک رب نواز اپنی کلاس میں سے نکلا تو دروازے میں کسی سے ٹکرا گیا۔سامنے والے کے ہاتھ سے کتابیں چھوٹ کر نیچے گر گئیں۔رب نواز نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو سامنے حسین وجمیل پری پیکر چہرہ آنکھوں میں آنسو لیے کھڑا تھا۔اس نے ڈرے ہوئے انداز میں رب نواز کی طرف دیکھا اور سہمے ہوئے لہجہ میں بولی۔"معاف کرنا بابا!غلطی ہماری ہے ہم نے آپ کو دیکھا نہ تھا۔" وہ نیچے بیٹھ گئی اور کتابیں سمیٹنے لگی تو رب نواز بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا اور کتابیں سمیٹ کر اُسے دیتے ہوئے بولا۔

"میرا نام بابا نہیں بلکہ ملک رب نواز ہے۔"

"آپ تو شاید بُرا مان گئے۔دراصل میرا تکیہ کلام ہے۔میں ہر ایک کو بابا کہہ دیتی ہوں آپ نے مائینڈ کیا ہے تو آئی ایم سوری۔"

وہ بولتی کیا تھی' پھول بکھیر رہی تھی۔کلیاں بکھر رہی تھیں۔نجانے کتنے لمحے ایسے ہی گزر جاتے اگر کوئی ٹھوکر لگنے سے اُن کے اوپر نہ آ گرتا۔

وہ دونوں شرمندہ شرمندہ سا اُٹھے اور اپنی اپنی راہ لی مگر رب نواز کی نیندیں اُڑ گئیں۔وہ ہر لمحہ بے چین رہنے لگا۔بس یہی آرزو ہوتی کہ وہ اس کے سامنے ہو اور وہ

اسے دیکھتا رہے مگر پڑھائی کا ٹائم تو بہت کم لگتا تھا۔وہ ایک دن ایم اے فرسٹ ایئر کی کلاس سے باہر نکلی تو رب نواز کو سامنے کھڑا دیکھ کر اس کے پاس چلی آئی۔"ملک رب نواز صاحب!ایک مفت مشورہ دینا چاہوں گی آپ کو۔"

"جی کہیے بلکہ فرمائیے۔اب تو زندگی میں آپ کی میرا مطلب ہے آپ کے مشوروں کی بہت ضرورت ہے۔" رب نواز بھی اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"کسی کے پیچھے پیچھے رہنا' کسی کو خیالوں میں سوچنا اور نیندیں حرام کر کے اُسے تصور ہی تصور میں پوجنا۔یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے' بلکہ اسے بیماری کہتے ہیں۔اس بیماری کی دوا کسی کے پاس نہیں ہوتی بابا!غور کرنا اس مفید مشورے پر۔" یہ کہہ کر وہ تو چلی گئی مگر رب نواز کو ہلا کر رکھ گئی تھی' کیونکہ وہ اس کے دل کی حالت بھانپ کر تمام حالات اسے بتا گئی تھی اور یہ رب نواز کے لیے اچھی بات تھی کہ وہ اس میں اور اس کے حالات میں دلچسپی رکھتی تھی۔

رب نواز نے تمام حالات گاما کو بتا کر اُسے اپنا راز دار بنایا اور کسی دن اس کے گھر جانے کا پروگرام بنایا۔ملک شیر علی ہمیشہ وہی چیز پسند کرتا تھا جو رب نواز کو پسند ہوتی۔اگر وہ چیز نہ خرید سکتا تو لڑ کر بھی لے لیتا تھا۔رب نواز بڑا ہونے کے ناطے ان دونوں کا بہت خیال رکھتا تھا۔لہٰذا فوراً ہی مان جاتا اور اپنے منجھلے بھائی کو کبھی ناراض نہ ہونے دیتا تھا۔

اسی طرح سلسلہ چلتا رہا۔چھوٹی موٹی نوک جھونک ہوتی رہی اور ایک لمحہ وہ بھی آیا کہ خود لڑکی نے کہا کہ کبھی گھر آئیں نا۔وہاں بیٹھ کر باتیں کریں گے' شام کی چائے پئیں گے اور کچھ تعلیم کے بارے میں ڈسکس کریں گے۔رب نواز کے لیے یہ بہت خوشی کی بات تھی۔اس نے گاما سے کہا کہ شام کو اس کے گھر چلنا ہے۔بڑے ملک صاحب کو پتہ نہیں چلنا چاہیے' وہ ڈرائیور نہ تھا بلکہ دوست تھا۔وہ رب نواز کا ہر راز اپنے سینے میں دبا کر رکھنا جانتا تھا اور اپنی دوستی بھی نبھانا جانتا تھا۔

شام کو گاڑی عصمت گوٹھ سے نکل کر کراچی شہر کی سڑکوں پر دوڑتی ہوئی ایئر پورٹ کے قریب ایک سڑک پر مڑ گئی۔ بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچ کر ہارن بجایا تو کوٹھی کا گیٹ کھل گیا۔ چوکیدار نے سلام کیا۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کرنے کے بعد رب نواز باہر نکلا اور نوکر کے پیچھے چلتا ہوا ایک خوبصورت سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔

''آپ بیٹھیں' میں ابھی بی بی کو بھیجتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ملازم اندر کی طرف چل دیا۔

رب نواز پہلی مرتبہ کسی لڑکی کے گھر گیا تھا۔ وہ تھوڑا سا نروس بھی تھا اور گھبرایا ہوا بھی تھا۔ سٹوڈنٹس لائف میں ایسا مقام اگر آ جائے تو ہاتھ پاؤں پھول ہی جاتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد اندر کے کمرے سے وہ برآمد ہوئی اور اس نے آتے ہی کورنش بجا لا کر رب نواز کو سلام کیا۔ وہ کچھ حیران ہوا کیونکہ کراچی جیسے ترقی یافتہ شہر میں' فرشی سلام' مگر جلدی اس نے اپنی حیرت پر قابو پالیا' کیونکہ جس انداز سے جھک کر سلام کیا تھا' ایک مرتبہ تو رب نواز کی آنکھوں میں بجلی کوند گئی۔ وہ سیدھی ہو کر پروقار انداز میں چلتی ہوئی رب نواز کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ رکھ رکھاؤ اور میل ملاپ والے لوگ ہیں۔ اس نے ملک رب نواز کی پریشانی بھانپتے ہوئے کہنا شروع کیا بلکہ ہونٹوں کے گلاب کو حرکت دے کر پتیاں بکھیرنا شروع کیں۔

''رب نواز صاحب! شکریہ کہ آپ میرے کہنے پر یہاں آئے...... کیا لیں گے آپ......؟''

''آپ کو............؟''

رب نواز کی بات ابھی پوری نہ ہوئی تھی کہ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور ہنستی ہوئی بولی'

''میرے علاوہ۔ کوئی کھانے پینے کی بات کر رہی ہوں......'' وہ پھر ہنس پڑی۔

''ایکچوئیلی میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ کو خوامخواہ ہی زحمت ہو گی۔'' رب نواز شرمندہ ہو کر بولا۔

''کوئی بات نہیں ملک صاحب! اب آپ نے اس غریب خانہ کو رونق بخش ہی دی ہے تو ہماری خواہش ہے کہ کچھ پیا جائے۔''

''فرید! فرید! دو کولڈ ڈرنک لے کر آؤ۔ اور ہاں باہر گاڑی میں جو ملک صاحب کا ڈرائیور ہے اُسے بھی پانی پلاؤ اور عزت سے بٹھاؤ۔'' اس نے ملازم کو آواز دے کر کہا۔

ملازم بات سن کر چلا گیا۔ اندر سے ایک عورت برآمد ہوئی جو قد کاٹھ میں لمبی تھی۔ خوبصورت اور گوری چٹی تھی۔ شکل اور نین نقش بالکل لڑکی جیسے تھے۔ اس نے آتے ہی کہا' ''کیا ہو رہا ہے...... بیٹا اپنے مہمان کا تعارف نہیں کرواؤ گی......'' اس نے بیٹی کی طرف دیکھ کر کہا اور رب نواز کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

''مما! یہ میرے کلاس فیلو ہیں ملک رب نواز! یہ عصمت گوٹھ کے ملک عصمت کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ کافی اچھے آدمی ہیں اور ملک صاحب یہ میری مما ہیں' زہرہ۔''

رب نواز نے سر کے اشارے سے سلام کیا۔ انہوں نے بھی مسکرا کر جواب دیا اور بولی

''تجلی بیٹی! تم مہمان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرو' میں ذرا بازار جا رہی ہوں۔''

''او کے مما!'' تجلی نے کہا۔ وہ باہر چلی گئی تو رب نواز نے کہا۔

''آپ کا نام تجلی ہے؟ آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں۔''

''آپ نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔'' اس نے کہا تو دونوں مسکرا پڑے۔ اتنی دیر میں ملازم کولڈ ڈرنک لے کر آ گیا۔ اس نے ایک گلاس تجلی کے سامنے اور ایک گلاس رب نواز کے سامنے رکھ دیا اور باہر چلا گیا۔

''اب آپ کو گھر کا پتہ چل گیا ہے' کبھی کبھار آتے رہیئے گا۔ آپ کا ہی گھر ہے۔ اس گھر میں میری مما اور میری دوست صنم رہتی ہیں۔ بس ہم کل تین افراد ہیں اس گھر میں اور آپ اپنی فیملی کا تعارف کروانا چاہیں گے' رب نواز!''

اس نے پہلی بار رب نواز کو اس کے نام سے پکارا تھا۔ وہ کھنکار کر بولا۔

''میرے بابا' میری ماں اور ہم تین بھائی ہیں۔ عصمت گوٹھ میں ہمارا چھوٹا سا غریب خانہ ہے۔ زمینیں' جاگیریں اور دولت گھر کی لونڈیاں ہیں' کبھی آپ بھی آیئے نا!''

رب نواز نے اپنا بھی مختصر سا تعارف کروا دیا۔ وہ پھر بولی۔

''میرا خیال ہے یہ ہم دونوں کے درمیان ایک دیوار ہے جو تکلف پیدا کر رہی ہے' وہ دیوار ہے...... آپ...... آپ نہیں بلکہ لفظ آپ...... کیوں نہ ہم ایک دوسرے کو آپ کہنے کی بجائے تم کہیں؟'' اس نے رب نواز کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو اس کا دل بل کر رہ گیا۔

''میرا خیال ہے' اب مجھے چلنا چاہیے۔ کافی دیر ہوگئی ہے......'' رب نواز نے اٹھ کر کہا تو وہ دلربائی سے بولی۔

''معاف کرنا بابا! مہمان جانے کے لیے گھر والوں کی اجازت کا محتاج ہوتا ہے' مگر آپ کا میرا مطلب ہے تمہارا تو معاملہ ہی الگ ہے۔ تم تو میرے دل کے مہمان ہو رب نواز۔ اب اگر اتنے قریب آ گئے ہو تو دُور مت جانا اور کبھی مجھے اس سنگدل دنیا میں اکیلا مت چھوڑنا۔ پلیز بابا!'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور رب نواز کے ہاتھ پکڑتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی'' جانا چاہو تو جا سکتے ہو......!''

''میری مجبوری ہے' اب آتا رہوں گا......''

''وعدہ کرو۔''

''پکا وعدہ ہے یہ......'' رب نواز وہاں سے چلا آیا مگر اپنا سب کچھ وہاں چھوڑ آیا تھا۔ دل' جان اور نجانے کیا کیا۔ اس نے گامو کو تمام کہانی سنائی۔ جب وہ عصمت گوٹھ پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ بڑے ملک نے کبھی نہ پوچھا تھا کہ کیا کرتے ہو اور کیا نہیں۔ بس یہ کہا تھا کہ مجھے تم پر' تمہارے کردار پر اعتماد ہے۔

رب نواز کے سامنے بار بار وہی لمحہ آ رہا تھا جب تجلی جھک کر اسے کورنش بجا لا کر سلام کر رہی تھی۔ نوجوانی کا عالم تھا۔ دل چاہتا تھا کہ اُڑ کر وہاں پہنچ جائے مگر وقت اور حالات اس بات کی اجازت فی الحال نہ دیتے تھے۔

وہ راتوں کو سونا بھول کر اُلوؤں کی طرح جاگتا رہتا تھا۔ یہ عشق بھی کیا بیماری ہے۔

پتہ نہیں کب لگ جاتا ہے اور کب دل میں بس کر زندگی اجیرن کر دیتا ہے۔ ایسا ہی سلسلہ رب نواز کے ساتھ بھی تھا۔ وہ بھی اس بیماری کا روگی بن گیا تھا۔

اس کے بعد اُن دونوں کی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ کبھی کراچی کے شیرٹن ہوٹل میں کبھی کلفٹن کے ساحل پر' کبھی پیراڈائز پوائنٹ پر' کبھی ایئرپورٹ کے لاؤنج میں اور کبھی راتوں کو بازار میں اور کبھی شاپنگ کرتے ہوئے۔ اس دوران ایک دن تجلی کی دوست صنم سے بھی ملاقات ہوئی جو کہ تجلی کی طرح خوبصورت تو نہ تھی مگر نین نقش انتہائی جاذب نظر اور دل فریب ادائیں' گفتگو کا انداز دل موہ لینے والا تھا۔ وہ بھی رب نواز سے فری ہو گئی تھی۔

ایک دن عصمت گوٹھ میں عجیب واقعہ ہوگیا جو کہ گوٹھ کی تاریخ کا پہلا واقعہ تھا۔ ہوا یوں کہ کسی لڑکے نے کسی لڑکی کو ورغلا کر اس کی عصمت دری کی۔ لڑکی نے روتے ہوئے تمام ماجرا اپنے والدین کو بتا دیا۔ انہوں نے اپنی برادری میں بات کی' اسی طرح بات چلتی چلتی ملک عصمت تک پہنچ گئی۔ لڑکے کا والد امیر آدمی تھا مگر ملک عصمت کے رعب اور دبدبے کے آگے اس کی بھی کوئی حیثیت نہ تھی۔ فیصلہ گوٹھ کے بڑے یعنی ملک عصمت تک پہنچ گیا۔

پنچائیت لگا کر تمام گوٹھ کے مکینوں کو اکٹھا کیا۔ تمام ماجرا بیان کرنے کے لیے لڑکی کو درمیان میں کھڑا کر کے بولنے کو کہا۔ ملک عصمت کے ساتھ والی کرسی پر ملک رب نواز اور شیر علی بیٹھے تھے جبکہ باقی تمام لوگ نیچے زمین پر اور گوٹھ کے معزز اور امیر آدمی چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ عدالت عصمت کے گھر کے سامنے لگائی جاتی تھی۔ لڑکی نے تمام معاملہ پنچائیت کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ تمام لوگ منہ میں انگلیاں ڈال کر حیرت سے کبھی اس کی طرف دیکھ رہے تھے اور کبھی لڑکے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لڑکا تمام بات سُن کر شرمندہ سا اپنے باپ کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ لڑکی کا بیان سننے کے بعد لڑکے کو بھی اُسی طرح درمیان میں کھڑا کر کے بولنے کو کہا گیا مگر وہ شرمندگی اور

پریشانی کے مارے خاموش کھڑا تھا۔ ملک عصمت نے لڑکے کی خاموشی کو توڑنے کے لیے بولنا شروع کیا۔

''تم اس وقت گوٹھ کی عدالت میں کھڑے ہو' یہ اتفاق ہے اور تمام مکینوں کی رائے کے مطابق ہمیشہ کی طرح اس مقدمے کا فیصلہ میرے سپرد کیا گیا ہے۔ میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ لڑکی نے جو بھی باتیں کہیں' ان میں سے اگر کوئی بات جھوٹی ہے تو تم اس کی تردید کر کے اپنی بے گناہی ثابت کر سکتے ہو۔'' انہوں نے لڑکے سے کہا' مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور کچھ نہ بولا۔ ملک عصمت نے دوبارہ کہا:

''تمہاری خاموشی اور شرمندگی بتا رہی ہے کہ تم نے جرم کیا ہے اور اپنے جرم کو دلی اور ذہنی طور پر قبول کر چکے ہو۔'' انہوں نے لڑکے کے والد کو آگے آنے کو کہا اور بولے۔

''ظفر علی! تمہارے بیٹے کا جرم تمہارے سامنے ہے۔ میری عدالت کا فیصلہ یہ ہے کہ اس جرم کو اس طرح روکا جائے یعنی اس کی سزا اتنی سخت ہونی چاہیے کہ آئندہ کسی لڑکی کی عصمت دری نہ ہو۔ لہٰذا ملک عصمت کی عدالت تمہارے بیٹے کو سزائے موت سناتی ہے' مگر یکدم نہیں۔ اس طرح کہ اسے سنگسار کر دیا جائے گا۔ گوٹھ کا بچہ بچہ اس پر تھو تھو کرے گا اور پتھر بھی مارے گا۔ ظفر علی تمہیں کوئی اعتراض ہو تو کہہ سکتے ہو۔'' انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ظفر علی بھی سر جھکا کر کھڑا تھا۔ اس کے آنسوؤں نے اس کے گالوں پر لکیر سی بنا ڈالی تھی۔ اس طرح ملک عصمت کے فیصلے کے سامنے سب نے سر جھکا دیا تھا۔ اس لڑکے کو دو دن بعد سنگسار کر دیا گیا تھا۔ اس کا باپ جوان بیٹے کی لاش لے گیا اور آہوں اور سسکیوں کے ساتھ سپرد خاک کر دیا۔ تین دن تک گوٹھ میں سوگ رہا اور پھر چوتھے دن زندگی معمول پر آ گئی۔ تین دن رب نواز یونیورسٹی نہ جا سکا تھا۔ چوتھے دن اتوار تھا۔ وہ لیٹا اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا کہ گامے نے آ کر اطلاع دی کہ تجلی اور اس کی دوست صنم آئی ہیں۔ وہ حیران ہو گیا' یکدم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اخبار اس کے

ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ باہر کی طرف بھاگا۔ ملازم انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا چکا تھا۔

رب نواز نے آتے ہی سلام کرنے کی بجائے حیرت سے پوچھا:

''آپ' یہاں......؟''

''آپ نہیں' بلکہ تم......'' وہ دل رُبائی سے بولی۔

''ہاں ہاں تم...... یہاں؟ میرا مطلب ہے بغیر اطلاع کے؟'' وہ اپنے ہی گھر میں نروس ہو رہا تھا۔

''تم فکر مت کرو' تمہیں بابا جان کچھ نہیں کہتے' ہم ان سے باہر مل چکی ہیں۔'' اس نے کہا تو رب نواز کا مزید رنگ اُڑ گیا۔

''تم...... یہ کیا ظلم کیا تم نے؟ تم پٹواؤ گی...... مجھے ضرور پٹواؤ گی!''

''اتنا ڈرتے ہو باپ سے؟'' صنم بولی۔

''ڈرنا پڑتا ہے....... اچھا کیا ہو جائے' چائے' ٹھنڈا یا پھر چاٹی کی لسّی یا کھانا......'' وہ تیز لہجے میں بولا۔

''میرا خیال ہے پہلے ٹھنڈا اور پھر چائے ہو جائے۔'' صنم نے کہا تو دونوں مسکرا پڑیں۔

''ابھی لو' خیرو۔ جاؤ جا کر مہمانوں کے لیے چائے لے کر آؤ۔ اور بعد میں ٹھنڈی بوتلیں اور ساتھ میں کچھ لوازمات بھی......'' وہ تیزی تیزی میں سب غلط کر رہا تھا۔ پھر بھی ملازم اس کی حالت بھانپتے ہوئے چلا گیا۔ ''آپ لوگ بیٹھیں میں ذرا چینج کر کے آتا ہوں۔'' وہ مڑا تو تجلی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''ایسے ہی خوبصورت لگتے ہو اور مجھے پسند بھی ہو۔ رہنے دو نا بابا!''

وہ باہر نکل گیا' زندگی کتنی حسین ہو گئی تھی۔ وہ سوچتا ہوا اپنے کمرے میں گھس گیا۔

''آ خا...... آج تو گھر میں عید کا سماں ہے۔ یہ دو دو چاند' وہ بھی ہمارے ڈرائنگ روم میں!''

یہ ملک شیر علی تھا جو اچانک اُدھر آ نکلا تھا۔ آج اتوار ہونے کی وجہ سے وہ کالج نہ گیا تھا۔ تجلی اور صنم نے حیرت سے اُسے دیکھا اور تجلی بولی۔

"جناب کی تعریف......؟"

"خاکسار کو ملک شیر علی کہتے ہیں اور مزید تعریف یہ کہ ہم اس گھر کے منجھلے بیٹے ہیں......" وہ کچھ شوخ سا ہو رہا تھا۔ "اور ان چاند جیسے چہروں کو کوئی نام بھی دیا ہوگا قدرت نے۔"

"جی...... میرا نام صنم ہے اور ان کا نام تجلی ہے...... ہم رب نواز کی کلاس فیلوز ہیں......" صنم نے اپنا تعارف کروایا' تو وہ خوش ہو کر بولا۔

"اتنے معصوم اور پیارے چہروں کے اتنے ہی پیارے نام ہونے چاہئیں تھے۔ مجھے پسند آیا آپ کا نام آپ کا لہجہ اور آپ کا حُسن مِس تجلی!" وہ ڈائریکٹ تجلی سے مخاطب تھا۔

"شکریہ ملک صاحب! آپ بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ کبھی آیئے نا ہمارے گھر......" تجلی بولی' تو صنم نے تجلی سے کہا۔

"رہنے دو' چھوٹے ملک کی ڈور تو بڑے ملک صاحب کے ہاتھ میں ہوگی' وہ کیسے آ سکتے ہیں۔ مہمان نوازی کا بہت شوق ہے تمہیں۔"

"ناراض کیوں ہوتی ہو جانِ من! ضرور آؤں گا۔ اپنا نام پتہ تو لکھواؤ۔" اس نے ڈائری اور قلم جیب سے نکال کر لکھنے والے انداز میں پکڑ لیا۔

تجلی نے محبت سے اپنا پتہ لکھوا دیا۔ وہ قلم بند کر کے جیب میں رکھتا ہوا بولا۔

"اوکے' پھر اگلی ملاقات تمہارے چیلنج کے مطابق تمہارے گھر پر ہوگی۔ بائے......!"

"معاف کرنا بابا...... یونیورسٹی ٹائم کے بعد آنا......" تجلی نے کہا تو وہ مسکرا کر بولا۔

"جب تم سے ملاقات ممکن ہوگی' اسی وقت حاضر ہو جاؤں گا' بندہ تابعدار ہے۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا کر کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

وہ دونوں ہنسنے لگیں۔ ملازم کولڈ ڈرنکس دے گیا تھا۔ وہ گھونٹ گھونٹ پینے لگیں۔

اسی طرح دن گزرنے لگے۔ اب تو رب نواز کبھی کبھار راتوں کو لیٹ آنے لگا۔ کبھی شیر علی اور کبھی رب نواز تجلی کے گھر جاتے تھے۔ وہ دونوں بھائیوں کو اچھی طرح پھانس چکی تھی۔ ایک دن اس نے رب نواز کو دن بارہ بجے آنے کا کہا۔

رب نواز گام کے ساتھ ٹھیک بارہ بجے اس کی کوٹھی میں پہنچ گیا۔ ملازم اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے اُسے ہمیشہ کی طرح ڈرائنگ روم میں بٹھانے کی بجائے خلافِ توقع آج تجلی کے کمرے کا کہہ دیا۔ رب نواز کے لاعلمی ظاہر کرنے پر وہ طنزیہ مسکراہٹ سے اُسے دیکھتا ہوا بولا۔

"میرے پیچھے پیچھے آیئے۔" وہ آگے اور رب نواز اس کے پیچھے چل پڑا۔ تجلی کا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ ملازم اُسے کمرے کے سامنے چھوڑ کر چلا گیا۔ رب نواز نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھٹکھٹایا' اندر سے آواز آئی۔ "ایک منٹ رُکو!"

یہ تجلی کی آواز تھی۔ رب نواز باہر کھڑا اپنے بال سنوارنے لگا۔ پھر کچھ دیر بعد اندر سے آواز آئی...... "آ جاؤ......" رب نواز دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کی سِٹّی گم ہو گئی۔ اس نے خواب میں بھی ایسا ماحول نہ دیکھا تھا۔ کمرہ خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ گلاب کی خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ بڑے سے کمرے میں دبیز ریشمی پردوں اور خوبصورت قالینوں نے کمرے کو مزید دل کش بنا دیا تھا جبکہ ایک بیڈ پر کمبل میں لیٹی تجلی مبہوت کھڑے ہوئے رب نواز کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے صیاد اپنے شکار کو اپنے بچھائے ہوئے جال میں پھنستے دیکھتا ہے۔ رب نواز بھی جال میں پھنس چکا تھا وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ تجلی نے قہقہہ لگا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ تیزی سے چلتا ہوا تجلی کے بیڈ کی طرف بڑھا۔ اس نے جاتے ہی گلہ کرنا شروع کر دیا کہ وہ دو دن یونیورسٹی کیوں نہیں آئی۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اُسے خاموش رہنے کو کہا اور بولی۔

''بیٹھ جاؤ۔'' وہ کرسی پر بیٹھنے لگا تو تجلی کی آواز آئی۔'' کیا بات ہے بابا! آج ہم سے دوری کیوں؟ یہاں بیٹھو نا بیڈ پر......'' اس نے کچھ اس ادا سے کہا کہ رب نواز انکار نہ کر سکا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ تو گیا لیکن اس انداز سے جیسے ابھی اٹھ کر بھاگ جائے گا۔ تجلی نے آگے بڑھ کر اُسے بازو سے پکڑ کر کھینچا اور اس کے اوپر کمبل سمیت گر گئی اور زلفوں کی چھاؤں میں اُسے اپنی سانسوں کی گرمی سے گرمانے لگی۔ رب نواز حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی دھڑکن پر قابو پانا چاہتا تھا مگر دل و دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ تجلی یکدم اٹھی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ رب نواز بھی سیدھا ہو گیا مگر دل ایسے دھڑک رہا تھا کہ ابھی سینے سے نکل کر باہر آ جائے گا وہ دلربائی سے بولی۔

''اپنے جوتے اُتار کر ریلیکس ہو کر بیٹھو نا۔ یہ میرا کمرہ ہے۔ یہاں میری اجازت کے بغیر کوئی نہیں آئے گا۔'' رب نواز نے جلدی جلدی جوتے اتار دیئے اور وہ بیڈ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا' تو تجلی نے اس کے بالوں میں اپنی نرم نرم اور نازک انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کر دی۔ رب نواز بھی نوجوان تھا اور پھر خوبصورت لڑکی کے ساتھ کمرے میں تنہائی بھی میسر تھی۔ اس کا دل اور جذبات کنٹرول سے باہر ہو رہے تھے مگر پھر بھی ایک شرم ایک جھجک تھی جو اسے خود کو قابو میں رکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ تجلی نے اُسے گھسیٹ کر کمبل میں چھپا لیا اور بولی۔

''کیوں رب نواز! مجھ سے دور کیوں بھاگ رہے ہو' میرے دل میں محبت کی آگ جلا کر مجھے اس آگ میں جلتا چھوڑ رہے ہو سلگنے کے لیے' کیوں رب نواز' کیوں؟'' وہ اس پر گری ہوئی تھی۔ اور تبھی رب نواز کو احساس ہوا کہ وہ بالکل برہنہ حالت میں ہے۔ جذبات کی شدت میں رب نواز بھی اندھا ہو گیا تھا۔ پھر کسے خبر کمبل کہاں اور کپڑے کہاں! رب نواز کو تبھی ہوش آیا جب اس کی آنکھوں میں کیمرے کا فلش پڑا۔ اس نے گھبرا کر اپنے پیچھے دیکھا تو تجلی کی ممی اور ایک باوردی کانسٹیبل ہاتھ میں کیمرہ لیے کھڑے تھے اور ممی مسکرا رہی تھی۔ وہ زہریلی آواز میں بولی۔

''بہت شکریہ تجلی۔'' یہ کہہ کر تجلی کو اٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ مسکراتی ہوئی کمبل سمیت اٹھ کر کمرے کے ایک طرف کھڑی ہو گئی جبکہ رب نواز اسی حالت میں شرمسار اور گھبرایا ہوا پڑا تھا۔

''فکر نہ کرو' ملک رب نواز! یہ سپاہی اور یہ تصویریں کبھی نہیں بولیں گی' بشرطیکہ تم پانچ لاکھ روپے لے کر کل یہاں آ جاؤ۔'' ممی نے زہر اُگلا۔

''پانچ لاکھ روپے! مگر اتنی بڑی رقم کہاں سے لاؤں گا میں۔'' وہ گھبرایا ہوا بولا۔ وہ پریشانی سے روہانسا ہو گیا مگر اُسے اپنے نام اور مان مرتبے کا احساس رونے نہ دیتا تھا۔

''یہاں سے ابھی دفع ہو جاؤ۔ میری بیٹی نے پہلی مرتبہ تمہارے ساتھ اس بیڈ پر اپنی جوانی خراب کی ہے۔ اس کی قیمت تمہیں چکانا ہو گی۔ کل شام پانچ بجے تک۔'' ممی بولی تو تجلی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''ممی آپ یہ کیا کر رہی ہیں؟ میں رب نواز سے سچی محبت کرتی ہوں۔ میں مر جاؤں گی اس کے بغیر۔ آپ یہ ظلم مت کریں۔ پلیز ممّا یہ ظلم مت کریں۔'' وہ رونے لگی۔

رب نواز کو پہلے تو اس پر غصہ آ رہا تھا مگر اب ترس آنے لگا۔ اس نے جلدی جلدی اپنے کپڑے پہنے۔ ممی بول پڑی اگر تو سچی محبت کرتی ہے تو پوچھ اس سے بھی کیا یہ بھی تیرے ساتھ محبت کرتا ہے۔ یہ تجھے اپنی بیوی بنا سکتا ہے۔ پوچھ اس سے' یہ اگر تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے تو میں اس کی یہ سزا معاف کر دیتی ہوں۔ کہو اس سے کہ یہ اس اگلے منگل کو تمہاری مانگ بھر دے۔ بول! یہ کبھی ایسا نہیں کرے گا۔ جانتی ہو' کیوں نہیں کرے گا۔ یہ امیر زادے ایسے ہی تم جیسی لڑکیوں کو پھانس کر ان کی عزت لوٹ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ بول شادی کرے گا میری بیٹی سے؟'' وہ رب نواز سے مخاطب تھی۔ ''اگر نہیں تو یہ تصویریں اور یہ سپاہی عصمت گوٹھ پہنچ کر سب کچھ بول دے گا پھر تمہیں بھی سنگسار کر دیا جائے گا۔'' اُس نے کہا تو رب نواز کے سامنے وہ منظر گھوم گیا جس میں اس کے گوٹھ میں لڑکے کو سنگسار کیا گیا تھا۔ اس کا جرم بھی وہی تھا۔ وہ نہیں نہیں کرتا ہوا بولا۔

''ہاں میں کروں گا تجلی سے شادی' اسی ہفتے کروں گا اور تمہیں بتاؤں گا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ میں ضرور آؤں گا تجلی' اسی ہفتے ضرور آؤں گا تم فکر نہ کرنا۔'' وہ تجلی سے کہہ کر باہر نکل گیا۔ بعد میں تینوں کے قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا۔

''ملک گام سے مشورہ کیا گیا تو اس نے یہی کہا کہ شادی کر لینا چاہیے کیونکہ نہ کرنے کی صورت میں بڑے ملک صاحب کی عزت اور خاندان کے وقار پر حرف آئے گا۔ بس اس شادی کو خفیہ رکھا جائے اور آہستہ آہستہ خاندان والوں کو قائل کر لیا جائے گا۔ رب نواز پر ایک ایک لمحہ ایک صدی کی طرح بھاری ہو رہا تھا۔ ماں باپ سے چوری وہ شادی نہیں چاہتا تھا مگر اب بُری طرح پھنس چکا تھا۔ تجلی کی ماں نے اس کی تجلی کے ساتھ تصاویر اُتار لی تھیں۔ عجیب سی سچویشن تھی۔ مختصر یہ کہ شادی ہوگئی۔ اس شادی میں ملک گام اور رب نواز کے دو خاص دوست شامل تھے۔ بطور گواہ ان کا نام لکھوا دیا گیا۔ رب نواز نے وہ رات تجلی کے گھر پر گزاری اور پھر بہت سی راتیں وہیں گزرنے لگیں۔ یونیورسٹی بھی نہ جایا جاتا تھا۔ تعلیمی سلسلہ رُک گیا تھا۔ تجلی کی ادائیں اور ڈیمانڈز بڑھ رہی تھیں۔ رب نواز بینک سے قرض لے لے کر اس کی خواہشات پوری کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک دن وہ کسی دوست کی پارٹی میں گیا۔ شادی کا فنکشن تھا۔ لیٹ نائٹ پروگرام تھا۔ دوست نے اُسے وہیں روک لیا کیونکہ بعد میں مُجرا پروگرام بھی تھا۔ رب نواز نے گھر پیغام بھجوا دیا کہ وہ آج نہیں آسکے گا۔ ملک عصمت کو اس کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ انہوں نے دنیا دیکھ رکھی تھی۔ وہ کچھ سوچ کر خاموش ہوگئے مگر ان کے دل میں شک کا ایک کانٹا رہ گیا۔ اس کانٹے کو نکالنے کے لیے انہوں نے ایک پروگرام بنایا اور کل سے اس پر عمل کرنے کے لیے انہوں نے ایک آدمی سوچ لیا۔

رب نواز گرم موسم میں ٹھنڈ کا مزہ لینے کے لیے دوست کی کوٹھی سے باہر آ گیا۔ گھر میں خاصی گہما گہمی تھی۔ لڑکیاں رنگین آنچل لہراتی کبھی ادھر اور کبھی اُدھر آ جا رہی تھیں۔ رب نواز اس ہنگامہ خیزی سے دور جانا چاہتا تھا۔ مگر ایک گاڑی جو کوٹھی کے گیٹ پر آ کر

رُکی اسے دیکھ کر چونک گیا۔ گاڑی تو دوسری گاڑیوں جیسی تھی مگر گاڑی سے اترنے والی دو عورتوں کو دیکھ کر اس کا چونکنا لازم تھا کیونکہ ان میں سے ایک صنم اور دوسری تجلی کی ماں تھی۔ اس نے پاس سے گزرنے والے ملازم سے پوچھا۔ یہ جو دونوں عورتیں گاڑی سے اُتر کر اندر کی طرف جا رہی ہیں یہ کون ہیں اور یہاں اس وقت ان کا کیا کام ہے۔

''ارے صاحب! آپ انہیں نہیں جانتے؟ یہ تو شہر کی مشہور طوائف صنم ہے اور ساتھ میں اس کی ممی جی ہیں۔'' ملازم نے کہا تو رب نواز پر آسمان گر گیا۔ وہ خود کو کئی فٹ زمین میں گڑا ہوا محسوس کرنے لگا۔ دنیا گھومتی ہوئی لگ رہی تھی۔ ملازم پھر بولا۔

''صاحب! آج تو صنم بائی کا مُجرا دیکھنے کا مزہ آ جائے گا۔ آپ جائیے گا نہیں۔''

یہ کہہ کر ملازم تو چلا گیا مگر رب نواز کی دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ وہ باشعور تھا۔ یہ جان گیا تھا کہ تجلی بھی ایک طوائف ہے۔ اُس کے ساتھ شادی اور بلیک میلنگ صرف اس کی دولت ہتھیانے کے لیے سارا ڈرامہ تھا۔ ''اوہ مائی گاڈ! میرے ماں باپ! میں کیا منہ دکھاؤں گا ان کو؟ ماں جی تو جیتے جی مر جائیں گی۔'' اور ملک عصمت تو اس کے ٹکڑے کروا دے گا۔ کیا کرے کیا نہ کرے یہ سوچ رہا تھا کہ ملازم پھر آ گیا۔ اس نے کہا کہ آپ کو صاحب بُلا رہے ہیں۔ اندر پروگرام شروع ہو گیا تھا۔ اس نے جا کر دیکھا کہ شراب کے جام چل رہے تھے اور صنم مجرا کر رہی تھی۔ نوٹوں کی بارش میں وہ نہا رہی تھی جبکہ دور ایک کونے میں بیٹھی ممی پان چبا رہی تھی اور صنم کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ اس کی نظریں تماش بینوں کا طواف کرتی کرتی رب نواز پر ٹک گئیں۔ وہ ایک دم تو حیران رہ گئی مگر پھر وہی چہرہ' وہی تاثرات' اس کا انداز نہ بدلا۔ رب نواز وہاں سے فوراً اٹھا اور سیدھا عصمت گوٹھ آیا۔ پریشانی کی حالت میں رات گزاری۔

صبح گام کے ساتھ تجلی کے گھر گیا تو صنم' تجلی اور ممی کہیں جا رہی تھیں' کیونکہ رب نواز کی گاڑی گیٹ میں داخل ہوئی تو ان کی گاڑی باہر نکل رہی تھی۔ دونوں گاڑیاں آمنے سامنے رُک گئیں۔ رب نواز اور وہ بھی تینوں گاڑیوں سے باہر نکل آئے۔ رب

نواز تیزی سے چلتا ہوا تجلی کے پاس آیا اور ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر رسید کر دیا۔ رب نواز کا ہاتھ بے اختیاری میں اُٹھ گیا تھا۔ ممّی نے رب نواز کو دھکا دے کر دور ہٹایا اور غصے سے بولی۔

''حرامزادے! اگر تجھے پتہ چل ہی گیا ہے کہ ہم طوائفیں ہیں تو یہ بھی سن لو کہ تجلی کی کوکھ میں تمہارا بچہ بھی پل رہا ہے......'' ایک اور بجلی رب نواز پر گری۔

''اس کُتے کے پلّے کو گرانے کے لیے میں نے اس حرامزادی کو بہت زور لگایا۔ مگر یہ اب راضی ہوئی ہے جب کچھ نہیں ہوسکتا۔ یہ بچہ رہے گا یا یہ حرامزادی' اسے بہت شوق تھا تمہارے بچے کی ماں بننے کا۔'' ممّی ہر بات پر رب نواز کو کنویں میں گرا رہی تھی۔

رب نواز کی حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ بُت بنا کھڑا تھا۔ ممّی نے ایک اور ایٹم بم گرایا۔ ''رب نواز میری بات کان کی کھڑکیاں کھول کر سُن لو۔ اس بچے کو دنیا میں آنے کے لیے بہت سارے روپوں کی ضرورت ہے اور وہ روپے تم لے کر آؤ گے کیونکہ یہ بچہ تمہارا ہے۔ جاؤ اور یہاں سے دفع ہوکر اپنے بچے کے لیے رقم کا بندوبست کرو۔'' اس نے ملازم کو بلایا اور کہا کہ رب نواز کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دو۔ ملازم آگے بڑھا اور اُسے گھسیٹ کر گیٹ سے باہر نکالنا چاہتا تھا کہ گام گاڑی سے باہر نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے ملازم کو کہا کہ رب نواز کو چھوڑ دے ورنہ تمام گولیاں تمہارے دل میں اتار دوں گا۔ ریوالور دیکھ کر ملازم گھبرا گیا وہ تینوں بھی گھبرا گئیں اور اندر کی طرف دوڑیں۔ رب نواز گام کے ساتھ چلا آیا۔ گوٹھ پہنچ کر وہ بڑا پریشان تھا۔ ملک عصمت نے اُسے بلایا۔ وہ بجھا بجھا ان کے پاس گیا۔ ملک صاحب کسی کام سے گوٹھ سے باہر جا رہے تھے۔ انہوں نے تمام رموز رب نواز کو سمجھا دیئے اور اپنے بعد گوٹھ کی ذمہ داری بھی اسے نبھانی پڑے گی یہ بھی بتا دیا ''اور ہاں آج کل تم غائب دماغ رہتے ہو' مجھے واپسی پر کوئی شکایت نہیں سننا۔'' نجانے وہ کیا کہہ رہے تھے' وہ کون سا وہاں موجود تھا۔ دل و دماغ تو تجلی اور اپنی آنے والی اولاد میں اٹکے

ہوئے تھے۔ بہت سارا روپیہ چاہیے تھا۔ اس سے سنہری موقع کوئی نہ تھا۔ وہ تمام باتیں جی جی کر کے سنتا رہا۔ ملک عصمت کے جانے کے بعد اس نے تجوری پر ہاتھ صاف کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ تمام دولت اکٹھی کر کے وہاں سے نکلتا کوئی اس کی جاسوسی کے لیے اس کے تعاقب میں تھا۔ وہ سیدھا ہسپتال پہنچا اور تمام دولت ممّی کی جھولی میں ڈالتا ہوا بولا۔ ''یہ لو تمام دولت' میں اب کنگال ہوگیا ہوں۔ اب میرا بچہ مجھے دے دو' میں تمہاری دنیا سے دور چلا جاؤں گا۔ پلیز ممّی پلیز!'' وہ ڈھٹائی سے بولی۔

''ٹھیک ہے' اگر بیٹا ہوا تو تمہیں مل جائے گا اگر بیٹی ہوئی تو..........''

اس سے پہلے کہ ممّی کی بات پوری ہوتی' تجلی بول پڑی۔

''معاف کرنا بابا! بیٹی تو ہمارے لیے ہارڈ کیش ہوتی ہے۔''

''تجلی! تم اپنی اولاد کے بارے میں ایسا کہہ رہی ہو۔ ہماری اولاد کے بارے میں' لعنت ہے تم پر' لعنت ہے تم پر اور تمہارے دھندے پر!'' رب نواز کا مزاج تلخ ہوا تو ممّی بولیں۔

''اب بکواس بند کرو' یہ ہسپتال ہے۔ ابھی کچھ دیر لگے گی۔ باہر جاؤ!'' وہ دانت بھینچتا ہوا باہر نکل آیا۔ کمرے کے باہر اُسے صنم مل گئی جو اُسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا کہہ کر بازو سے پکڑ کر باہر لے گئی۔ وہ اپنی گاڑی میں جا بیٹھے' گام پہلے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ صنم نے کچھ کہنا چاہا تو رب نواز بولا۔ ''بے فکر ہو کر ہر بات کر سکتی ہو' یہ میرا راز دار ہے۔'' وہ گام کی وجہ سے چُپ ہوگئی تھی مگر اب اس نے کہنا شروع کیا۔

''یہ دونوں ماں بیٹی پیدائشی طوائف ہیں۔ اور میں ان کے جال میں پھنسنے والی وہ چڑیا ہوں جس کے پَر کاٹ کر اسے اپنے ساتھ رہنے کے لیے سُدھا لیا گیا ہے۔ میری ایک لمبی کہانی ہے۔ رب نواز! میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ اگر تمہارے ہاں بیٹی ہوئی تو

میں اُسے لاکر تمہاری گود میں ڈال دوں گی۔ اگر بیٹا ہوا تو یہ تمہیں خود ہی دے دیں گی مگر عصمت گوٹھ میں بھری پنچائیت کے سامنے تاکہ تمہیں سنگسار کر دیا جائے اور اب جبکہ تم نے خود ہی کہا ہے کہ کنگال ہو گئے ہو تو یہ ماں بیٹی تم سے جان چھڑوانے کے لیے یہ آخری ثبوت بھی تمہاری موت کے ساتھ مٹانا چاہتی ہیں۔ تم ان کے پہلے شکار ہو نمی کامیاب رہی ہے۔ وہ اب تجلی کے ذریعے مزید شکار کھیلے گی۔ یہ میں حلفیہ کہتی ہوں کہ تجلی بے شک ایک طوائف ہے مگر اس کی کوکھ میں تمہاری اولاد ہے۔ مجھے جانا ہے۔ دعا کرو کہ بیٹا ہو!'' یہ کہہ کر وہ گاڑی سے نکل گئی۔ رب نواز رونے لگا تھا۔ گام نے کندھے سے پکڑ کر اُسے دلاسہ دیا تھا۔ کوئی دو تین گھنٹے اسی طرح گزر گئے تھے۔ رب نواز بے چین ہو کر اندر کی طرف بڑھا تو نمی راستے میں ہی مل گئی۔ وہ اُسے دیکھ کر نفرت سے بولی۔ ''لعنت ہو تم پر اور تمہاری اولاد پر! بیٹا پیدا ہوا ہے' میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی جبکہ رب نواز آنسو پونچھتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تو تجلی بیڈ پر لیٹی تھی۔ وہ رب نواز کو دیکھ کر بولی۔

''افسوس ہے رب نواز کہ تم بیٹے کے باپ بن گئے۔''

''اور تم ماں بن گئیں تجلی!''

''نہیں رب نواز! طوائف کبھی ماں نہیں بنتی۔'' وہ زہریلے انداز میں بولی۔

''بہت جلد تم آن پھنسے ہو اس جال میں' تمہیں علم نہیں کہ بہت کھوج کے بعد قرعہ تمہارے نام نکلا تھا۔ اس پورے علاقہ میں ایک تمہارا ہی خاندان تو نوابوں کی طرح رہتا ہے۔ ہمارا مقصد کامیاب ہوا رب نواز!'' وہ سریلی آواز میں بول رہی تھی اور رب نواز کو لگ رہا تھا کہ کوئی اس کے کانوں میں سیسہ ڈال رہا ہے۔

''میرا بچہ کہاں ہے؟'' رب نواز نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بے غیرتی سے ہنستی ہوئی بولی۔

''ابھی بتاتی ہوں رب نواز! تم ایک کنگلے ہو' ایک فقیر! طوائف کی یاری اگر فقیر سے ہو جائے تو وہ کہاں سے کھائے گی۔ جیسے وہ مثال نہیں سنی تم نے کہ شیر کتنا بھی بھوکا ہو' وہ کبھی گھاس نہیں کھاتا..........''

''میں اگر فقیر ہوں تجلی! تو تم دیکھنا کہ ایک دن تمہارے پاؤں میں بجنے والے گھنگرو اسی فقیر کے کشکول میں ضرور گریں گے۔ میں تب تمہیں بتاؤں گا کہ فقیر کون ہے' میں یا تم؟!''

وہ قہقہہ لگا کر بولی۔

''میرے بھولے بابا! طوائف کے گھنگھرو کبھی کسی کنگال کے گھر میں نہیں بجے اور نہ ہی کوئی گھنگھرو کبھی کسی فقیر کے کشکول میں گرتا ہے۔ اب دفع ہو جاؤ نہ میں تمہاری بیوی ہوں اور نہ تم میرے شوہر ہو۔ گیٹ آؤٹ! اور ہاں تمہارا بچہ تمہارا بھائی ملک شیر علی لے گیا ہے' ان گنت دولت دے کر.....'' اس نے کیا کہا تھا' رب نواز کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس کے کان بہرے ہو گئے تھے۔ وہ سر تا پا لرز گیا تھا۔ وہ جلدی سے باہر کی طرف بھاگا۔ گام اس کی حالت دیکھ کر فوراً گاڑی اس کے پاس لے کر آیا۔ وہ جلدی سے سوار ہوا اور گوٹھ چلنے کو کہا۔ رب نواز نے تمام ماجرا گام کو بتایا۔ گام نے بھتیرا روکا کہ آپ کو گوٹھ نہیں جانا چاہیے مگر رب نواز بضد تھا کہ وہ اس کے بیٹے کو مار دیں گے۔ وہ اپنے بچے کو بچانے کے لیے خود موت کے منہ میں جا رہا تھا۔ گوٹھ پر ہو کا عالم تھا۔ تمام گوٹھ والے ہاتھوں میں پتھر لیے رب نواز کا انتظار کر رہے تھے۔ جونہی وہ گوٹھ میں داخل ہوا' ملک عصمت نے اُسے عدالت میں بلا لیا۔ تمام لوگ اُسے دیکھ رہے تھے۔ ''آج وہاں کھڑے ہو جاؤ جہاں تم کبھی مجرموں کو کھڑا کر کے ان کے مقدر کے فیصلے سُنایا کرتے تھے۔'' رب نواز چلتا ہوا درمیان میں آ گیا۔

''کیا یہ شیر علی جو کہہ رہا ہے' سچ ہے؟''

''بابا جی......'' رب نواز نے کچھ کہنا چاہا' مگر ملک عصمت کی گونج دار آواز نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ ''تم کوئی سوال نہیں کرو گے بس ہاں یا ناں میں جواب دو گے' کیا یہ سچ ہے؟''

''ہاں۔'' رب نواز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہ بچہ تمہارا ہے؟'' پھر پوچھا گیا تو پھر اثبات میں جواب ملنے پر ملک عصمت کی رعب دار آواز گونجی۔ ''اپنی آخری خواہش بتاؤ رب نواز! اس کے بعد تمہیں سنگسار کر دیا جائے گا'' بڑے ملک صاحب اس لمحہ منصف تھے۔ ''جلدی بتاؤ' پھر تمہارے باپ نے تمہارے لیے قبر اور کفن دفن کا انتظام بھی کرنا ہے۔'' ان کی آواز میں آنسوؤں کی لرزش شامل تھی۔ شیر علی اور حاکم علی بھی ساتھ کھڑے تھے۔ ''آخری خواہش بتاؤ رب نواز!'' یہ شیر علی کی آواز تھی جو اس کی جاسوسی کرتا تھا۔ ''میں ماں جی سے ملنا چاہتا ہوں اور پھر اپنے بچے کو گود میں لے کر پیار کرنا چاہتا ہوں۔'' رب نواز نے کہا تو ماں جی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس بیٹے نے ہمیں بہت دکھ دیا ہے۔ یہ کبھی بھی سکھ نہ دیکھے گا۔ یہ سڑکوں پر بھیک مانگتا رہے گا۔ اس نے ایک ماں کی گود سے اس کا رب نواز چھینا ہے میں اس سے نہیں ملنا چاہتی۔ تب بچہ رب نواز کی جھولی میں ڈال دیا گیا۔ وہ ایک دن کے بچے کو بے اختیار چومنے لگا۔ وہ مجمع میں ہر کسی کے پاس جاتا اور کہتا کہ دیکھو یہ میرا بچہ ہے۔ میرا خون ہے' وہ ایسا کرتا کرتا' مجمع کو چیرتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ بچہ اُس کی گود میں رو رہا تھا۔ لوگ ہاتھوں میں پتھر پکڑے اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ وہ بمشکل پکی سڑک پر پہنچ پایا۔ پھر ایک گاڑی آئی جس میں صنم کسی مرد کے ساتھ سوار تھی۔ رب نواز نے وہ بچہ اس کی گود میں ڈال دیا اور اُسے خیال رکھنے کا کہا اور اس سے پہلے کہ لوگ اس تک پہنچ پاتے وہ گاڑی میں بیٹھ کر اڑن چھو ہو چکے تھے۔ صنم اپنے عاشق حشمت علی کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی۔ حشمت علی نے بھی اس کا پورا پورا ساتھ دیا تھا۔ دولت جاگیر سب اس کے نام کر دی تھی' مگر صنم نے بچہ کی پرورش میں کوئی کسر نہ

چھوڑی۔ ایک دن ملک عصمت کے لوگ رب نواز کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں پہنچ گئے تو صنم نے انہیں ٹرخا دیا اور رب نواز کو شہر چھوڑنے کا کہا۔ بہت سوال و جواب کے بعد رب نواز شہر چھوڑنے پر راضی ہوا۔ وہ بچے کو جی بھر کر پیار کر کے کراچی چھوڑ کر لاہور آ گیا۔ بعد میں حشمت علی نے عصمت کے ڈر سے وہ جگہ چھوڑ دی اور کچھ ہی دنوں بعد ملک عصمت بھی چل بسے۔ ملک شیر علی نے تجلی سے شادی کر لی۔ اس شرط پر کہ پہلی بیٹی طوائف بنے گی۔ باقی اولاد تمہاری مرضی سے جو چاہے بن جائے۔ پھر ایک دن لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر گام کی ملاقات ایک فقیر سے ہوئی۔ اس نے پہچانا تو وہ رب نواز تھا۔ ماں کی بد دعا نے کام دکھایا تھا۔ وہ سڑکوں پر بھیک مانگتا پھرتا تھا۔ اس نے ایک فقیرنی سے شادی کر لی تھی اور ایک بچے کا باپ تھا۔ وہ اپنے گمشدہ بیٹے کی تلاش میں چھپ چھپ کر کئی بار کراچی گیا مگر صنم غائب ہو چکی تھی۔ بچے کی زندگی بچانے کے لیے اس نے کیا کیا جتن کیے ہوں گے یہ تمام اس ڈائری میں لکھے ہوں گے اور ہاں فقیرنی کے بطن سے جو بچہ پیدا ہوا تھا' وہ یہ احمد رضا ہے' تمہارا چھوٹا بھائی!'' گام نے کہانی ختم کی تو رب نواز جو کہ خیر دین تھا' اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔ اور آکاش تو بہت زیادہ رو رہا تھا۔ وہ اٹھ کر باپ کے گلے لگا اور نجانے کتنا وقت بیت گیا۔ سالوں کے بچھڑے ہوئے اب مل رہے تھے۔ گلے شکوے ہو رہے تھے۔ احمد رضا بھی رو رہا تھا۔ اس نے بھی بڑھ کر بھائی کو گلے لگا لیا اور اس کا منہ چومنے لگا۔

''میں ایک بار اس تجلی سے ملنا چاہتا ہوں جو میری ماں ہے......صرف ایک بار...... بابا پلیز!'' آکاش نے کہا تو رب نواز نے اُسے روکتے ہوئے کہا۔

''ضرور ملیں گے اس سے' مگر ایک کام ادھورا ہے۔ وہ کرنے کے بعد ابھی احمد رضا کی شادی اس کی بیٹی چاندنی سے کروانی ہے۔ پھر جائیں گے اس کے محل میں۔ ہم سب مل کر' تم بھی مل لینا اور میں بھی مل لوں گا۔ ٹھیک ہے؟'' یہ سن کر آکاش نے سر ہلا دیا کہ ٹھیک ہے۔ رات اسی طرح ہنسی خوشی گزر گئی۔ صبح آکاش نے احمد رضا سے پوچھا کہ ''تم چاندنی سے کتنی محبت کرتے ہو......؟''

بہت زیادہ بس تول کر نہیں بتا سکتا۔'' رضا نے جواب دیا تو آکاش ہنس پڑا۔

''اچھا کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ تم سے شادی کر لے گی؟''

''ففٹی ففٹی بات ہے۔شاید وہ اندھی ہو اور شادی کر لے۔''

''اوئے میری بہن کو اندھی مت بولنا۔ وہ تو چاند کا ٹکڑا ہے۔'' آکاش دور کہیں خلاؤں میں دیکھتا ہوا بولا تو رضا بھی مسکرا کر کہنے لگا۔

''اور میں......؟''

''تم تو چاند ہو' بس وہ تمہاری چاندنی ہے۔تمہاری چاندنی۔ بس اُسے فوراً یہاں بلواؤ' میں یہ کام جلد از جلد نپٹانا چاہتا ہوں......''

اس نے رضا سے کہا تو رضا نے فون سے احمد طماس کے موبائل کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے کافی دیر بعد احمد طماس کی نیند بھری آواز سنائی دی۔ وہ ابھی ابھی بیدار ہوا تھا۔

''احمد رضا بول رہا ہوں بھائی! کہاں کھو گئے ہو یار' دکھائی نہیں دیتے؟''

''ارے الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔تم خود غائب ہو۔ میں کل سے دو چکر لگا چکا ہوں ۔گھر میں تالا لگا ہوا ہے۔ میں تو خود پریشان ہوں۔ بابا تو ٹھیک ہے نا؟'' احمد طماس نے پوچھا تو رضا ہنسنے لگا'' ''ارے یار ہنس کیوں رہے ہو؟''

''بس یونہی......! اچھا' کیا تم چاندنی کو لے کر کہیں آ سکتے ہو؟'' رضا نے کہا تو احمد طماس حیرت سے بولا۔

''کہیں' تمہارا مطلب ہے؟ گھر کے علاوہ کہیں......؟''

''ہاں' میں تمہیں ایڈریس لکھواتا ہوں۔تم اور چاندنی فوراً پہنچو۔'' رضا نے ایڈریس لکھوا کر فون بند کر دیا۔ اس نے آکاش اور بابا کو بتایا کہ چاندنی آ رہی ہے۔ گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ آکاش اور بابا' احمد رضا اور جونیئر اور گام اکیلا گھر کو سجانے کے لیے پارٹیاں بن گئیں۔ اس گھر میں مدتوں بعد خوشی آنے والی تھی۔ گام کسی کام کے لیے

باہر چلا گیا۔ اور آکاش فون پر کسی کو کہنے لگا'' ''ابھی تک راستے میں ہی ہو جلدی کرو' میں انتظار کر رہا ہوں۔''

تمام لوگوں نے ایک پلان بنایا۔ اس کے مطابق رضا کو کوٹھی کے لان میں اکیلا چھوڑ دیا گیا ۔ وہ گھاس پر بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دوسری کرسی خالی تھی جبکہ باقی کرسیاں اٹھائی جا چکی تھیں۔ باہر گاڑی کے ہارن نے سب کو چونکا دیا۔ جونیئر نے گیٹ کھولا تو احمد طماس حیرت سے اُسے دیکھ رہا تھا۔'' کیا میں احمد رضا سے مل سکتا ہوں؟ انہوں نے یہی ایڈریس بتایا تھا۔''

''جی اندر آ جایئے اور گاڑی بھی لے آیئے۔'' جونیئر نے پورا گیٹ کھول دیا۔ احمد طماس گاڑی اندر لے کر آ گیا۔ لان میں بیٹھے ہوئے رضا پر نگاہ پڑی تو وہ بھاگتا ہوا آیا اور اس کے گلے لگ گیا۔ مگر احمد رضا کی نظریں گاڑی پر جم گئی تھیں۔ گاڑی میں چاندنی نہیں تھی بلکہ لگتا تھا' کوئی حُور جنت سے اُتر کر زمین پر احمد رضا کو لینے آئی ہو۔ وہ گاڑی سے اُتر کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کی طرف آ رہی تھی۔ احمد طماس بغل گیر تھا کہ جونیئر نے آ کر اُسے کہا کہ آپ کو اندر آکاش بھائی نے بلوایا ہے۔ اس نے احمد رضا کو چھوڑا اور یا ہو کہتا ہوا اندر کی طرف چلا گیا۔ چاندنی کو دیکھ کر احمد رضا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس کی یہ مشکل چاندنی نے حل کر دی۔ وہ چلتی ہوئی آئی اور شرمندہ سی کھڑی ہو گئی اور بولی۔

''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

''بیٹھ کر بھی کہا جا سکتا ہے اور ہم دونوں کے درمیان یہ پھر سے تکلف کی دیوار آ گئی؟ میرا مطلب ہے کہ لفظ تم کی بجائے آپ؟'' رضا نے کہا تو وہ ہلکی سی مسکان کے بعد بیٹھ گئی۔

''اب کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''رضا! میں بہت شرمندہ ہوں۔''

”کس بناء پر؟“

”میں تمہیں کیسے بتاؤں‘ سمجھ میں نہیں آ رہا!“

”ایسے ہی بتا دو جیسے باتیں کر رہی ہو۔“

”پلیز رضا! آئی ایم سیریس!“

”آئی نو۔ جو بھی کہنا ہے چاندنی بس میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ دو۔“

”ٹرسٹ می‘ بی کاز آئی ایم ریئلی سنسیئر وِد یُو اینڈ یُو آلسو ایگری می۔ او کے ناؤ ٹیل می وٹز پرابلم وِد یُو۔“

”میں تمہارے ساتھ زندگی کی راہوں میں نہیں چل سکتی کیونکہ میرے پاؤں میں رشتوں نے بہت سے کانٹے چبھو کر انہیں زخمی کر دیا ہے۔ میں تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ میں نے تمہاری آنکھوں میں بہت سا پیار دیکھا ہے۔ میں اس پاکیزہ پیار کی توہین نہیں کرنا چاہتی۔ اپنے لیے کوئی اچھی سی لڑکی ڈھونڈ لینا......“ یہ کہہ کر وہ اُٹھی اور جانے لگی تو رضا نے پہلی بار اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔

”اگر تم ایک طوائف کے گھر پیدا ہوئی ہو تو یہ تمہارا قصور نہیں ہے۔“ رضا کا یہ کہنا تھا کہ چاندنی سرتاپا لرز کر رہ گئی۔ اس نے گھبرا کر رضا کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں پیار ہی پیار تھا۔ ”میں بھی تو ایک فقیر کا بیٹا ہوں۔“ اس نے کہا تو چاندنی پھر حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ”ہمارا پیار ذات پات کی قید سے آزاد ہونا چاہیے۔ چاندنی میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں زندگی میں کبھی بھی تمہاری ممی کے حوالے سے کوئی بات نہیں کروں گا‘ کیونکہ تم اپنی ذات میں تنہا ہو۔ تمہیں اتنا پیار دوں گا کہ زندگی کی تمام تلخیاں اس سچی محبت میں کھو کر نابود ہو جائیں گی۔ بس تم یہ سوچ لو کہ میں ایک فقیر کا بیٹا ہوں۔ تمہارے لیے عالی شان محل‘ یہ شان دار گاڑی اور دوسری آسائشیں جو اس وقت تمہیں حاصل ہیں‘ مہیا نہیں کر سکتا۔ کیا ایک فقیر کے جھونپڑے میں باقی زندگی میری صرف میری چاندنی بن کر گزار سکو گی؟“ یہ کہہ کر رضا نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”تمہیں فیصلہ کرنے کا مکمل اختیار ہے کیونکہ تم میرے لیے چاندنی ہو۔ بس میری چاندنی!“

وہ کچھ لمحے سوچتی رہی اور پھر بولی۔ ”اگر میں صرف تمہاری ہی چاندنی ہوں تو پھر میرا ہاتھ کیوں چھوڑ دیا؟ جواب دو! کیوں چھوڑ دیا میرا ہاتھ‘ ہاں کیوں چھوڑ دیا؟“ یہ کہہ کر وہ رضا کے گلے لگ کر رونے لگی۔ ”میں تمہارے ساتھ تمہاری جھونپڑی میں بہتر زندگی گزار سکتی ہوں۔ مجھے زندگی گزارنے کے لیے آسائشوں کی نہیں بلکہ بہت سارے پیار کی ضرورت ہے‘ جو صرف تم مجھے دے سکتے ہو۔“ اس نے کہا تو رضا نے اُسے اپنے سینے سے الگ کر کے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھ سے شادی کرو گی؟“

”شادی تو امیر لوگوں میں ہوتی ہے۔ فقیروں میں تو بیاہ ہوتا ہے۔“ اس نے شرما کر کہا تو رضا کا جی چاہا کہ ابھی اس پر دونوں جہان قربان دے مگر اندر سے بوڑھوں کی فوج نکل آئی وہ شور مچا رہے تھے۔ رضا اور چاندنی انہیں دیکھ کر حیران ہو گئے۔ رضا اپنی باتوں میں ان سب کو بھول گیا تھا۔ آکاش نے آگے بڑھ کر چاندنی کو پیار دیا اور اس کا ماتھا چوما تو وہ حیران رہ گئی۔ پھر احمد طماس نے آگے بڑھ کر بتایا کہ ”چاندو! یہ ہمارے تایا ابّو ہیں اور آکاش بھائی ہمارے سگے بھائی ہیں۔ یہ لمبی کہانی ہے جو انہوں نے ہمیں سنائی ہے میں تمہیں مختصر سی بتاتا ہوں۔“ طماس نے مختصر لفظوں میں وہ تمام کہانی سنادی جو اندر بیٹھ کر اس نے گام سے سنی تھی اور بلک بلک کر رو پڑا تھا۔ چاندنی بھی آگے بڑھ کر خیر دین یعنی رب نواز کے گلے لگ گئی۔ ”میں کہتی تھی طماس سے کہ یہ فقیر اپنا اپنا سا لگتا ہے‘ اپنا خون تھا نا تایا ابو!“ باہر گاڑی کے رُکنے کی آواز سن کر وہ لوگ چونک پڑے تو گیٹ سے جنرل شفیع اور شمع داخل ہوتے ہوئے دکھائی دیئے۔ آکاش نے ان کا سب سے تعارف کروایا اور شمع کی باری آئی تو اس نے چاندنی سے کہا: ”چاندو یہ تمہاری بھابی ہے...... ہونے والی!“ چاندنی نے یہ سنا تو بھاگ کر شمع کو گلے لگا لیا۔ جنرل بھی

ان لوگوں سے مل کر بہت خوش تھا۔ چاندنی اور رضا جبکہ آکاش اور شمع کی شادی وہیں
کروادی گئی۔ قاضی کو بلانا پڑا۔ گواہ اور بڑے رشتہ دار تو وہی تھے۔ ملک شیر علی کو کچھ نہیں
بتایا گیا تھا۔ رب نواز کی بڑھی ہوئی حجامت کروائی گئی تو پچیس سال پرانا رب نواز نکلا۔
بس بال سفید ہو چکے تھے۔ پروگرام کے مطابق تمام فوج گاڑیوں میں بیٹھ کر شیر علی کے
گھر پہنچ گئی۔ محل میں سوگ طاری تھا۔ تجلی بیگم جو کہ لان میں بیٹھی تھی' انہیں دیکھ کر
حیران ہو گئی۔ اور شیر علی بھی اندر سے نکلتا ہوا آ رہا تھا۔ رب نواز کو دیکھ کر وہیں کھڑا
ہو گیا۔ رب نواز پُر وقار انداز میں چلتا ہوا تجلی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔
'پہچانا مجھے؟ تجلی بیگم!'' اس نے کہا تو تجلی بیگم کی آنکھیں مزید پھیل گئیں۔ ''میں
وہی کنگال ہوں جو برسوں پہلے تمہارا خاوند تھا۔ میں نے تمہیں کہا تھا نا تجلی بیگم کہ ایک
دن تمہاری پائل کے گھنگھرو ٹوٹ کر اس فقیر اور کنگال رب نواز کے کشکول میں ضرور
گریں گے۔ اور آج دیکھ لو تجلی کہ تمہاری بیٹی کو میں نے اپنے اس بیٹے سے بیاہ دیا ہے
جو فقیرنی سے پیدا ہوا ہے۔ اور وہ میرا وہ بیٹا ہے جو میرے پاکیزہ پیار اور سچے رشتے کی
نشانی تھا۔ بہت ترسایا ہے تم نے مجھے' بہت تڑپایا ہے تم نے مجھے' اس بیٹے کے لیے۔ میں
تمہیں سچا پیار دے کر عزت دینا چاہتا تھا مگر تم ایک نیچ اور گھٹیا عورت تھیں۔ عورت تو
تم ہو نہیں سکتیں۔ تم ایک طوائف تھیں اور طوائف کے لیے عزت عجیب سا لفظ ہے۔ غور
سے دیکھو ہم سب کی طرف تجلی بیگم!'' وہ بول رہا تھا تو ملک شیر علی بھی پاس آ کر کھڑا
ہو گیا۔ وہ شرمندہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ ''تم تو طوائف تھیں دھوکا اور فریب تمہاری گھٹی
میں شامل ہوتا ہے اور یہ میرا اپنا خون تھا' اپنا بھائی! اس نے میرے قتل کے لیے اپنی
آستین میں خنجر چھپا رکھا تھا۔ یہ تمہیں عزت دے کر یہاں تو لے آیا مگر تم نے اپنا رنگ
روپ نہ بدلا۔'' وہ خاموش بیٹھی سن رہی تھی۔ چاندنی آگے بڑھی اور بولی۔

''ممتا! ہمیں نہایت افسوس ہے' اس بات پر کہ ہم ایک طوائف کے بچے ہیں۔ یہ
داغ اپنے ماتھے پر سجا کر ہم جینا نہیں چاہتے۔ اس لیے میں یہ گھر' دولت اور آپ کی

دی ہوئی تمام وہ چیزیں آپ کو واپس کرتی ہوں' جن پر ہمارے باپ کی حلال کی کمائی
نہیں بلکہ ایک طوائف کے حجروں کی ویلیں لگی ہوئی ہیں۔ ایک طوائف کے ناچ گانے
سے اکٹھی کی گئی کمائی سے کبھی زندگی میں سکون نہیں ہوتا۔

آئی ایم سوری ممتا! آپ کبھی بھی ماں نہ بن سکیں۔ بس ایک طوائف ہی رہیں۔'' وہ
رونے لگی تو احمد طماس نے اُسے سہارا دیا اور اپنے ڈیڈی کی طرف دیکھ کر بولا۔

''آپ ہمارے باپ تھے۔ بے اولاد لوگ ترستے ہیں کہ خدا انہیں بیٹا دے۔
بہنیں ترستی ہیں کہ اللہ انہیں بھائی دے' مگر آپ نے ہاری ہوئی بازی جیتنے کے لیے اپنا
بیٹا داؤ پر لگا دیا۔ تھو ہے آپ کی سیاست پر اور آپ کے عہدے پر' تھو ہے! اور ممتا!''
وہ ماں کی طرف مڑا۔

''آپ ایک بار تو بیٹا کہہ کر پکارتیں' کبھی بھی آپ نے ایسا نہ کیا۔ ہم ترستے رہے
آپ کے پیار کے لیے۔'' اس کی آواز رندھ گئی تو آکاش آگے بڑھا اور ماں کے
سامنے زمین پر بیٹھ گیا اور بولا:

''تجلی بیگم! میں یہاں ایک طوائف کو قتل کرنے آیا تھا جو لوگوں کے گھروں کو
اجاڑتی ہے۔ انہیں برباد کرتی ہے' مگر یہاں آ کر پتہ چلا کہ وہ طوائف تم ہو جس کی کوکھ
سے میں نے جنم لیا ہے۔ شکر ہے تجلی بیگم کہ میں نے تمہارا دودھ نہیں پیا۔ تم کل بھی
طوائف تھیں اور آج بھی طوائف ہو۔ کاش کہ تم ماں ہوتیں اور تمہارے قدموں میں رکھی
گئی جنت کو اپنی آنکھوں سے چوم لیتا۔ مگر اب میں اپنے آپ کو تمہیں ماں کہہ کر دوزخ
میں نہیں جلانا چاہتا۔ ارے ماں تو وہ تھی' وہ تھی' جو زمانے کے لیے صنم تھی' مگر میرے لیے
ماسی جانو تھی۔ راتوں کو جاگ جاگ کر اس نے مجھے سلایا ہے۔ خود گیلے پر لیٹ کر رات
گزارتی تھی اور میں سکون سے سوکھے بستر پر سوتا تھا۔ حسرت ہی رہی کہ کبھی دیر سے
آؤں اور میری سگی ماں میرے لیے دروازہ کھولے مگر تم نے میرا مول لے لیا تھا۔ تجلی
بیگم' زمانے کی بے رحمی کے ہاتھوں مرنے کے لیے مجھے چھوڑ دیا۔ دیکھو آج حقیقت

تمہارے سامنے کھڑی ہے۔ تم نے بابا سے کہا تھا نا کہ طوائف کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ وہ طوائف ہی رہتی ہے۔ سچ کہا تھا تم نے' دیکھو آج تمہارے دو دو بیٹے اور ایک معصوم سی بیٹی یہاں موجود ہے' مگر وہ تمہیں ماں کہہ کر پکارنے سے کتراتے ہیں' کیوں؟ سوچا ہے تم نے؟ صرف اسی لیے کہ تم کبھی ماں بنی ہی نہیں تھیں صرف طوائف تھیں اور سدا طوائف ہی رہو گی۔ تم نے کاجل کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ افسوس تجلی بیگم! کہ تم اس کی بھی ماں نہ بن سکیں بلکہ اس کی کمائی کھانے والی نائکہ بن گئیں۔ تم مرتے دم تک ترسو گی کہ کوئی تمہیں ماں کہے' مگر افسوس ایسا کوئی بیٹا نہ ہوگا جو تمہیں ماں کہے گا۔'' وہ اونچی اونچی آواز میں رونے لگا۔ شمع اور چاندنی بھی رو رہی تھیں جبکہ تجلی خاموشی سے ان سب کی شکلیں دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ نہ بول رہی تھی۔ یکدم وہ کرسی سے اٹھی اور رب نواز کی طرف بڑھی۔ اس کے سامنے کھڑے ہو کر کہنے لگی۔

''میں تجلی ہوں' تجلی بیگم! ایک مجرا کرنے والی طوائف۔ تم سب دیکھو گے تجلی کیسے ناچتی تھی۔ دیکھو گے؟ دیکھو......'' یہ کہہ کر اس نے بال کھول دیئے اور بے ہنگم ناچنا شروع کر دیا۔ ملک شیر علی آگے بڑھا اور رب نواز کے قدموں میں گر کر گڑگڑانے لگا۔

''مجھے معاف کر دو رب نواز! میں تمہارا مجرم ہوں۔ آ کاش بیٹے کا مجرم ہوں' مجھے معاف کر دو۔ تجلی پاگل ہو گئی ہے۔ اس ملک میں اس کا علاج ممکن نہیں ہے۔ میں اُسے لے کر یورپ جا رہا ہوں۔ یہ میرے لیے زندگی بھر کی سزا ہے۔ بس میرے بچوں کا خیال رکھنا رب نواز! میرے بچوں کا خیال رکھنا۔''

تمہارے لیے یہی سزا کافی ہے شیر علی کہ تم نے ایک بھی دن اپنی بیوی کے ساتھ نہیں گزارا بلکہ تمہاری ہر رات ایک طوائف کے ساتھ گزری ہے کیونکہ میں نے تجلی کو طلاق نہ دی تھی' مگر آج طلاق دیتا ہوں۔ میں ملک رب نواز تجلی کو طلاق دیتا ہوں۔ طلاق! طلاق! طلاق!'' تمام لوگ سکتے کی حالت میں کھڑے تھے اور تجلی ناچتی ناچتی بے ہوش ہو کر گر گئی تھی۔ سبھی لوگ شیر علی کو اکیلا چھوڑ کر گاڑیوں میں بیٹھ کر واپس چلے گئے۔

احمد رضا نے چاندنی کو اپنے گھر میں لے جا کر کہا:

''یہ میرا گھر ہے چاندنی! اب یہ چاند نگر بنے گا' کیا یہاں رہ لو گی؟''

''یہیں رہنے کے لیے تو سب کچھ چھوڑا ہے رضا جی!'' اس نے شرما کر کہا تو رضا نے کہا ''اچھا جی!''

''میرے ہاتھ سے چائے پیو گی؟ میرا مطلب ہے میرے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے پیو گی؟''

چاندنی حیرت سے اُسے دیکھ رہی تھی کہ وہ اتنی خوبصورت رات کو اپنے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے پلا کر کیوں برباد کرنا چاہتا ہے۔ وہ چائے بنا رہا تھا اور ساتھ ساتھ گنگنا رہا تھا۔

تشبیہ تیرے ہونٹوں کی گلابوں میں کیوں ہے
شبیہ تیرے چہرے کی کتابوں میں کیوں ہے
آنکھیں تیری' زُلفیں تیری اور مرمریں بدن تیرا
دن رات ستاتا مجھے خوابوں میں کیوں ہے
دِل خوانخواہ ہی مگن نہیں ہے پڑھنے میں
اوصاف تیرے رُخسار کے نصابوں میں کیوں ہے
مُسکان تیری چاندنی جیسی باتیں تیری راگنی جیسی
چھن چھن تیری پائل کی آبوں میں کیوں ہے
نظر آئے مے کشوں کو ہر جام میں تصویر تیری
میں بھی کہوں اتنا نشہ شرابوں میں کیوں ہے
آسمان پہ کئی چاند چمکیں فقط حسین تم ہو
وہ تو ہیں بے پردہ سبھی تُو حجابوں میں کیوں ہے

یہ کہہ کر اس نے چاندنی کا گھونگھٹ اُٹھایا اور سبحان اللہ کہا۔ تو چاندنی شرما کر لجا کر سمٹ کر رہ گئی۔ گھنگھرو اور کشکول ایک ہو گئے تھے۔

* * *